

اقبال الیں حسنین

1979ء کے واقعات
اور اسلامی دنیا
کی تشکیل



عقیدے کی دراریں

مترجم صوفی شوکت

1979ء کے واقعات اور اسلامی دنیا کی تشکیل

عقیدے کی درازیں

اقبال الیں حسنین

مترجم

صوفی شوکت



KHUSRO FOUNDATION
www.khusrofoundation.org

Aqeede ki Dararein

by: Iqbal S.Hasnain

Translated by
Sufi Shawkat

ISBN: 978-81-989382-1-3
Rs. 550/-

نام کتاب : عقیدے کی دراریں
(سنہ 1979 کے واقعات اور اسلامی دنیا کی تشکیل)
مصنف : اقبال ایس حسنین
مترجم : صوفی شوکت
صفحات : 372
سنہ اشاعت : 2025
تعداد : 500
قیمت : 550 روپے
ناشر : خسرو فاؤنڈیشن، ڈی 319، ڈیفنس کالونی، نئی دہلی

Printed by

Creative Star Publications

Okhla, New Delhi

Email: creativestar1122@gmail.com

Call: 8851148278, 9958380431

فہرست

05	پیش لفظ
09	دیباچہ
33	ابتدائیہ
	باب اول
59	وہابیت: عالمی جہاد کا نظریاتی ماخذ
	باب دوم
95	فرقہ وارانہ خلیجیں اور مشرق وسطیٰ کا مستقبل
	باب سوم
119	مشرق وسطیٰ میں شیعہ ہلال کا عروج
	باب چہارم
151	سعودی عرب اور ایران دو حریف ریاستوں کی داستان
	باب پنجم
183	یورپ اور امریکہ میں مسلم نوجوانوں کا انتہا پسندی کی جانب جھکاؤ
	باب ششم
223	جہادی تحریک کی انٹرنیٹ کے ذریعے تنظیم

باب ہفتم

251 عراق اور شام میں اسلامی ریاست کا ارتقا اور توسیع

باب ہشتم

287 اسلامی دنیا میں امن کی بحالی کے لیے صوفی روایات کا احیا

325 خلاصہ کلام

341 تمہید

369 خسرو فاؤنڈیشن - ایک نئی پہل

پیش لفظ

اسلامی دنیا اس وقت فکری، اعتقادی، سیاسی اور تہذیبی سطح پر ایسے گہرے تضادات کا شکار ہے جس نے نہ صرف مسلم معاشروں کی داخلی یکجہتی کو پارہ پارہ کر دیا ہے بلکہ عالمگیر سطح پر اسلام کی معنویت، پیغام اور تصور انسانیت کو بھی غیر واضح اور متنازع بنا دیا ہے۔ ان تضادات میں سب سے نمایاں فرقہ واریت، مسلکی تشدد، مذہب کاریاں، اجارہ دارانہ استعمال، اور اسلامی تہذیب کے روحانی و اخلاقی سرمایے سے انحراف شامل ہیں۔ ایسے حالات میں فکری سنجیدگی رکھنے والا ہر فرد اس سوال سے دوچار ہوتا ہے کہ آخر یہ بحران کہاں سے پیدا ہوا، کن عوامل نے اسے ہوا دی، اور کیسے اس کے اثرات مذہبی حلقوں تک محدود نہ رہ کر بین الاقوامی سیاست، عالمی امن، اور مسلم نوجوانوں کی نفسیات تک پہنچے؟ انہی سوالات کا گہرا، تحقیقی اور فکری جواب پیش کرنے کے لیے کتاب Fault Lines in Faith نہایت اہمیت کی حامل ہے، جو ہمارے فکری افق کو نہ صرف وسعت دیتی ہے بلکہ ہمیں تاریخ، مذہب اور سیاست کے باہمی رشتے کی ازسرنو تفہیم کی دعوت دیتی ہے۔

کتاب کا اسلوب تحقیقی بھی ہے اور تنقیدی بھی، اور یہ اپنے موضوعات کو محض واقعات کی سطح پر بیان نہیں کرتی بلکہ ان کے پس منظر، نظریاتی بنیادوں، اور اثرات کو گہرائی سے واضح کرتی ہے۔

مصنف نہ صرف اسلام کے مختلف مکاتب فکر خصوصاً سلفی، وہابی، صوفی، اور شیعہ افکار کا تفتابلی مطالعہ پیش کرتے ہیں، بلکہ ان افکار کے ریاستی اداروں کے ساتھ تعلق اور بین الاقوامی سطح پر ان کے اثر و نفوذ کا بھی تفصیل سے جائزہ لیتے ہیں۔ سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ مصنف فرقہ واریت کو محض ایک مذہبی مسئلہ نہیں مانتے، بلکہ اسے ایک سیاسی حکمت عملی اور جغرافیائی بالادستی کے آلے کے طور پر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ سعودی عرب اور ایران کے مابین کشیدگی کو وہ محض سنی-شیعہ اختلاف نہیں بلکہ دو مختلف ریاستی بیانیوں، دو الگ سیاسی فقہی تعبیرات، اور دو متضاد جیو-پولیٹیکل اہداف کی کشمکش کے طور پر دیکھتے ہیں۔

موجودہ دور میں جب دنیا کے مختلف خطوں بالخصوص مشرق وسطیٰ، جنوبی ایشیا، اور یورپ میں مذہب اور سیاست کی پیچیدہ گتھیاں سلجھانے کے بجائے مزید الجھ رہی ہیں، Fault Lines in Faith ایک ایسی رہنما کتاب ہے جو ہمیں نہ صرف موجودہ حالات کے اسباب سے آگاہ کرتی ہے بلکہ ممکنہ حل کی راہیں بھی تجویز کرتی ہے۔ مصنف یہ دلیل دیتے ہیں کہ آج مسلم دنیا کو جس فتنہ کی بندش، مذہبی شدت پسندی اور فرقہ وارانہ منافرت کا سامنا ہے، اس کی جڑیں ماضی کی ان تحریکوں میں پیوست ہیں جنہوں نے دین اسلام کے آفاقی پیغام کو محض فقہی اجزاء تک محدود کر دیا، روحانیت کو بدعت قرار دے کر ترک کر دیا، اور تصوف و عرفان جیسے وسیع اور تہذیبی افق رکھنے والے ورثے کو غیر اسلامی یا مشرکانہ قرار دے کر اپنی فکر سے نکال دیا۔ مصنف اس تناظر میں محمد بن عبد الوہاب کی تحریک اصلاح، اُن کی نظریاتی سخت گیری، اور آل سعود کے ساتھ ان کے سیاسی الحاق کو بنیادی محرک کے طور پر پیش کرتے ہیں، جس سے ایک ایسا فقہی بیانیہ وجود میں آیا جس نے فکری اختلاف کو "کفر" میں تبدیل کر کے مسلم معاشروں کے اندر شدید انتشار پیدا کیا۔

کتاب میں یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ سلفیت اور وہابیت کی ترویج محض نظریاتی سرگرمی نہیں تھی بلکہ اس کے پیچھے ریاستی وسائل، تیل کی دولت، اور عالمی سیاسی حمایت بھی شامل تھی، جنہوں نے اسے ایک عالمی تحریک بنا دیا۔ اس بیانیہ کو مدارس، مساجد، اور خیراتی اداروں کے ذریعے امریکہ، افریقہ، ایشیا، اور یورپ کے مسلمانوں میں پھیلا یا گیا، جس کے نتیجے میں مقامی اسلامی

روایات، جیسے برصغیر کا صوفی اسلام، شمالی افریقہ کا مالکی تصوف، اور انڈونیشیا کا معتدل شافعی اسلام، کمزور ہوتے گئے اور ان کی جگہ ایک سخت گیر، خشک، اور فقہی ظاہریت پر مبنی اسلام نے لے لی۔ اس فکری یلغار کا نتیجہ یہ نکلا کہ نوجوان مسلمان نسل، جسے نہ اسلامی علوم کی گہرائی تک رسائی حاصل تھی اور نہ جدید دنیا کے پیچیدہ سوالات سے نپٹنے کی تربیت، وہ بنیاد پرستی، تکفیر، اور تشدد کی راہوں پر چل پڑی۔

مصنف اس کتاب میں مغرب کا بھی ناقدانہ جائزہ لیتے ہیں، خاص طور پر امریکہ اور یورپی ریاستوں کی اس پالیسی پر تنقید کرتے ہیں جس نے ایک طرف تو انتہا پسندی کے خلاف عالمی جنگ (Global War on Terror) کا نعرہ بلند کیا اور دوسری طرف انہی شدت پسند نظریات کے حامل ممالک کے ساتھ معاشی، سیاسی اور دفاعی تعلقات قائم رکھے۔ اس تضاد نے نہ صرف مغرب کی اخلاقی حیثیت کو کمزور کیا بلکہ مسلم دنیا میں بھی اس کے خلاف بیگانگی، بد اعتمادی، اور نفرت کو فروغ دیا۔ اس صورتحال میں مصنف تجویز کرتے ہیں کہ مغرب کو چاہیے کہ وہ ان مسلم اداروں کی پشت پناہی کرے جو اعتدال، مکالمے، تصوف، اور علمی وسعت کو فروغ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر مراکش، انڈونیشیا، ترکی اور ہندوستان میں موجود صوفی روایتیں نہ صرف مقامی سطح پر امن کا ذریعہ ہیں بلکہ عالمی سطح پر اسلام کی روحانی اور تہذیبی تعبیر کی نمائندگی بھی کرتی ہیں۔

کتاب کے اس تمہیدی مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ Fault Lines in Faith محض ایک تنقیدی تحقیق نہیں بلکہ ایک فکری دعوت ہے، ایسی دعوت جو ہمیں مذہب، سیاست، ثقافت، اور تاریخ کے اس مقام پر دوبارہ غور کرنے کی تلقین کرتی ہے جہاں سے ہم نے اپنی فکری بصیرت، روحانی گہرائی، اور تہذیبی ہم آہنگی کو ترک کر کے شدت، جبر اور سطحیت کو گلے لگایا۔ یہ کتاب مذہبی مفکرین، سیاسی تجزیہ کاروں، اور عام قاری کے لیے یکساں طور پر اہم ہے کیونکہ یہ ہمیں وہ زاویہ نظر عطا کرتی ہے جس کے بغیر نہ ہم موجودہ بحران کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی اس کا دیر پا حل تلاش کر سکتے ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ خسرو فاؤنڈیشن کی یہ پیشکش ہمارے قارئین کو پسند آئے گی اور اس موضوع

پر تحقیق کرنے والے طلباء اور اساتذہ کے لیے رہنما ثابت ہوگی۔ خسرو فاؤنڈیشن کتَاب کے مصنف پروفیسر اقبال ایس حسنین کی شکر گزار ہے جنہوں نے اس گراں قدر تصنیف کو اردو کے قارئین تک پہنچانے کے لیے ہمیں اس کا اردو ایڈیشن شائع کرنے کی اجازت دی ہم کتاب کے مترجم جناب صوفی شوکت کے بھی بے حد شکر گزار ہیں جنہوں نے مختصر مدت میں اس کتاب کا شاندار ترجمہ کیا جو قارئین کے سامنے ہے۔

خسرو فاؤنڈیشن دیگر زبانوں کے قیمتی لٹریچر کو اردو ہندی اور انگریزی میں شائع کر کے زیادہ سے زیادہ ہندوستانی قارئین تک پہنچنے کے لیے کوشاں ہے، جس نے چار سال کی مختصر مدت میں مختلف موضوعات پر اردو ہندی اور انگریزی میں 30 سے زائد کتابیں شائع کر کے ملک کے مختلف اداروں، جامعات، مدارس اور کتب خانوں تک پہنچانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

شکریہ

ڈاکٹر حفیظ الرحمان

کنوینز خسرو فاؤنڈیشن نئی دہلی

دیباچہ

عقیدے میں دراریں سنہ 1979 میں نمودار ہوئیں۔ یہ ایک ایسا فیصلہ کن سال تھا جس میں چند اہم واقعات پیش آئے، جو مشرق وسطیٰ اور پوری مسلم دنیا میں تبدیلی کے محرک بنے۔ سعودی عرب نے اس وقت اپنے حکمران خاندان کی اخلاقی حیثیت پر سوال اٹھانے اور اسے اقتصادی و اخلاقی بدعنوانی کا مرتکب قرار دینے والے ایک انتہا پسند گروہ کے دباؤ کے بعد وہابی سلفی نظریے سے اپنی وفاداری کا از سر نو اعادہ کیا۔ یورپی اقوام نے اسلامی انقلاب کو ایک آزادی کی تحریک قرار دے کر سراہا، جبکہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے دانستہ طور پر چشم پوشی اختیار کی۔

سوویت یونین کی پسپائی کے بعد جب امریکا نے افغانستان کو تقریباً تنہا چھوڑ دیا، تو سیکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں نوجوان انتہا پسند اسلام پسند مجاہدین بے یار و مددگار رہ گئے۔ یہی اسرار، اسامہ بن لادن کی قیادت میں، خود کش بمباروں کی صورت اختیار کر گئے۔ یہ صورتحال افغانستان کی امریکی حمایت کے ایک غیر ارادی نتیجے کے طور پر پیدا ہوئی۔ عیسائیت اور یہودیت جیسے عظیم توحیدی مذاہب کے برعکس، اسلام ایک ایسی عالمی دہشت گردی کے چکر میں پھنس گیا، جسے انتہا پسند سلفی نظریہ چلا رہا تھا۔ عالمی اعداد و شمار کے مطابق، سنہ 1979 سے 2017 کے درمیان، 5704 مسلمان مختلف چھوٹے بڑے دہشت گردانہ حملوں میں ملوث رہے۔

یہ کتاب جہادی دہشت گردی میں اس اضافہ کی کچھ وجوہات تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے اور اس کے اساسی نظریے سے، جو دنیا بھر میں نسلی اور ثقافتی طور پر متنوع مسلم برادریوں میں سرایت کر گیا اور اس کے براہ راست تعلق کو سمجھنے کی ایک سعی ہے۔

کتاب کا آغاز ایک تمہید سے کیا گیا ہے، جو سنہ 1979 میں پیش آنے والے تین قیامت خیز واقعات کا احاطہ کرتی ہے۔ وہ واقعات جنہوں نے مشرق وسطیٰ کے سیاسی و مذہبی بیانیے کو تشکیل دیا اور دنیا بھر میں اسلامی سیاست کی ایک نئی لہر کو جنم دیا۔ سنہ 1979 میں ایران کے اسلامی انقلاب نے سنی عرب دنیا میں زلزلہ برپا کر دیا۔ سعودی عرب نے دنیا بھر میں شیعہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا مقابلہ کرنے کے لیے وہابی سلفی سخت گیر اسلام کے نفاذ کو تیز رفتاری سے آگے بڑھایا۔ وہابیت شیعہ مسلمانوں اور صوفی سنی مسلمانوں کے خلاف شدید نفرت پر زور دیتی ہے، وہ صوفی مسلمان جو اولیاء کرام کی تعظیم کرتے ہیں اور دیگر مذاہب کے لیے رواداری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

دسمبر 1989 میں سوویت فوج نے افغانستان سے واپسی اختیار کی، اور اپنے پیچھے ایک تباہ حال اور نسلی اعتبار سے منقسم ملک چھوڑ دیا۔ افغانستان ایک تہہ دار اور پیچیدہ معاشرہ ہے جس میں کئی نسلی دھارے موجود ہیں، جو کسی سادہ بیانیے میں سمیٹنے سے انکار کرتے ہیں۔ یہاں کی آبادی مختلف نسلی گروہوں پر مشتمل ہے، تاہم اکثریت پشتونوں پر مشتمل ہے، جن کے بعد تاجک، ہزارہ، ازبک اور ایک قابل ذکر تعداد میں شیعہ آبادی ہے۔ سوویت یونین کے انخلا کے بعد امریکہ نے اس خطے سے اپنی دلچسپی ختم کر دی اور افغانستان کو یوں ہی بے یار و مددگار چھوڑ دیا، اس حقیقت کو سمجھ بغیر کہ افغانستان نہ تو بیتنام تھا اور نہ کوریا، جو جنگ کے بعد معمول کی اقوام بن گئے تھے۔ افغانستان کی نسلی اور مذہبی پیچیدگیاں قبائلی سرداروں اور مجاہدین گروپوں کے درمیان شدید رقابت کے ذریعے واضح ہو گئیں۔ ہر گروہ اقتدار کے لیے سرگرم عمل تھا اور دشمنیوں کا حساب چکانے کے لیے بے دریغ ہتھیار استعمال کر رہا تھا۔ صحافی اور خارجہ پالیسی کے ماہر احمد رشید کے مطابق، جنگ کے بعد افغانستان کی معیشت کو بحال کرنے کے لیے نہ کوئی بین الاقوامی کوشش ہوئی اور نہ مالی امداد فراہم کی گئی۔ پانچ ملین پناہ گزینوں کو وطن واپسی کے لیے بہت کم مدد میسر

آئی، اور مجاہدین کو سیاسی مفاہمت پر آمادہ کرنے کے لیے کوئی سفارتی دباؤ بھی نہیں ڈالا گیا۔ امریکی خفیہ ایجنسی (سی آئی اے) نے اپنی افغان پالیسی کی ذمہ داری خطے میں اپنے اتحادیوں، پاکستان اور سعودی عرب، کو سونپ دی۔ پاکستانی فوجی قیادت اور انٹرسروسز انٹیلیجنس (آئی ایس آئی) نے اپنی نوآبادیاتی ذہنیت کے تحت افغانستان میں مداخلت کا ایک موقع دیکھا، اور اس کے لیے طالبان کو آلہ کار بنایا۔ پاکستانی فوج نے محمد عمر، جنہیں ملا عمر کے نام سے جانا جاتا ہے، کو قیادت کے لیے منتخب کیا جو قندھار کے قریب ایک غریب پشتون خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ سوویت افواج کے خلاف لڑ چکے تھے اور اپنی ایک آنکھ ہمیشہ کے لیے کھو چکے تھے۔ آئی ایس آئی کے جزلوں نے طالبان جنگجوؤں کو عسکری تربیت فراہم کی، جبکہ سعودی رقوم سے مسلح فوجی گاڑیاں خریدی گئیں۔ اسی دوران، لاکھوں افغان پناہ گزینوں کے بچوں کو مدراس میں سخت گیر وہابی اسلام کی تعلیم دی گئی۔ پاکستانی آئی ایس آئی افسران اور طالبان رہنماؤں نے کم سے کم ایک مشترکہ ایجنڈا مرتب کیا: امن قائم کرنا، جنگجو سرداروں کو غیر مسلح کرنا، شریعت کا نفاذ کرنا اور معاشرے کو اس کی برائیوں سے پاک کرنا۔

پاکستان نے متحدہ عرب امارات (یو اے ای) اور سعودی عرب کو قائل کیا کہ وہ اس ایجنڈے کو مالی امداد اور طالبان حکومت کو سرکاری و قانونی طور پر تسلیم کرنے کے ذریعے تقویت دیں۔ طالبان کی اعلیٰ قیادت مکمل طور پر القاعدہ کی جہادی فکر کے زیر اثر آچکی تھی؛ ملا عمر نے 1996 کے آخر میں اسامہ بن لادن کو قندھار آنے کی دعوت دی۔ سی آئی اے پہلے ہی اسامہ بن لادن کی امریکہ مخالف سرگرمیوں میں ملوث ہونے کی رپورٹ دے چکی تھی، اور اسے افغان حکومت میں اس کی موجودگی پر سخت تشویش تھی۔ طالبان حکومت نے القاعدہ کو دہشت گرد تربیتی کیمپ قائم کرنے کے لیے مکمل سہولیات اور تحفظ فراہم کیا۔ بڑی تعداد میں عرب اور پاکستانی شدت پسند گروہ، جو کشمیر، چیچنیا، بوسنیا اور فلپائن کی بغاوتوں میں شامل تھے، افغانستان میں تربیت حاصل کرنے لگے۔

1996 سے 2001 کے درمیان، افغانستان میں القاعدہ کے کیمپوں نے دنیا بھر سے آئے

ہوئے تقریباً 30000 شدت پسندوں کو تربیت دی۔

پورے خطے میں پھیلے ان تربیتی کیمپوں کے ذریعے خودکش بمباروں اور دہشت گرد حملہ آوروں کی ایک مضبوط سپلائی چین قائم ہو چکی تھی۔

جب امریکہ نے ان کیمپوں کو تباہ کرنے کی کوشش کی، تو پاکستانی آئی ایس آئی نے سی آئی اے کو گمراہ کیا اور حملے سے قبل کیمپوں میں موجود افراد کو بروقت خبردار کرتا رہا، جس کے نتیجے میں امریکی حملے صرف خالی جھوٹے لوگوں کو نشانہ بنا سکے۔

سنہ 2000 تک یہ واضح ہو چکا تھا کہ القاعدہ اور طالبان حکومت نے مل کر اسلامی دہشت گردوں کی ایک بین الاقوامی فوج تیار کر لی ہے، جو دنیا بھر میں دہشت گرد کارروائیوں کے لیے استعمال کی جا رہی تھی۔ کئی تجزیہ کاروں، جن میں احمد رشید بھی شامل تھے، نے امریکہ کو اس خطرناک ابھرتی صورت حال سے خبردار کیا تھا، لیکن امریکہ کی پالیسی میں وہابی سلفیت کے بڑھتے ہوئے عالمی نیٹ ورک کے خلاف کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی، حالانکہ یہی نظریاتی ڈھانچہ عالمی اسلامی دہشت گردی کی ریڑھ کی ہڈی بن چکا تھا۔

یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ امریکہ کے شاطر اور ماہر منصوبہ ساز، جن میں نیشنل سکیورٹی کونسل (این ایس سی) کے ارکان بھی شامل تھے، نے افغانستان کو ایک ناکام ریاست کے طور پر کیوں نہ پہچانا۔ ایسی ریاست جو غلیظ وہابی دہشت گرد گروہوں، جیسے القاعدہ، سے بھری ہوئی تھی، جو نہ صرف امریکیوں سے شدید نفرت کرتے تھے بلکہ مغربی اقدار کے بھی سخت دشمن تھے۔ درحقیقت، وہ پہلے ہی خطے میں امریکی اہداف پر حملے کر رہے تھے اور بہت جلد امریکہ کے لیے ایک سنگین خطرہ بننے والے تھے۔

اگر معروف تھنک ٹینکوں نے امریکی حکام کو پہلے ہی خبردار کر دیا تھا، تو پھر یہ ایک بہت بڑا سوال ہے کہ امریکی صدر اور کانگریس نے مشرقی افریقہ میں امریکی سفارتخانوں پر حملوں، یمن میں خودکش حملوں، یا 11 ستمبر کے ہولناک حملوں (جنہیں عام طور پر 9/11 کہا جاتا ہے) کو روکنے کے لیے کوئی سنجیدہ نوٹس یا عملی قدم کیوں نہ اٹھایا؟

پہلے باب میں اس بات کا تجزیہ کیا گیا ہے کہ وہابیت کس طرح عالمی جہاد کے لیے ایک نظریاتی ماخذ کے طور پر کام کرتی ہے۔ اس کی بنیادی تحریریں چودھویں صدی کے عالم دین تقی الدین احمد ابن تیمیہ کی تصانیف پر مشتمل ہیں، جنہیں بعد میں اٹھارہویں صدی میں نجد کے ایک اسلامی اسکالر اور متکلم محمد بن عبدالوہاب نے وسعت دی اور باقاعدہ ادارہ جاتی شکل دی۔ یہ باب سعودی عرب کی ابتدائی تاریخ پر مذہبی اور سیاسی زاویوں سے روشنی ڈالتا ہے اور وضاحت کرتا ہے کہ کس طرح عبدالوہاب اور ابن سعود جو مملکت سعودی عرب کے بانی تھے، کے درمیان ہونے والے معاہدے نے دونوں کو اپنے بڑے مقاصد حاصل کرنے میں باہمی طور پر مدد فراہم کی۔ ابتدائی طور پر، جب وہابیت کے نظریے کو پھیلانے کی کوشش کی گئی، تو انہیں نخلستانی بستیوں کی طرف سے مختلف رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ درعیہ کا دور اندیش اور پر عزم سردار، ابن سعود، خود بھی ابتدا میں اس نظریے کے خلاف تھا۔ تاہم، بعد میں وہ اس وقت قائل ہوا جب اسے اس نظریے میں مذہبی اور سیاسی طاقت کا ایسا ذریعہ نظر آیا جس کے ذریعے درعیہ کی بستیوں پر غلبہ پایا جاسکتا تھا۔ آہستہ آہستہ یہ نظریہ عربوں میں مقبول ہوتا گیا، اور ابن سعود ایک ایسے رہنما کے طور پر ابھرے جو عثمانی حکمرانوں کا سامنا کر سکتا تھا اور حجاز کے خطے پر قبضہ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا جو اس وقت ایک بڑی آمدنی کا ذریعہ تھا۔

یوں درعیہ کے نخلستان میں پہلی سعودی ریاست قائم ہوئی۔ عثمانی سلطنت، جو پورے جزیرہ نماعرب پر حکمرانی کر رہی تھی، نے اس خطرے کو بھانپ لیا اور فوراً ابراہیم پاشا کی قیادت میں ایک بڑی فوج روانہ کی۔ اس نے آل سعود کے حکمران اور وہابی نظریہ پھیلانے والے اس کے پیروکاروں کو پھانسی دے دی۔ باقی قیادت کو خطے سے نکال دیا گیا، اور وہ کویت میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئی۔

باب میں آگے چل کر بتایا گیا ہے کہ کس طرح آل سعود خاندان کے عبدالعزیز ابن عبدالرحمن نے بعد میں اخوان گروہ اور دیگر کرائے کے سپاہیوں کی مدد سے واپس آ کر جزیرہ نماعرب پر دوبارہ قبضہ کیا۔ اس وقت برطانوی سلطنت، جزیرہ نماعرب میں عثمانی سلطنت سے سیاسی بالادستی

کے لیے مقابلہ کر رہی تھی۔ برطانوی حکومت نے سعودی افواج کی حمایت کی، اور جلد ہی انہوں نے جزیرہ نما عرب پر اپنی حکمرانی قائم کر لی۔

دوسری جنگ عظیم نے امریکہ کو یورپی محاذِ جنگ پر اتحاد کا قائد بنادیا۔ صدر روز ویلٹ نے سعودی عرب کے ساتھ ایک خصوصی تعلق استوار کیا اور آل سعود خاندان کے سرپرست اور رہنما کا کردار اختیار کیا، جو آج تک جاری ہے۔ البتہ، یہ تعلق 9/11 کے دہشت گرد حملوں کے بعد سخت آزمائش کا شکار ہوا۔ اگرچہ سی آئی اے اور ایف بی آئی نے ان حملوں کی سازش اور انخاب مہمی میں سعودی شہریوں اور افسران کے براہ راست تعلقات ثابت کیے، امریکی حکومت نے ہمیشہ انہیں تفتیش اور قانونی کارروائی سے محفوظ رکھا۔

اس باب میں بتایا گیا ہے کہ گزشتہ چالیس برسوں کے دوران وہابی۔ سلفی اسلام نے امریکہ میں مقیم مسلمانوں پر کس طرح اثر ڈالا، اور کس طرح امریکہ کے مختلف صدور نے سہولت پسندی سے اس خطرے کو نظر انداز کیا، اور سعودی عرب کو کبھی خبردار کرنا ضروری نہیں سمجھا، حالانکہ امریکی ماہرین نے بارہا ان کو آگاہ کیا۔ یہ موقف اختیار کیا گیا ہے کہ اکیسویں صدی میں دُنیا بھر کے مسلمان اُس فیصلے کے نتائج بھگت رہے ہیں، جو سعودی عرب نے 1979 میں لیا تھا، یعنی سخت گیر وہابی اسلام کو فروغ دے کر ایک وسیع النظر اور روادار صوفی سنی اسلام کو پس پشت ڈال دینا، جو ہمیشہ دیگر مذاہب کا احترام کرتا تھا۔ تاہم، موجودہ سعودی قیادت، ولی عہد محمد بن سلمان (جنہیں ایم بی ایس بھی کہا جاتا ہے)، اس نقصان کو کم کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ انہوں نے وہابیت کو معتدل بنانے کے لیے کچھ اقدامات کیے ہیں، جن میں مذہبی قیادت کے اختیارات محدود کرنا اور ان کو دی جانے والی مالی معاونت میں کمی شامل ہے۔

اس باب میں مراکش، جو ایک شمالی افریقی ملک ہے، کی ایک مثال بھی پیش کی گئی ہے کہ کس طرح اس نے وہابی نظریات کو ملک کے مختلف مذہبی اداروں سے صاف کرنے کا عمل اپنایا۔ مراکش کے بادشاہ کی سرپرستی میں مذہبی قیادت دنیا کو یہ دکھا رہی ہے کہ اگر حکومتیں چاہیں، تو اسلام کو اس کی بنیادی اقدار، رواداری اور دیگر مذاہب کے احترام کے ساتھ دوبارہ زندہ کیا جاسکتا ہے۔

اگر ایسا ہو، تو فن، ثقافت، موسیقی، سائنس اور تعلیم جیسے شعبے، خواتین کی مکمل شمولیت کے ساتھ، مسلم معاشروں میں دوبارہ پھیلیں پھولیں گے، جیسا کہ وہ تقریباً ایک صدی پہلے پھلتے پھولتے تھے۔

دوسرے باب میں مسلم دنیا میں فرقہ وارانہ خلیج اور اس کے مشرق وسطیٰ کے مستقبل پر اثرات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ 1979 کے اسلامی انقلاب کے بعد فرقہ واریت نے ایک نیا موڑ لیا، تاہم مسلم دنیا میں اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان تاریخی تقسیم کا فیصلہ کن لمحہ سن 680ء میں عراق میں پیش آنے والی جنگ کر بلا تھی۔ کر بلا کے بعد چوتھے خلیفہ، حضرت علی بن ابی طالبؓ کے پیروکاروں نے اپنے کیمپ کو ایک الہیاتی تحریک میں تبدیل کر دیا، اور یوں اسلام دو بڑے فرقوں یعنی سنی اور شیعہ میں تقسیم ہو گیا۔ باب میں مختصر اُیران کی شیعہ تاریخ کا جائزہ لیا گیا ہے، اور بتایا گیا ہے کہ 1501 میں صفوی سلطنت کے بانی، شاہ اسماعیل نے شیعیت کو ایران کا سرکاری مذہب قرار دیا۔ صفوی سلطنت نے 1501 سے 1722 تک ایران پر حکومت کی۔ سنی عثمانی خلافت اور شیعہ صفوی سلطنت کے درمیان شدید دشمنی تھی، جو مشرق وسطیٰ کے قلب میں مسلسل جنگوں کی صورت میں جاری رہی۔ یہی وہ دور تھا جب فرقہ وارانہ تقسیم نے گہرا رخ اختیار کیا۔ صفویوں نے کچھ وقت کے لیے عراق پر بھی قبضہ کیا اور وہاں کی بڑی آبادی کو شیعہ مذہب میں داخل کرایا، کبھی جبر سے، کبھی قائل کر کے۔ عراق 1921 میں برطانوی مینڈیٹ کے تحت ایک ریاست کے طور پر وجود میں آیا، اور 1932 میں ایک آزاد ملک کی حیثیت اختیار کی۔ تاہم، عراق اس سے قبل بھی ایک ہزار سال سے زیادہ مختلف سلطنتوں، جیسے عباسی، منگول، اور عثمانی کے تحت صوبوں کی شکل میں موجود رہا۔ عراقی عرب اپنی عرب شناخت پر ہمیشہ فخر کرتے رہے، اور وہ عراقی قوم پرستی کے علمبردار رہے، اگرچہ انہوں نے اپنی سنی یا شیعہ شناختوں کو بھی جداگانہ طور پر برقرار رکھا۔ ان تینوں اقسام کی قومی شناختیں یعنی عرب، سنی، اور شیعہ ایک ساتھ موجود ہیں۔

سعودی شاہی خاندان (آل سعود) نے امریکہ کو عراق پر حملے کے ممکنہ غیر ارادی نتائج سے خبردار کیا تھا، کیونکہ اس سے عراق میں جمہوریت کو فروغ ملتا اور شیعہ اکثریت کو اقتدار حاصل ہوتا، جو کہ مشرق وسطیٰ کے قلب میں واقع سنی عرب بادشاہتوں کے لیے سخت ناپسندیدہ تھا۔ خطے

کے سنی عرب حکمران اس انجام سے سخت نفرت کرتے تھے۔ امریکی انتظامیہ اسلامی دنیا میں موجود فرقہ وارانہ دراڑوں سے مکمل لاعلم تھی، اور اس خوش فہمی میں مبتلا تھی کہ صدام حسین جیسے ظالم آمر کو ہٹا دینے سے عراق کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ امریکہ نے عراق میں پہلی بار شیعہ قیادت والی حکومت قائم کی، جو فطری طور پر ایران کی حامی تھی۔ بلاشبہ، عراق میں امریکی مداخلت کا سب سے بڑا فائدہ اسلامی جمہوریہ ایران کو ہوا۔ یہ پہلا موقع تھا جب ایران کو اپنے مغربی پڑوس میں ایک دوستانہ حکومت ملی۔ شیعہ اسلام کے تمام اہم مذہبی مقامات کو کربلا اور نجف کے مزارات عراق ہی میں واقع ہیں۔ ایک طویل عرصے کے بعد ایران اور دیگر ممالک کے شیعوں کو ان مقامات تک آزادانہ رسائی حاصل ہوئی۔ تاہم، القاعدہ اور اس کے ذیلی گروہوں جیسے جماعت التوحید والجمہاد (ابومصعب الزرقاوی کی قیادت میں) سے وابستہ جہادی ان تبدیلیوں کے خاموش تماشائی نہیں بنے رہے۔ انہوں نے فرات دریا کی وادی کے شہروں میں سنی گوریلا گروہوں کو منظم کیا۔ ان کا مقصد سنی علاقوں میں شیعہ مخالف بیانیہ قائم کرنا تھا، اور امریکی انتظامیہ کی جانب سے برطرف کردہ سابق فوجی افسران کو اپنی طرف متوجہ کرنا تھا۔ پورے مشرق وسطیٰ کی سنی عرب برادریوں میں یہ تاثر زور پکڑنے لگا کہ امریکی حملے کا بنیادی مقصد سنی اسلام کو کمزور کرنا اور گمراہ شیعوں کو طاعت دینا تھا۔ فرقہ واریت کو مزید تقویت اس وقت ملی جب صدر براک اوباما نے یہ رائے اختیار کی کہ ایران کو جو ہری حد حاصل کرنے سے روکنے کے لیے امریکہ کو اس سے مذاکرات کرنے چاہئیں۔

امریکہ اور ایران کے درمیان جو ہری معاہدے نے خطے میں فرقہ وارانہ جذبات کو اور زیادہ ہوادی۔ فرقہ واریت ایک بہت بڑے (prism) کی صورت اختیار کر گئی۔ لوگوں نے اپنے ہمسایوں کو بھی اسی عینک سے دیکھنا شروع کیا، اور حکومتوں نے اپنے علاقائی حریفوں کو جانچنے کے لیے بھی اسی پیمانے کو استعمال کیا۔ شام، یمن اور عراق میں جاری تنازعات نے شیعہ اور سنی ممالک کے درمیان پر کسی جنگوں کی واضح شکل اختیار کر لی۔ یہ باب مشرق وسطیٰ کی بڑی معیشتوں جیسے سعودی عرب اور قطر کے درمیان بدلتے ہوئے سیاسی تعلقات کے فرقہ وارانہ

پہلوؤں کا جائزہ لیتا ہے، اور یہ کہ کس طرح اسرائیل نے فرقہ واریت کو ایک ہتھیار بنا کر تمام عرب بادشاہتوں کو ایران کے خلاف متحد کرنے کی کوشش کی۔ اسرائیل کی یہ حکمت عملی بہت مؤثر ثابت ہوئی؛ وہ دنیا کی توجہ فلسطینی ریاست کے مسئلے سے ہٹا کر، مزید مغربی کنارے پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مشرق وسطیٰ میں فرقہ واریت کی شدت میں کوئی کمی نظر نہیں آتی؛ بلکہ یہ دراز مزید گہری ہونے کے آثار دکھا رہی ہے، اور اس کے نتیجے میں دنیا بھر کے 1.6 ارب مسلمانوں کا مستقبل خطرے میں پڑ سکتا ہے۔

تیسرے باب میں مشرق وسطیٰ میں ابھرتے ہوئے شیعہ ہلال پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ یہ اصطلاح اردن کے بادشاہ عبداللہ دوم نے 2004 میں استعمال کی تھی، جو اسلامی جمہوریہ ایران کی مداخلت پسند پالیسیوں پر ایک تنبیہ تھی۔ بادشاہ نے درست اندازہ لگایا تھا کہ ایران کے ابھرنے سے خطے میں طاقت کا توازن بری طرح متاثر ہوگا۔ 2003 میں عراق پر امریکی حملے کے بعد سے ایران کا اثر و رسوخ مسلسل بڑھ رہا ہے۔ سعودی عرب اور ایران، یہ دونوں علاقائی طاقتیں، اپنی اسلامی تعبیرات کے ذریعے مشرق وسطیٰ میں غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ امریکی صدر نے اسرائیل اور سعودی عرب کے دباؤ پر ایران پر سخت معاشی پابندیاں عائد کیں۔ یقیناً، دونوں اطراف میں دشمنی بہت گہری اور حقیقی ہے۔ لیکن اکثر یہ دشمنی عرب قوم پرستی کے جذبات میں دب جاتی ہے، جیسا کہ 2020 کے اوائل میں عراق میں شیعہ عوام کی جانب سے ایران مخالف مظاہروں میں دیکھا گیا۔ 1979 میں اسرائیل اور مصر کے درمیان ہونے والے معاہدے نے مشرق وسطیٰ کے علاقائی اتحادوں پر گہرا اثر ڈالا۔ اس وقت شام کے صدر حافظ الاسد نے خود کو تنہا محسوس کیا اور ایران کے ساتھ ایک اسٹریٹجک تعلق قائم کیا، جو مفادات کے تحت قابل تبادلہ تھا۔ ایک موقع پر، شام نے اسرائیل سے گولان کی پہاڑیوں کے معاملے پر مذاکرات کیے اور امریکہ سے تعلقات بہتر بنانے کا وعدہ کیا، بشرطیکہ ایران سے تعلقات منقطع کر دیے جائیں۔ شام کی خانہ جنگی کے آغاز سے ہی، ایران نے لبنان سے حزب اللہ کے جنگجوؤں کی رسائی کو ممکن بنایا اور سعودی عرب کو شام کے معاملات سے دور رکھا۔ ایران کے لیے شام کی جنگ

انتہائی اہم تھی کیونکہ یہ شدت پسند سنی بغاوت کے خلاف تھی، جو شیعوں کو کافر سمجھتے ہوئے خاتمے کے قابل سمجھتے تھے۔

ایران کا علاقائی و فرقہ وارانہ دشمن یمن، شام کی طرح تزویراتی حیثیت رکھتا ہے، خاص طور پر باب المندب کی آبی گزرگاہ اور سعودی عرب کے ساتھ طویل سرحد کے باعث۔ یمن میں ایران کی حوثی باغیوں کو حمایت، سعودی عرب کی قومی سلامتی کے لیے خطرہ بن گئی ہے۔ دوسری طرف، سعودی فضائیہ کے یمن پر مسلسل حملے نے انسانی بحران پیدا کر دیا ہے۔ اقوام متحدہ اور امریکی کانگریس نے اس صورت حال پر تشویش کا اظہار کیا اور امریکی صدر سے درخواست کی کہ وہ سعودی عرب کو بمباری روکنے اور حوثیوں سے مذاکرات کرنے پر آمادہ کریں تاکہ یہ مسئلہ جو شہری زندگی کے لیے ایک ڈراؤنا خواب بن چکا ہے، حل ہو سکے۔

جوہری معاہدے (JCPOA-Joint Comprehensive Plan of Action) کے تحت، ایران مکمل طور پر 2015 کے معاہدے کی پاسداری کر رہا تھا، جو P5+1 ممالک اور یورپی یونین کے ساتھ طے پایا تھا۔ بین الاقوامی ایٹمی توانائی ایجنسی (IAEA) نے اپنی تکنیکی رپورٹوں میں واضح طور پر کہا کہ ایران مکمل طور پر معاہدے پر عمل کر رہا تھا۔ تاہم، امریکی صدر نے ایک عجیب فیصلے میں JCPOA سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ نومبر 2018 میں پابندیاں دوبارہ نافذ کی گئیں، جس سے ایران کو مجبوراً اپنی علاقائی پالیسیوں اور بیلٹک میزائل پروگرام میں بڑی تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ امریکہ اور یورپ کے تمام سکیورٹی ماہرین نے صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے اس غیر سنجیدہ اقدام پر تنقید کی۔ اقوام متحدہ میں امریکہ کی سابق سفیر کی ہیلی نے JCPOA کے خلاف جھوٹے دعوے گھڑنے کی کوشش کی، لیکن IAEA اور یورپی اتحادیوں نے ان الزامات کو مسترد کر دیا۔

صدر ولادیمیر پوٹن کی شام میں براہ راست مداخلت نے ایران اور روس کو ایک ساتھ لاکھڑا کیا، اور یوں وہ سعودی-امریکی اتحاد کے خلاف ایک مضبوط قوت کے طور پر ابھرے۔ ترکی، قطر اور روس جیسے ممالک پر مشتمل ایک منظم اتحاد ایران کے گرد جمع ہو چکا ہے، جو واضح تزویراتی اہداف، نظریاتی وابستگی اور مشرق وسطیٰ میں مزاحمتی قوتوں کی حمایت کے طویل تجربے سے لیس ہے۔

ایران اس وقت خطے کے کئی تنازعات میں اپنے پراسکیز کی حمایت کر رہا ہے۔ امریکہ کی مشرق وسطیٰ سے پسپائی اور روس کی فعال شمولیت نے ایران کو علاقائی طور پر مزید باختیار بنادیا ہے۔ جیڈ کسٹر، جو مشرق وسطیٰ سے متعلق امریکی صدر کے چیف ایڈوائزر تھے، نے اسرائیل کو سعودی قیادت میں قائم سنی عرب ممالک کے ہلاک کے قریب لاکھڑا کیا ہے۔ متحدہ عرب امارات اور بحرین پہلے ہی اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے کا معاہدہ کر چکے ہیں۔ یہ پہلا موقع ہے کہ تمام عرب ممالک فلسطینی کا زکوٰۃ کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ امن قائم کرنے کے جھوٹے بہانے کے تحت امریکہ دراصل ایران کی مداخلت پسندانہ خواہشات پر قابو پانے اور اہم تیل پیدا کرنے والے عرب ممالک کو اسرائیل کے زیر اثر لانے کے درپے ہے۔ اس مقصد کے لیے 'ابراہیم معاہدات' (Abraham Accords) جیسے خفیہ نارملائزیشن معاہدے کو اپنایا گیا، جو انتہائی تشویش ناک ہے۔ اس معاہدے کے تحت اسرائیل کو متحدہ عرب امارات میں سمندری، ہوائی اڈوں، مواصلاتی نیٹ ورکس اور بینک اکاؤنٹس کی نگرانی کا اختیار حاصل ہوگا۔

70 سالہ اسرائیل۔ فلسطین تنازعہ، جو کبھی عرب دنیا کی اولین ترجیح ہوا کرتا تھا، اب ان کے ایجنڈے سے غائب ہو چکا ہے۔ اس کے برعکس، ایران نے فلسطینیوں کے حقوق کے دفاع میں مرکزی کردار سنبھال لیا ہے، جس کی وجہ سے اسرائیل نے ایران کو مشرق وسطیٰ میں اپنا سب سے بڑا دشمن قرار دے دیا ہے۔ اب اسرائیل عرب ممالک کو انٹیلیجنس اور عسکری حکمت عملی میں مدد فراہم کرے گا۔ بحرین کے سنی حکمران ہمیشہ سے ملک میں موجود شیعہ اکثریت سے خائف رہے ہیں، اور اسرائیلی انٹیلیجنس نگرانی کی حکمرانی کو مضبوط بنانے میں مدد دے گی۔ اسرائیل کا ایک اور طویل مدتی دشمن 'حماس' ہے، جو غزہ پر حکمرانی کرنے والا عسکری گروہ ہے۔ حماس دراصل انخوان المسلمون کی شاخ ہے، جو عرب بادشاہتوں کے مشترکہ دشمنوں میں سے ایک ہے۔ موساد، اسرائیل کی انٹیلیجنس ایجنسی، کو خلیجی عرب بادشاہتوں کی خفیہ معلومات تک مکمل رسائی حاصل ہو جائے گی۔ سعودی عرب اور ایران کے درمیان پیچیدہ اور پرت در پرت تعلقات دراصل مشرق وسطیٰ کی قیادت کے لیے جاری کشمکش ہے۔ یہ سیاست، معیشت، نظریے اور جغرافیائی سیاست پر غلبہ پانے

کی جنگ ہے، جو گزشتہ کئی دہائیوں سے مختلف شکلوں میں جاری ہے۔

باب چہارم میں سعودی عرب اور ایران کے درمیان رقابت کی ابتدا کا جائزہ لیا گیا ہے، جو اسلامی انقلاب کے بعد سے شدت اختیار کر گئی۔ امریکہ اور سعودی عرب کے درمیان معاشی اور عسکری اتحاد جو 1930 کی دہائی سے قائم ہے، وہ امریکی خارجہ پالیسی کا ایک مستقل پہلو رہا ہے، حالانکہ سعودی عرب ایک جاہلانہ بادشاہت کے تحت چلنے والا ملک ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ سعودی عرب کے وہابی نظریات نے دنیا بھر میں مسلمانوں کے اندر انتہا پسندی کے پھیلاؤ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ سخت گیر نظریہ دوسرے مذاہب کو کافر اور دشمن قرار دیتا ہے اور وہابی۔ سلفی عفت اند کے علاوہ دیگر اسلامی فرقوں کے لیے شدید عدم برداشت کو فروغ دیتا ہے۔ یہ نظریہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے خلاف تشدد کو بھی جائز قرار دیتا ہے، حالانکہ روایتی صوفی سنی اسلام میں یہ عمل حرام سمجھا جاتا ہے۔ سعودی عرب نے مشرق وسطیٰ کے سنی عرب ممالک کا ایک خاموش اتحاد قائم کیا، جبکہ ایران کے ساتھ اس کی کشیدگی دو بنیادی معاملات پر مرکوز رہی:

1۔ سیاسی و اقتصادی قیادت کی جنگ

2۔ مذہبی و نظریاتی برتری کی لڑائی

کیونکہ دونوں ممالک اسلام کے دو متحارب مکاتب فکر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی اکثریت سنی ہے (تقریباً 80 فیصد) اور یہ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جبکہ اہم شیعہ آبادی والے ممالک میں ایران، عراق، آذربائیجان اور بحرین شامل ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ یمن، شام، لبنان، کویت اور قطر میں بھی شیعہ بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ 2011 کی عرب شورش سعودی عرب اور ایران کی رقابت کی تاریخ میں ایک اہم موڑ ثابت ہوئی۔ اس نے مشرق وسطیٰ کے سیاسی منظر نامے کو گہرائی سے متاثر کیا۔ اس کا ایک اہم نتیجہ یہ نکلا کہ بحرین، یمن، شام اور لبنان جیسے ممالک میں عوام مکمل طور پر مسلکی بنیادوں پر منقسم ہو گئے، اور ان ممالک میں موجود شیعہ آبادی نے سنی حکمران اشرافیہ کے خلاف احتجاج شروع کر دیے۔

حسین بدرالدین الحوثی اور ان کے بھائی عبدالملک الحوثی یمن کے شمالی علاقے سعدہ سے تعلق

رکھتے ہیں، جو قبوے کی کاشت کے لیے مشہور ہے۔ وہ زیدی شیعہ تحریک کے رہنما ہیں اور یمن کے شمال مغربی پہاڑی علاقوں میں سرگرم عمل ہیں۔ حوثی قیادت نے زیدی شیعہ قبائل کے ساتھ ذاتی و تنظیمی تعلقات قائم کیے ہیں۔ یہ قبائل 30 سے 40 فیصد یمنی آبادی پر مشتمل ہیں، اور 2004 سے مرکزی حکومت کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔ یہ تحریک دراصل زیدی فرقے کے حقوق کے دفاع کے لیے بنی، کیونکہ شمالی قبائل کے ساتھ حکومت کا امتیازی سلوک روا تھا۔ یمن میں ماضی میں کوئی فرقہ وارانہ مسئلہ نہیں تھا اور شیعہ اور سنی فرقوں کے درمیان دشمنی کا کوئی رجحان نہیں تھا۔ لیکن عرب شورش کے بعد جب حوثی بغاوت اٹھی تو سعودی عرب نے مظاہرین پر فضائی حملے شروع کیے۔ بعد ازاں ایران نے مداخلت کی، جس کے بعد یہ تنازع حوثیوں کے حق میں تبدیل ہونے لگا۔ ریاض کو خدشہ تھا کہ حوثی، ایران اور حزب اللہ کی سرپرستی میں، اس کے جنوبی سرحد پر ایک خطرناک جنگجو قوت بن سکتے ہیں۔ سعودی فضائی بمباری سے 10000 سے زائد شہری ہلاک ہو چکے ہیں، مگر پھر بھی حوثی ملیشیا ریاض ایئرپورٹ تک میزائل فائر کرنے کی صلاحیت حاصل کر چکی ہے۔ یہ بات اب راز نہیں رہی کہ حوثی ایرانی میزائل استعمال کر رہے ہیں تاکہ سعودی اہداف کو نشانہ بناسکیں۔ ایران افغانستان، پاکستان اور کچھ شیعہ عرب ممالک سے تربیت یافتہ جنگجو یمن میں تعینات کر رہا ہے۔ امریکی حکومت نے ولی عہد محمد بن سلمان کو سختی سے مشورہ دیا کہ وہ جوابی حملوں سے گریز کریں اور غربت زدہ عرب ملک پر مزید حملے نہ کریں۔ متحدہ عرب امارات اس جنگ میں سعودی اتحاد سے دستبردار ہو چکا ہے۔ امریکہ ایک جنگ بندی نافذ کرنا چاہتا ہے اور تمام فریقین کو مذاکرات کی میز پر لانے کی کوشش کر رہا ہے۔ امریکی صدر اور اسرائیلی ٹیم نے ولی عہد کو قائل کر لیا ہے کہ مشرق وسطیٰ میں سب سے بڑا خطرہ ایران اور اس کے حلیفوں سے ہے، نہ کہ صیہونی ریاست اسرائیل سے۔ فلسطینی مسئلہ وقت کے ساتھ جمود کا شکار ہو چکا ہے اور اب عرب اتحاد اس مسئلے پر باقی نہیں رہا۔ سعودی حمایت یافتہ مشرق وسطیٰ منصوبے کے تحت، امریکی قیادت میں خلیجی ممالک کو اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے تاکہ ایران کا مقابلہ کیا جاسکے۔ امریکی انخلا نے عرب بادشاہتوں کو خوفزدہ کر دیا ہے اور وہ

سلامتی کے نئے متبادل کی تلاش میں ہیں۔ پہلی بار، اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد عرب بادشاہتوں کے سلامتی اداروں کے ساتھ قریبی تعاون کرے گی اور ممکنہ خطرات پر انہیں مشورے دے گی۔ ولی عہد کے تحت سعودی خارجہ پالیسی ایک غلط سمت میں جا رہی ہے اگر وہ امریکہ کی حمایت کو اپنی پالیسیوں کی بنیاد سمجھے۔ امریکہ کی ایما پر اسرائیل کے سامنے سعودی اور چھوٹی سنی ریاستوں کا جھکاؤ طویل المدت میں منفی نتائج کا سبب بنے گا۔ ایران کو اس ”ناپاک اتحاد“ کی کوئی پروا نہیں، بلکہ وہ روس کی قیادت میں نئے اتحاد کا اہم رکن بن چکا ہے، جس میں ترکی، چین اور قطر جیسے ممالک بھی شامل ہیں۔

پانچویں باب میں امریکہ اور یورپ میں مسلم نوجوانوں میں پھیلتی ہوئی انتہا پسندی کے رجحان کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ باب کا آغاز امریکہ اور دیگر مغربی ممالک میں مسلمانوں کی ہجرت کی تاریخ سے ہوتا ہے، جس کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ بین الاقوامی جہادی تنظیمیں، جو سعودی عرب کی عالمی سطح پر پھیلائی گئی وہابی۔ سلفی نظریات سے متاثر ہیں، کس طرح مختلف طریقوں سے انتہا پسندی کو فروغ دیتی ہیں۔ یورپ میں مسلمانوں کی آمد سنہ 710 میں شروع ہوئی، جب عربوں اور شمالی افریقی بربروں نے آئبیریا کا علاقہ (موجودہ اسپین و پرتگال) فتح کیا، جہاں انہوں نے کئی مسلم سلطنتیں قائم کیں جو صدیوں تک قائم رہیں۔ بعد میں جب عیسائی نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کا دور آیا، تو ان مسلم تہذیبوں کو حاشیے پر ڈال دیا گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد یورپ میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ہجرت کر کے پہنچی۔ اسپین میں بائیں بازو کی سیاسی جماعتیں اسلامی ماضی کو رومانویت سے دیکھتی ہیں، لیکن دوسری طرف قدامت پسند عیسائیوں میں سخت ناراضگی دیکھی گئی کہ کہیں اسلامی شان و شوکت کو دوبارہ زندہ نہ کیا جائے۔ یورپ میں وہابی۔ سلفی اسلام نے زوال پذیر عیسائیت کو زیر کر لیا ہے۔ عیسائی بالادستی کے علمبرداروں کو یہ خدشہ لاحق ہے کہ ہزاروں خالی گرجا گھر مختلف علاقوں میں موجود ہیں جو کسی بھی وقت مساجد یا نمازگاہوں میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ فرانس میں چھ ملین سے زائد مسلمان موجود ہیں، حالانکہ یہ ملک ریاستی سیکولرزم کے اصول پر قائم ہے۔ گزشتہ 45 برسوں میں فرانسیسی مسلمانوں کا جھکاؤ

وہابیت کی طرف مکمل ہو چکا ہے، کیونکہ اب تمام مساجد کا غالب بیانیہ وہابی سلفیت بن چکا ہے، جنہیں سعودی عرب کی مسلم ورلڈ لیگ نے کروڑوں ڈالر کی امداد سے مساجد کی تعمیر، اماموں کی تربیت، اور وہابی لٹریچر کی تقسیم کے لیے فنڈ کیا۔ ان کی توجہ شہری مضافات (suburbs) میں بسنے والی الگ تھلگ مسلم برادریوں پر تھی، جو فرانسیسی معاشرے کے مرکزی دھارے سے بالکل کٹ کر زندگی گزار رہی تھیں۔ ان کی شناخت مکمل طور پر مذہب اسلام سے جڑی ہوئی تھی اور وہ فرانسیسی سماجی اقدار کو اسلام دشمن سمجھتے ہوئے مسترد کر چکے تھے۔ 2013 سے اب تک کم از کم 1700 نوجوان فرانسیسی مرد و خواتین نے اسلامک اسٹیٹ آف عراق و شام (داعش) میں شمولیت اختیار کی۔ یہی افراد فرانس میں 2015 اور 2016 میں ہونے والے دہشت گرد حملوں کے پیچھے تھے۔ فرانسیسی ریاست، باوجود اپنی غیر جانبداری کے دعوے کے، مسلم مہاجرین کو قومی دھارے میں شامل کرنے کے لیے کئی اقدامات کر چکی ہے۔ صدر میکرون کا موجودہ منصوبہ ہے کہ مسلمانوں کو بیرونی ممالک سے ملنے والی فنڈنگ کو روکا جائے تاکہ فرانسیسی مسلم تنظیمیں غیر ملکی اثرات سے آزاد ہو سکیں۔ ایک اور اقدام یہ ہے کہ اماموں کی تربیت فرانس کے اندر ہی کی جائے، لیکن یہ تربیت مذہبی متون میں نہیں، بلکہ ثقافتی اقدار پر مبنی ہوگی، تاکہ ایک نئی نسل کے ’فرانس میں تیار کردہ‘ امام سامنے آئیں۔ مساجد سے سلفی اماموں کو ہٹا کر معتدل صوفی سنی امام تعینات کیے جائیں گے تاکہ مذہبی بیانیہ تبدیل کیا جاسکے۔ برطانیہ میں مسلمانوں کی موجودہ آبادی تقریباً 1.8 ملین ہے۔ تمام مساجد میں سلفی تعلیمات اور نوجوانوں کی انتہا پسندی عام ہے۔ برطانیہ میں سلفیت کو پھیلانے والی سب سے بڑی تنظیم ’سوسائٹی فار دی ری وائیول آف دی پروفیٹک ویز‘ ہے۔ یہ تنظیم اسلامی مطالعے کے حلقوں، مساجد، کمیونٹی مراکز اور یونیورسٹیوں کے ذریعے نوجوانوں میں سلفی نظریات کو فروغ دیتی ہے۔ 2016 سے 2018 تک برطانیہ میں جتنے بھی دہشت گرد حملے ہوئے، ان سب کا براہ راست تعلق انہی سلفی جہادی گروہوں سے تھا۔ یہ نظریہ نوجوان برطانوی مسلمانوں کے ذہنوں میں گہرائی تک رچ بس چکا ہے، جس کا نتیجہ مختلف مقامات پر دہشت گرد حملوں کی صورت میں ظاہر ہوا، جن میں سینکڑوں معصوم شہری اپنی جان سے

ہاتھ دھو بیٹھے۔ امریکہ اور کینیڈا میں ”مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن“ (MSA) 1963 میں قائم ہوئی، جو شروع میں یونیورسٹیوں میں طلبہ اور برادریوں کی قیادت کے ساتھ کام کرتی رہی۔ 2020 تک، امریکہ کی 80 فیصد سے زائد مساجد کے ساتھ اتوار کے اسکول (Sunday Schools) وابستہ ہو چکے تھے، جبکہ کمیونٹی سینٹرز میں وہابی-سلفی لٹرچر بڑے پیمانے پر استعمال کیا جا رہا تھا تا کہ بنیاد پرستانہ نظریات کو فروغ دیا جاسکے۔ کونسل آن امریکن-اسلامک ریلیشنز (CAIR) امریکہ میں وہابیت کی سب سے اہم نظریاتی تنظیم ہے۔ مساجد پر سلفی کنٹرول کا مطلب ہے کہ وہ جانیداد، عمارات، اماموں کی تقرری، تربیت اور خطبوں کے مواد پر مکمل اختیار رکھتے ہیں۔ جولٹرچر نمازیوں میں تقسیم کیا جاتا ہے وہ سیدھا ریاض کی ”وزارت اسلامی امور، دعوت و رہنمائی“ (MOIA) سے آتا ہے۔ اسلامک سوسائٹی آف نارٹھ امریکہ (ISNA) شمالی امریکہ کی سب سے بڑی مسلم تنظیم ہے۔ یہ ہر سال امریکہ کے کسی بڑے شہر میں ایک بڑا اجتماع منعقد کرتی ہے۔ CAIR اور ISNA دونوں کے سعودی حکومت سے قریبی تعلقات ہیں۔ انہیں باقاعدگی سے سعودی خیراتی اداروں جیسے مسلم ورلڈ لیگ (MWL) اور ورلڈ اسمبلی آف مسلم یوتھ (WAMY) کے ذریعے خطیر مالی امداد ملتی ہے۔ یہ وہ ادارے ہیں جو کبھی القاعدہ کے بڑے مالی معاون رہے ہیں۔ مسلمانوں کی تیسری اور چوتھی نسل، نسلی اور رنگ کی تفریق کے بغیر، وہابی-سلفی مساجد میں جاتی ہے اور انتہائی قدامت پسند ہو جاتی ہے۔ ان کا نظریاتی دائرہ کار بہت محدود ہوتا ہے۔ جمعے کے خطبے ہمہ وقت شدید وہابی پیغامات سے بھرے ہوتے ہیں۔ ان کی تقریریں اکثر ایسے حقیقی واقعات پر مبنی ہوتی ہیں، جیسے فلسطین پر اسرائیلی قبضہ یا عراق پر امریکی حملہ۔ یہ نوجوان، ایک طرف مغربی ثقافت سے بیگانہ ہو جاتے ہیں، اور دوسری طرف اپنی ہی کمیونٹی کی جانب سے لگائی گئی سماجی پابندیوں سے تنہائی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ نتیجتاً وہ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے ساتھ جڑ جاتے ہیں، جو انہیں وہابی-سلفی تنظیموں کی خود کار انتہا پسندی کا آسان شکار بنا دیتا ہے۔ اسلامی جہادی گروہ جدید ابلاغی ذرائع اور انٹرنیٹ کو اپنے وہابی-سلفی نظریات کو فروغ دینے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ نیویارک ٹائمز کے

معروف کالم نگار تھامس فریڈمین نے معلوماتی اور مواصلاتی ٹیکنالوجی سے پیدا ہونے والی عالمگیریت کو ”فلیٹ ورلڈ“ (چپٹی دنیا) کا استعارہ دیا تھا۔ جہادی تنظیمیں جیسے کہ القاعدہ، داعش اور الشباب اسی عالمی رابطے کی سب سے بڑی فائدہ اٹھانے والی قوتیں ہیں۔ یہ تنظیمیں تیزی سے جڑنے والے نیٹ ورکس کے ذریعے خفیہ پیغامات پوری دنیا میں پھیلاتی ہیں اور آن لائن کراؤڈ فنڈنگ کے ذریعے لاکھوں ڈالر اکٹھے کرتی ہیں۔ عام تاثر کے برعکس، اکثر نوجوان جو آن لائن انتہا پسندی کا شکار ہوتے ہیں، وہ پہلے سے مذہبی نہیں ہوتے۔ یہ رجحان تمام معاشی طبقات میں پایا جاتا ہے۔ مشترکہ بات یہ ہے کہ وہ سب وہابی۔ سلفی نظریات اور ان کے مغرب مخالف بیانیے سے اتفاق کرتے ہیں۔ امریکی نیشنل سکیورٹی کونسل کو اندرونی طور پر یہ بحث کرنی چاہیے کہ سلفی انتہا پسند نظریے کا مؤثر طور پر مقابلہ کیسے کیا جائے، کیونکہ یہی نظریہ مسلم برادریوں میں پرتشدد اسلامی انتہا پسندی کو جنم دیتا ہے۔ ان کی بھرتی کے عمل کو روکنا ضروری ہے، جس کے لیے ضروری ہے کہ وہابی۔ سلفی اسلام کے تنگ نظریہ کو بدل جائے اور ان گروہوں کو نظریاتی طور پر بے نقاب کیا جائے۔ چھوٹی بڑی تمام مسلم تنظیموں کو اعتماد میں لیا جائے اور نیشنل سکیورٹی کونسل کے افسران انہیں یہ بات سمجھائیں کہ اب کسی بھی انتہا پسند نظریے کو قابل قبول نہیں سمجھا جائے گا۔ امریکہ کی سلامتی اور انسدادِ دہشت گردی کی ایجنسیاں سب سے پہلے یہ قدم اٹھائیں کہ ملک بھر کی مساجد میں اماموں کی تقرری کے طریقے کو باقاعدہ بنایا جائے۔ اماموں کو ایک کثیر الثقافتی معاشرے میں پر امن بقائے باہمی کے اصولوں کے حوالے سے حساس اور باشعور بنانے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔ جیسا کہ سعودی عرب کی جانب سے سلفی نظریے کے دباؤ سے قبل کیا جاتا تھا۔ امریکی کانگریس کو اس حوالے سے قانون سازی کرنی چاہیے کہ ملک میں کسی بھی اسلامی انتہا پسند تنظیم کو بیرونی مالی امداد کی اجازت نہ ہو۔ فرانس جیسے ممالک حالیہ برسوں میں ایسے اقدامات کر چکے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ، ایسے اقدامات بھی کیے جاسکتے ہیں جو مقامی کمیونٹیز کے سماجی تانے بانے کو مضبوط کریں، تاکہ انتہا پسند نظریات نوجوان نسل کو متاثر نہ کر سکیں، چاہے وہ کسی بھی ذریعے سے آئیں۔

چھٹا باب میں اس بات سے بحث ہے کہ اسلامی انتہا پسند گروہ کس طرح سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کو ذہانت سے استعمال کر کے 'سائبر آرمی' بنا رہے ہیں، اور نو جوان مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو بھرتی اور شدت پسندی کی طرف راغب کر رہے ہیں۔ داعش (Islamic State) 'سائبر جہاد' کو ایک نئی سطح پر لے گیا، جہاں پہلے جامد ویب سائٹس، چیٹ فورمز، اور آن لائن میگزینز ہوتے تھے، وہاں اب انہوں نے جدید، انٹرایکٹو اور تیز رفتار سوشل میڈیا کا استعمال کیا۔ داعش، جو القاعدہ سے علیحدہ ہوئی، نے سوشل میڈیا ایپس اور جدید ترین آن لائن ٹولز کے ذریعے اپنے نظریات کی ترویج اور مشن کی تکمیل کو ممکن بنایا۔ کئی تحقیقات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ آن لائن انتہا پسند مواد بذات خود کسی کو شدت پسند نہیں بناتا، بلکہ یہ زمینی بھرتی کے عمل کی تکمیل کرتا ہے یا بھرتی کرنے والوں کا کام آسان بنا دیتا ہے۔ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا پلیٹ فارمز عام صارف کے لیے بھی بے شمار امکانات کی دنیا فراہم کرتے ہیں۔ یہ کم خرچ اور آسانی سے استعمال ہونے والے ذرائع ہیں۔ ایک فرد جعلی شناخت کے پیچھے چھپ کر پیغامات کو گمنامی میں پھیلانے کے قابل ہوتا ہے۔ یہ پیغامات وسیع تر گروہوں تک پہنچائے جاسکتے ہیں، اور ان کی نوعیت ایک فرد سے دوسرے فرد تک یا ایک سے کئی افراد تک ہو سکتی ہے، جس میں انتہائی انٹرایکٹیوٹی (باہمی تعامل) ممکن ہوتی ہے۔ کمپیوٹرز کی اگلی نسل، جو مصنوعی ذہانت (Artificial Intelligence) کی مدد سے کام کرے گی، جہادی تنظیموں کو اپنے تباہ کن مقاصد کے حصول کے لیے نئی راہیں فراہم کرے گی۔

یہ باب مشاہدہ کرتا ہے کہ مغربی اور اسلامی ثقافتوں کے درمیان موجود تضاد مغربی ممالک میں رہنے والے مسلمان نو جوانوں کو تنہائی اور اپنے ہم عمر ساتھیوں سے کٹ جانے کا احساس دے سکتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ آن لائن شدت پسندی اور دہشت گرد تنظیموں کی بھرتی کا آسان شکار بن سکتے ہیں۔

ساتویں باب میں اسلامی ریاست (داعش) کے عروج و زوال کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ یہ تنظیم ابو مصعب الزرقاوی کی قیادت میں القاعدہ کی سرپرستی میں وجود میں آئی، اور وقت کے ساتھ ساتھ

دنیا کی سب سے بڑی اور طاقتور انتہا پسند تنظیموں میں شمار ہونے لگی۔ یہ حصہ وضاحت کرتا ہے کہ اسلامی دہشت گرد تنظیموں نے دنیا کے مختلف حصوں سے ہزاروں جہادی جنگجوؤں کو اپنے تربیتی کیمپوں (بالخصوص افغانستان) میں متحرک کیا، اور کس طرح القاعدہ کے خیمے سے نکل کر انہوں نے اپنی الگ شناخت اور کردار پیدا کیا، یہاں تک کہ انہوں نے اپنی حلافت بھی قائم کر دی۔ اپنے انتہا پسند نظریات کو پھیلانے کے لیے پلیٹ فارمز استعمال کرنے والے الزرقاوی کو اکتوبر 2006 میں امریکہ کی جانب سے کیے گئے ایک خصوصی آپریشن میں ہلاک کر دیا گیا۔ اُن کی موت کے بعد تنظیم کی قیادت کے لیے نیا امیر مقرر کیا گیا۔ القاعدہ فی العراق (AQI) کا نام بدل کر اسلامک اسٹیٹ آف عراق (ISI) رکھا گیا۔ اس اسلامی ریاست کا منصوبہ عراق کے سنی اکثریتی صوبوں بغداد، انبار، کرکوک، صلاح الدین اور بابل کے کچھ حصے بی پر مشتمل تھا۔ ISI کی تشکیل کے اعلان میں ابو عمر البغدادی کو خلیفہ قرار دیا گیا۔ تاہم، جلد ہی وہ بھی امریکی فوج کے ہاتھوں ابو حمزہ المہاجر کے ساتھ مارا گیا، جو الزرقاوی کے بعد دوسرا اہم رہنما تھا۔ اس کے بعد ابو بکر البغدادی کو تنظیم کی قیادت سونپی گئی۔ ان کی قیادت میں، 2011 سے 2014 کے درمیان اسلامی ریاست نے سب سے زیادہ وسعت دیکھی۔ تمام سنی قبائلی قیادت داعش کے تحت آگئی، اور انہوں نے شیعہ حکومت کی کوششوں کو ناکام بنایا اور سنی برادری سے صلح کی کوششیں کیں۔ 2007 میں، دمشق (شام) ان غیر ملکی جنگجوؤں کے لیے ایک اہم عبوری مرکز بن گیا جو عراق کی بغاوت میں شامل ہونے جا رہے تھے۔ لیکن بعد میں، جب شامی بغاوت صدر بشار الاسد کے خلاف شکل اختیار کر گئی، تو ایک بڑی تعداد میں غیر ملکی جنگجوؤں نے شام میں ہی قیام کیا اور داعش (ISIS) کی بنیاد رکھی۔ 2013 میں، عراق اور شام کے درمیان جہادیوں کی آزادانہ آمد و رفت جاری تھی۔ جون 2014 تک، داعش نے سمر اور موصل جیسے اہم شہروں پر قبضہ کر لیا۔ امریکی تربیت یافتہ نئی عراقی فوج میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ موصل کا سقوط عراق کی تین بڑی کمیونٹیز سنی، شیعہ اور کردوں کے درمیان طاقت کا توازن بدلنے کا سبب بنا۔ عراق، شام کی سرحد اب عملی طور پر ختم ہو چکی تھی، کیونکہ داعش کی قوت میں شدید اضافہ ہو چکا تھا، جسے تھیار، جنگجو اور رقم فتح شدہ

علاقوں سے مل رہی تھی۔ ابوبکر البغدادی نے خود کو داعش (ISIS) کا خلیفہ قرار دیا اور تنظیم کا انتظامی ڈھانچہ ایک اہرام کی صورت میں ترتیب دیا، جس میں وہ خود ریاست کے سربراہ کے طور پر سب سے اوپر موجود تھا۔ بہت سے اہم عہدے سابق بعث پارٹی کے تجربہ کار فوجی افسران کو دیے گئے۔ ایک وقت میں ریاست کی ماہانہ آمدنی تین ملین امریکی ڈالر تھی، جس سے یہ دنیا کی سب سے دولت مند دہشت گرد تنظیم بن گئی تھی۔ ریاست میں شریعت کے سخت قوانین لاگو کیے گئے تھے، جن کے تحت مجرموں کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔

داعش ہمیشہ ایک جہادی تنظیم رہی، جس کی بنیاد وہابی سلفی نظریے پر تھی۔ یہ الزام عائد کیا گیا کہ صدر اوباما کی داعش کے پھیلنے ہوئے قدموں سے نمٹنے میں نااہلی نے ابوبکر البغدادی کو خلافت قائم کرنے اور شام و عراق کے بڑے علاقے پر قبضہ کرنے کا پورا موقع دیا۔ آخر کار، 2015 میں صدر اوباما نے کردوں کی مدد کے لیے فضائی طاقت اور فوجی مشیروں کی مدد فراہم کرنے کا فیصلہ کیا، جو کہ ایک فیصلہ کن موڑ ثابت ہوا: امریکہ نے داعش کی خلافت کو زمینی فوج اتارے بغیر ہی ختم کر دیا۔

2016 میں، صدر ٹرمپ نے اوباما انتظامیہ سے وہ پالیسی ورثے میں حاصل کی جو شام اور عراق دونوں میں مؤثر ثابت ہو رہی تھی۔ شامی جمہوری فورسز (SDF)، جو کہ کرد اور عرب جنگجوؤں کا اتحاد تھا اور امریکی فضائی مدد سے تقویت یافتہ تھا، نے داعش خلافت کو شکست دی، جو کسی وقت عراق اور شام کے بڑے حصے پر محیط تھی۔ SDF نے امریکی مدد کے ساتھ داعش کی تقریباً 95 فیصد زمین واپس لے لی اور ہزاروں عرب اور غیر ملکی جنگجوؤں کو گرفتار کیا۔ 2017 تک، دریائے فرات کی وادی میں تقریباً تمام شہر SDF کے کنٹرول میں آچکے تھے، سوائے چند چھوٹے علاقوں کے۔ اگرچہ داعش کی زمینی خلافت ختم ہو چکی ہے، لیکن یہ ایک نظریے کے طور پر اب بھی زندہ ہے۔

آٹھویں اور آخری باب میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ اسلام کی ایک پر امن، روادار اور ترقی پسند روایت جس کی نمائندگی صوفی سنی اسلام کرتا ہے، کو از سر نو زندہ کرنے اور مسرورغ دینے کی ضرورت ہے۔ اس باب میں صوفی روایت کو وہابی، سلفی نظریے کا متبادل پیش کیا گیا ہے، جو گزشتہ

کئی دہائیوں سے دنیا میں نفرت، تشدد اور تنگ نظری پھیلا رہا ہے۔ باب میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح صوفی سنی اسلام صدیوں تک دنیا کے مختلف خطوں میں پھلتا پھولتا رہا، کیونکہ اس کا بنیادی پیغام امن، محبت اور انسانیت ہے۔ صوفیاء نے ہمیشہ سادگی، اخلاص، وسعتِ نظر اور رحم دلی کے ذریعے لوگوں کو اپنے قریب کیا۔ انہوں نے مختلف مذاہب، ثقافتوں اور فرقوں کے درمیان افہام و تفہیم، بھائی چارے اور ہم آہنگی کے پل بنائے۔

نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہؓ اللہ تعالیٰ کی محبت کے سب سے گہرے اور مکمل اظہار و تکمیل کی جانب مائل تھے۔ صوفیاء نے عمل کی بنیاد جس رہنمائی پر ہے، وہ قرآن و حدیث کی تعلیمات میں موجود ہے۔ مثال کے طور پر، خاموشی سے اللہ کو یاد کرنے کی مشق خود نبی کریمؐ نے اپنے صحابہؓ کو سکھائی۔ مشہور واقعہ معراج، یعنی نبی کریمؐ کا شبانہ سفر، اسلام کے سنجیدہ پیروکاروں اور صوفی سالکین کے لیے طویل عرصے سے ایک روحانی سفر کی تمثیل کے طور پر الہام کا ذریعہ رہا ہے۔ صوفی طالب علم وقت اور مقام کی جسمانی حدود سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ قربِ الہی حاصل کیا جاسکے۔ نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ایک مضبوط روحانی عنصر کے متعدد شواہد ملتے ہیں۔ صوفی سنی اسلام نے تیرہویں سے سولہویں صدی کے درمیان اسلامی دنیا میں ایک زرخیز فکری ثقافت کو جنم دیا، جسے اسلام کا ”سنہری دور“ کہا جاتا ہے۔

چودھویں صدی کے عالم دین، ابن تیمیہ، پہلے اسلامی مفکر تھے جنہوں نے صوفیاء کے ”عبادتِ اسلام“ پر تنقید کی۔ بعد ازاں، اٹھارہویں صدی میں، ایک اور عالم، محمد بن عبدالوہاب، ان کے نظریات سے متاثر ہوئے اور انہیں مزید وسعت دے کر سعودی خطے میں نافذ کیا، جب انہوں نے وہاں کے حکمرانوں سے اتحاد کیا۔ ان کی تعلیمات بعد میں ”وہابیت“ کے نام سے جانی جانے لگیں۔ درحقیقت، یہ سلفیت کی ایک شکل تھی، جو یہ دعویٰ کرتی ہے کہ اسلام کو صرف اسی صورت میں بچایا جاسکتا ہے جب اسے نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی ”قدیم اور حنِ الص“ حالت میں واپس لایا جائے۔ عبدالوہاب نے روایتی سنی علماء پر الزام عائد کیا کہ وہ قرآن کے اصل اصولوں سے ہٹ چکے ہیں۔ سعودی حکومت کی سرپرستی اور مالی مدد سے وہابی سلفیت کو نہ

صرف عرب میں جارحانہ طریقے سے پھیلا یا گیا، بلکہ اسے دنیا کے کئی دیگر ملکوں میں بھی برآمد کیا گیا۔ یوں وہابی سلفیت نے اسلام کی نرم روحانی جہتوں کو تباہ کیا اور اسے ایک شدت پسند جہادی طرزِ ایمان میں بدل دیا، جس سے دنیا بھر کے لوگ خوفزدہ اور بیزار ہیں۔ تصوف بیسویں صدی تک عالمی اسلامی زندگی کا ایک اہم جزو رہا، یہاں تک کہ سعودی عرب کے زیرِ اثر وہابی سلفیت کے غلبے نے اسلامی تہذیب پر اس کے تاریخی اثرات کو کمزور کرنا شروع کر دیا۔ ترکی اور ایران (قدیم فارس) ماضی میں صوفی سلاسل اور طریقوں کے بڑے مراکز رہے ہیں۔ صوفی شعراء اور فلسفیوں، جیسے جلال الدین محمد رومی، نے وسطی اور جنوبی ایشیا میں اسلام کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ سلطنتِ عثمانیہ کی فکری بنیادیں بھی صوفیانہ تعلیمات پر استوار تھیں۔ جب اٹھارہویں صدی میں عبدالوہاب نے اسلام کو ایک سخت گیر اور متشدد قالب میں از سر نو متعارف کرایا اور صوفیوں کو گمراہ قرار دیا، تو یہی سلطنتِ عثمانیہ کے حکمران تھے جنہوں نے صوفی روایات کا دفاع کیا۔ وہابیوں نے پوری کوشش کی کہ وہابیت کو واحد حقیقی اسلام کے طور پر پیش کیا جائے۔ وہابی سلفیوں نے صوفی سنی اسلام کی ان قدیم روایات کو تسلیم نہیں کیا جن میں مابعد الطبیعیات، اخلاقی تربیت، عبادتی اعمال، موسیقی، شاعری اور روحانی تجربات شامل تھے۔ ان تمام جہات کو وہ اسلامی اقدار سے متصادم سمجھتے تھے۔ سلفی پیر و کار ہمیشہ ان عقائد و اعمال کو اسلام سے نکالنے کی کوشش کرتے رہے، جنہیں وہ قرآن و حدیث کی تائید سے حلالی سمجھتے تھے۔ چودھویں اور پندرہویں صدی کے دوران، کئی شامی اور ہندوستانی علماء، جیسے شاہ ولی اللہ، نے روایتی صوفی ازم اور سلفی روحانیت کو باہم جوڑنے کی کوشش کی۔ تبلیغی جماعت کے بانیان اور ابتدائی رہنما بھی مختلف صوفی سلاسل سے وابستہ تھے۔ تاہم، اس تحریک نے جنوبی ایشیا میں موجود صوفیانہ طرزِ عمل، خاص طور پر بزرگانِ دین کی تعظیم، کوسختی سے رد کیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ تبلیغی جماعت نے وہابی، سلفی فکر کو دنیا بھر میں مسلم برادر یوں تک پہنچانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

امریکہ میں مسلمانوں کی سب سے بڑی تنظیم، ”اسلامک سوسائٹی آف نارٹھ امریکہ“ (ISNA)، سن 1979ء سے وہابی سلفیت سے مضبوطی سے جڑی ہوئی ہے۔ آٹھویں باب میں

تجویز کیا گیا ہے کہ امریکہ کی قومی سلامتی کونسل ISNA کی قیادت کو ساتھ لے کر مساجد اور ثقافتی مراکز میں پھیلائی جانے والی وہابی، سلفی شدت پسند بیانیے کو اعتدال پر لانے کے اقدامات کرے۔ یہ بھی سفارش کی گئی ہے کہ ملک بھر میں وہابی، سلفی نظریے کے متبادل کے طور پر ترقی پسند صوفی سنی اسلام کے فروغ کے لیے عملی اقدامات کیے جائیں۔ اس باب میں امریکی کانگریس پر زور دیا گیا ہے کہ وہ بھی فرانس کے صدر میکرون کی تجویز کی طرز پر ملک میں موجود سلفی شدت پسند تنظیموں کی بیرونی فنڈنگ پر قانون سازی کے ذریعے پابندی عائد کرے۔ باب کا مؤقف یہ ہے کہ امریکہ، ایک خود مختار ریاست ہونے کے ناطے، قومی سلامتی اور عالمی امن کے مفاد میں یہ اقدامات کرنے کا پورا حق رکھتا ہے۔

ابتدائیہ

سنہ 1979ء میں مشرق وسطیٰ میں تین ایسے ہولناک واقعات پیش آئے جنہوں نے موجودہ مسلم دنیا کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ واقعات تاریخ کے وہ نکتہ ہائے انحراف تھے جن سے جدید اسلامی انتہا پسندی اور دہشت گردی کے بیشتر مظاہر کو جوڑا جاسکتا ہے۔ ان میں سب سے پہلا واقعہ ایران کا انقلاب تھا، جسے اسلامی انقلاب ایران بھی کہا جاتا ہے۔ یہ انقلاب آیت اللہ خمینی (1902-1989) کی قیادت میں برپا ہوا۔ وہ یکم فروری 1979ء کی صبح پیرس سے ایک کرائے کے طیارے کے ذریعے اپنے رفقاء اور صحافیوں کے ہمراہ تہران پہنچے۔ ان کا استقبال کرنے کے لیے تیس لاکھ سے زائد افراد کا ہجوم سڑکوں پر موجود تھا۔ خمینی نے فوری طور پر مہدی بازرگان، جو تحریک آزادی ایران کے رہنما تھے، کو عبوری حکومت کا وزیر اعظم مقرر کیا۔ مشرق وسطیٰ کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب کسی بادشاہت کا خاتمہ فوجی بغاوت کے بجائے (جیسا کہ پہلے مصر اور عراق میں ہوا تھا) عوامی تحریک کے ذریعے ہوا، جس کی روح رواں شیعہ مذہبی جوش و جذبہ تھا۔ اس وقت سعودی عرب میں بیمار بادشاہ خالد اور ان کے سوتیلے بھائی ولی عہد فہد نے اس انقلاب کو قاہرہ اور بغداد میں پہلے سے وقوع پذیر بادشاہ مخالف بغاوتوں کے سلسلے کا ہی ایک حصہ سمجھ کر قبول کر لیا۔

سعودی عرب نے خمینی حکومت کو تسلیم کر لیا تھا۔ نائب وزیر اعظم، شہزادہ عبداللہ بن عبدالعزیز آل سعود نے ”گلف نیوز“ کو دیے گئے ایک انٹرویو میں کہا کہ قرآن پاک دونوں ممالک کا آئین ہے، اس لیے ان کے تعلقات اب مادی مفادات یا جغرافیائی سیاست کے تابع نہیں رہے۔ شاید سعودی قیادت نے اسلامی انقلاب ایران کے طویل المدتی نتائج کو کم اہمیت دی۔ انقلاب سے پہلے تہران اور تل ابیب (اسرائیل) کے درمیان قریبی تعلقات تھے۔ ایران اسرائیل کو تیل فراہم کرتا اور دونوں کے درمیان کئی تجارتی معاہدے موجود تھے۔ یہ سب 1979 کے انقلاب کے ساتھ ختم ہو گئے۔

اگرچہ اسلامی جمہوریہ ایران ایک مسلم ملک ہے، لیکن شیعہ مسلمان اور فارسی تہذیبی طور پر خود کو عربوں سے برتر سمجھتے ہیں۔ مزید برآں، اس مذہبی انقلاب نے مشرق وسطیٰ میں صدیوں پرانی سنی-شیعہ رقابت کو ایک بار پھر نمایاں کر دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سعودی عرب کے وہابی-سلفی نظریات کے حامل سنی مسلمان شیعہ مسلمانوں کو مرتد سمجھتے ہیں۔

دوسرا ہولناک واقعہ نومبر 1979 میں پیش آیا جب جوہیمان العتیبی، ایک سعودی جنگجو جس پر وہابی سلفیت کا گہرا اثر تھا، نے مسجد الحرام (مکہ) پر قبضہ کر لیا۔ وہ نجد کے ایک بااثر خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور سعودی افواج کا سابق اہلکار تھا۔ اس نے ایک گروہ تیار کیا اور انہیں مسجد الحرام پر قبضے اور پھر سعودی شاہی حکومت کے خاتمے کے لیے تربیت دی۔ اس نے اسلامی کیلنڈر کے پہلے مہینے، محرم کی پہلی تاریخ چنی، جب ہزاروں مومنین فجر کی نماز کے بعد خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہیں۔

حملہ آوروں کے مطابق، ”آل سعود کی حکومت اپنی کرپشن، بنود و نمائش، اور سعودی معاشرے کو مغربی طرز پر تبدیل کرنے کی جارحانہ پالیسی کی وجہ سے اسلامی اقدار سے منحرف ہو چکی تھی، اس لیے وہ اقتدار میں رہنے کی حقدار نہیں رہی۔“ جوہیمان العتیبی چودھویں صدی کے اسلام پسند عالم ابن تیمیہ (1263-1328) اور اٹھارہویں صدی کے مشہور عالم محمد بن عبدالوہاب (1703-1792) کے نظریات سے متاثر تھا۔ اپنے بلند دینی مقام کے سبب، عبدالوہاب نے ابن تیمیہ کے نظریات کی سرحدوں کو مزید وسعت دی۔ اس نے ابن تیمیہ کے کاموں پر گہری

تحقیق کی اور ان کے بنیادی عقائد کو اخذ کر کے اپنی ہم عصر مسلم سوسائٹی میں دوبارہ راسخ کرنے کی کوشش کی۔ عبدالوہاب کے زمانے میں جزیرہ نماعرب میں کوئی متحدہ ریاستی نظام موجود نہ تھا۔ اس کی پہلی ترجیح عرب مسلمانوں کو ان کے ”ابتدائی خالص پن“ میں واپس لانا تھا، اور اس مقصد کے لیے اس نے ابن تیمیہ کے نظریات کو نافذ کرنے کا عزم کیا۔

اس نے خطے کی مختلف بستیوں کے سرداروں سے بات چیت شروع کی۔ انہیں قائل کیا کہ معمولی اختلافات پر جھگڑنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا؛ بہتر یہ ہے کہ قرآن پاک اور سنت نبوی کی تعلیمات کی طرف رجوع کیا جائے اور انہیں تمام بستیوں کے لیے قابل قبول اور پُرکشش بنایا جائے۔ اس نے اپنی کتاب کتاب التوحید (توحید کی کتاب) میں ان تمام رائج انحرافات کو نمایاں کیا جنہیں وہ اسلام سے انحراف سمجھتا تھا۔ اس نے اولیاء اللہ کی قبور پر حاضری اور وہاں سے برکت لینے کے عمل کی سخت مخالفت کی۔ اس کے نزدیک بزرگان دین کا ادب و احترام بت پرستی کے مترادف تھا۔ اس نے صوفی ازم کی بھی شدید مخالفت کی، جو کہ اسلام کا ایک نرم، روادار اور کشادہ دل روپ ہے۔

1744 میں، عبدالوہاب نے نجد کے مرکزی علاقے درعیہ کے ایک بااثر سردار، ابن سعود سے ایک تاریخی معاہدہ کیا۔ یہ معاہدہ عبدالوہاب کے لیے اس کے نظریات کو قانونی حیثیت دلانے اور اسلام کی ایک انتہائی سخت گیر تعبیر کو فروغ دینے کے لیے فیصلہ کن ثابت ہوا۔ اس معاہدے کے بعد، جزیرہ نماعرب کی مختلف مسلم بستیاں اس خواب کی تعبیر کے لیے متحد ہو گئیں کہ وہ اسلام کے ابتدائی، خالص اور ”غیر فاسد“ دور کو واپس لائیں۔ اس تحریک کو سلفی اسلام کہا جاتا ہے۔ پہلی بار بڑے پیمانے پر، جزیرہ نماعرب کے مسلمانوں نے صوفی ازم کو حاشیے پر دھکیلنا شروع کر دیا ایک ایسا دینی نظریہ جو ہم آہنگی، تصوف اور دیگر مذاہب کے ساتھ رواداری کا علمبردار رہا ہے۔

1932 میں مملکت کے قیام کے بعد سے، سعودی شاہی خاندان وہابی علما کے ساتھ ہم آہنگی میں کام کر رہا تھا تاکہ اس نظریے کو منظم طریقے سے مختلف طبقات میں پھیلا یا جاسکے۔ تاہم، اصل تہذیبی 1938 میں مشرقی صوبے میں تیل کی دریافت سے آئی، جس کے بعد پیٹرول ڈالر کی

بھر مارنے سعودی حکومت کو مالی طور پر خود مختار بنادیا اور ان کے ہاتھ میں بے پناہ وسائل آ گئے۔ آل سعود کے افراد اور ان کے بعد آنے والے حکمران پُر تعیش زندگی گزارنے لگے، ان کے لیے عالی شان محلات اور تفریحی کشتیاں تعمیر کی گئیں یا خریدی گئیں۔ دوسری طرف، مذہبی طبقے کو مکمل آزادی حاصل تھی کہ وہ دنیا بھر میں مساجد، مدارس، اور اسلامی مراکز کو مالی اعانت فراہم کریں اور وہابی۔ سلفی طرز اسلام کو فروغ دیں، جس نے صوفی اسلام جیسے روادار اور ہم آہنگ نظریے کو حاشیہ پر دھکیل دیا۔

وہابی تعلیمات کی سخت گیر تشریحات، جنہیں دل کھول کر دی جانے والی مالی معاونت کے ساتھ پیش کیا گیا، نے مسلم دنیا میں بہت سے پیروکار پیدا کیے۔ سنی مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت اس بنیاد پر ستانہ نظریے اور شدت پسندی کے راستے کی جانب راغب ہوئی۔

تیسرا قیامت خیز واقعہ دسمبر 1979 کے مہینے میں پیش آیا، جب سوویت یونین نے افغانستان پر حملہ کیا۔ اس کے جواب میں، رونالڈ ریگن کی قیادت میں امریکی حکومت نے فیصلہ کیا کہ سوویت یونین کو شکست دینے کے لیے افغانستان میں اسلام پسندوں کو اسلحہ فراہم کیا جائے گا۔ یہ جنگ لڑنے والے گروہوں میں افغان مجاہدین، طالبان (جو پاکستانی مدارس کے نوجوان طالب علم تھے)، عرب و مسلم دنیا سے پاکستان آنے والے جہادی، اور کرائے کے فوجی شامل تھے۔ امریکی خفیہ ایجنسی سی آئی اے نے پاکستانی خفیہ ادارے آئی ایس آئی کے ذریعے جہادی گروہوں کو بے تحاشہ فنڈز فراہم کیے تاکہ اسلام پسندوں کے ذریعے سوویت یونین کو کمزور کیا جاسکے۔

یہ امریکی منصوبہ آپریشن سائیکلون کہلایا، جو سی آئی اے کی تاریخ کا سب سے طویل اور مہنگا خفیہ منصوبہ تھا۔ 1987 میں اس کی مالی اعانت بڑھ کر سالانہ 630 ملین امریکی ڈالر ہو گئی۔ پاکستانی حکومت کو افغان مزاحمتی گروہوں کی تربیت اور اسلحہ فراہمی کے لیے 20 ارب ڈالر سے زائد کی امداد ملی۔ یہ حمایت مجاہدین کی سوویت یونین کے خلاف مزاحمت کے لیے انتہائی اہم ثابت ہوئی۔ اس دوران، وہابی۔ سلفی نظریے کے پُر جوش حامی عرب رضا کار بڑی تعداد میں پاکستان پہنچے تاکہ امدادی گروپ بنائیں۔ خود سعودی عرب کی قیادت نے بھی اس مقصد کے لیے

لاکھوں ڈالر فراہم کیے۔

سعودی عرب کے مشہور اور نہایت دولت مند بن لادن خاندان کے وارث، اسامہ بن لادن، اپنے عرب ساتھیوں کے ایک بڑے گروہ کے ساتھ پاکستان پہنچے۔ جلد ہی یمن اور شام سے بھی جہادی رضا کار اس 'مقدس جنگ' میں شامل ہو گئے۔ امریکی ساختہ اسٹنگر اینٹی ایئر کرافٹ میزائل اور دیگر ہلکا اسلحہ پاکستانی آئی ایس آئی کے ذریعے ان جنگجوؤں میں تقسیم کیا گیا۔ پاکستانی فوج کے کرپٹ جنرلوں نے امریکی امداد کا بڑا حصہ ہڑپ لیا اور اسلحہ، بشمول اسٹنگر میزائل اور اے کے-47 رائفلیں، کراچی، کوئٹہ اور پشاور کی کھلی منڈیوں میں فروخت کر دی۔ سوویت حملے کے نتیجے میں تقریباً 40 لاکھ عام افغان باشندے بے گھر ہو گئے، جن میں سے بیشتر نے پاکستان کی سرحد عبور کی۔ یہ لوگ ڈیورنڈ لائن (افغانستان اور پاکستان کی سرحد) کے ساتھ پھیلے ہوئے مہاجر کیمپوں میں آباد ہو گئے۔ ان کے بچوں، خاص طور پر لڑکوں، کو ہزاروں مدارس میں داخل کرایا گیا، جنہیں سعودی عرب کے وہابی-سلفی اداروں کی مالی امداد حاصل تھی۔ ان مدارس میں عموماً صوفی اسلام اور شیعہ مذہب کے خلاف نفرت پر مبنی تعلیم دی جاتی تھی۔ امریکہ کی جانب سے مجاہدین کی حمایت کے اس فیصلے کا ایک اہم ضمنی نتیجہ یہ نکلا کہ ایک نئی نسل کے طالب علم (طالبان) تیار ہونے لگے، جنہیں بچپن سے ہی خود کش حملوں سمیت 'عظیم قربانی' کے اسلامی جواز اور فوائد سکھائے جاتے تھے۔

ان مدارس سے فارغ التحصیل طلبہ کو انتہا پسند اسلام کے پھیلاؤ کے لیے نہ صرف نظریاتی طور پر بلکہ عملی طور پر بھی تیار کیا گیا تھا۔ جب سوویت یونین نے 1989 میں افغانستان سے نکلنے کا فیصلہ کیا، تو طاقت کا خلا پیدا ہو گیا جسے مختلف وائلارڈز (جنگی سرداروں) کے گروہوں نے پُر کرنے کی کوشش کی۔ اس سے ایک ہولناک خانہ جنگی شروع ہوئی جس نے افغانستان کے دیہی علاقوں کو مکمل طور پر تباہ کر دیا۔ پاکستان کے سکیورٹی اداروں نے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے افغانستان میں اپنے اثر و رسوخ کو بڑھانے کی حکمت عملی اختیار کی، جسے انہوں نے 'اسٹریٹجک ڈپتھ' (حکمت عملی کی گہرائی) کا نام دیا۔ ان کے خیال میں بھارت کے مشرقی بارڈر سے دباؤ کی

صورت میں یہ ایک فیصلہ کن پالیسی ثابت ہو سکتی تھی۔ ابتدائی فوجی تربیت کے بعد، پاکستانی اسٹیبلشمنٹ نے افغان طالبان کو ان کے مدارس سے نکال کر اسلحے اور ٹینکوں سے لیس کیا۔ دوست ملک سعودی عرب نے انہیں پک اپ ٹرک خریدنے کے لیے مالی امداد فراہم کی۔

پاکستانی فوج کی پشت پناہی میں ایک نئی طالبان فوج نے افغانستان میں داخل ہو کر جنگجو وار لارڈز کو پکچل دیا اور ایک سخت شریعت پر مبنی طالبان حکومت قائم کی۔ یہ وہی ماڈل تھا جو چودہویں صدی کے اسلامی اسکالر ابن تیمیہ نے پیش کیا تھا، اور جسے بعد ازاں 1744 میں ابن عبد الوہاب نے سعودی عرب میں ابن سعود کے ساتھ معاہدہ کر کے زندہ کیا اور ادارہ جاتی شکل دی۔ پاکستان اور سعودی عرب دونوں نے ملا عمر کی حکومت کو افغانستان کی جائز حکومت کے طور پر تسلیم کر لیا۔ امریکی خفیہ ادارے بھی اس بنیاد پرست کردار رکھنے والے ناکام ریاست کو تسلیم کرنے میں شریک جرم تھے، بغیر اس کے کہ وہ اس کے طویل مدتی نتائج کو سمجھ پاتے۔ جلد ہی کابل حکومت نے شریعت نافذ کر دی۔ تمام خواتین کو سخت پردے کا پابند بنایا گیا، خواتین کی تعلیم پر پابندی عائد کر دی گئی اور انہیں پورے افغانستان میں سرکاری ملازمتوں سے نکال دیا گیا۔

جب طالبان کی قیادت میں حکومت قائم ہو گئی، تو امریکی انتظامیہ نے افغانستان کے اس منصوبے کو تکمیل شدہ مشن قرار دے دیا اور ایسا رویہ اختیار کیا جیسے ان کا اس ملک سے اب کوئی تعلق نہ ہو، حالانکہ یہ وہی ملک تھا جس میں انہوں نے اربوں ڈالر خرچ کر کے ایک انتہائی بنیاد پرست جہادی گروہ کو مسلح کیا تھا۔

امریکی انٹیلی جنس یا انتظامیہ کا ہمیشہ یہ وطر رہا ہے کہ وہ کسی بھی عسکری مداخلت کے بعد کوئی حکمت عملی ترتیب نہیں دیتے۔ برسوں بعد یہی غلطی انہوں نے عراق پر حملے کے بعد دہرائی، جب وہ بغیر کسی مابعد حکمرانی منصوبے کے عراق کو چھوڑ گئے۔ اس کا نتیجہ تباہ کن نکلا، کیونکہ ایک مکمل فرقہ وارانہ جنگ چھڑ گئی، جس نے بالآخر داعش (ISIS) کی بنیاد رکھنے میں مدد دی، اور دنیا نے وہابی-سلفی نظریے کے پیروکاروں کے ہاتھوں دوسری عالمی جہادی دہشت گردی کی لہر کا مشاہدہ کیا۔

وہابی-سلفی عقیدہ اسلام

1980 اور 1990 کی دہائیاں وہ اہم زمانے تھے جب سعودی عرب نے وہابی-سلفی اسلام کے ورژن کو جارجا حانہ انداز میں فروغ دینا شروع کیا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے عالمی سطح پر اسلامی مراکز (اتوار مدارس)، مساجد اور نجی اسکولز کو مالی امداد فراہم کی، خاص طور پر امریکہ اور بیشتر یورپی ممالک جیسے برطانیہ، بیلجیم، اسپین، فرانس اور جرمنی میں۔ اس عالمی مہم نے سرکاری سطح پر ان نوجوان مسلمانوں کو بنیاد پرستی کی طرف مائل کیا جو وہابی اسکولز اور پیشہ ورانہ کالجوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، اور ان کے لیے قرآن اور احادیث کا وہابی ترجمہ انگریزی زبان میں استعمال کیا گیا۔ سعودی عرب سے اسلامی پروفیسرز کو مختلف یونیورسٹیوں میں مسلم طلبہ سے خطاب کے لیے بلا یا گیا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب امریکی انتظامیہ کے قومی سلامتی کے ادارے سعودی عرب کی طرف سے امریکہ میں وہابی-سلفی نظریے کو فروغ دینے کی سرگرمیوں کی حمایت کر رہے تھے، بغیر اس کے کہ وہ اسلام کی تاریخ یا اس عمل کے اثرات کو سمجھتے۔

افغانستان میں طالبان کی قیادت میں قائم حکومت نے ایک وقت میں دنیا بھر سے آئے ہوئے 100000 سے زائد شدت پسندوں کو پناہ دی، جن کی قیادت اسامہ بن لادن کر رہا تھا، جو وقت کے ساتھ ساتھ ایک انتہائی طاقتور شخصیت بن گیا۔ اس نے پورے افغانستان میں تربیتی مراکز قائم کیے۔ امریکہ نے جب افغانستان کی جنگ کے دوران اربوں ڈالر اور جدید اسلحہ جہادی گروہوں کو فراہم کیا تو ایک 'Frankenstein' تخلیق کیا۔ القاعدہ، اسامہ بن لادن کی قیادت میں، ملا عمر کی حکومت کے تحت محفوظ پناہ گاہوں سے مستفید ہوئی اور امریکہ و یورپی ممالک سے تعلیم یافتہ پیشہ ور افراد اور شدت پسندوں کی بھرتی شروع کر دی۔ پاکستانی خفیہ ادارہ آئی ایس آئی القاعدہ کے ان مذموم عزائم کی بھرپور مدد کر رہا تھا، کیونکہ وہ افغانستان پر بالواسطہ قبضہ کرنے اور بھارت کو کشمیر میں زخمی کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اُس وقت کے پاکستانی صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے ملک میں وہابی نصاب متعارف کرایا، مدارس میں اس کی تعلیم عام کی اور مساجد میں سلفی اصلاحات نافذ کیں، تاکہ صوفی اسلام کو منظم طریقے سے پس منظر میں دھکیل دیا جائے۔

مقبوضہ کشمیر میں، جہادیوں کو لائن آف کنٹرول (LoC) عبور کر کے بھیجا گیا تاکہ کشمیر کے سماجی و ثقافتی تانے بانے کو نقصان پہنچایا جاسکے۔ متعدد ہندو کشمیری پنڈت قتل کر دیے گئے یا وادی سے جبراً

ہجرت پر مجبور کیے گئے، جبکہ صوفی اولیاء کے مزار، جہاں معتدل صوفی مسلمان عبادت کرتے تھے، بم دھماکوں کا نشانہ بنے۔ امریکہ میں خارجہ پالیسی کی خفیہ سازشوں میں کردار ادا کرنے والی بائرنکولسل آن فارن ریلیشنز (CFR) نے اس بات کی تصدیق کی کہ دہشت گرد تنظیمیں لشکر طیبہ اور جیش محمد پاکستانی آئی ایس آئی نے CIA کی خاموش منظوری سے کشمیر میں خونریزی کے لیے قائم کیں۔

جہادی سیاحت میں اچانک تیزی آئی، خاص طور پر کراچی اور پشاور ہوائی اڈوں پر، جو شدت پسندوں کے لیے بین الاقوامی عبوری مراکز کے طور پر استعمال ہونے لگے۔ یہ شدت پسند کابل اور قندھار جاتے تاکہ اسامہ بن لادن اور اس کے قریبی مشیروں کے خطابات سن سکیں۔ القاعدہ کے سینئر آپریشنرز باقاعدہ طور پر خفیہ اور منظم طریقے سے دنیا بھر میں حملے کرنے کے لیے منصوبہ بندی کے اجلاس منعقد کرتے تھے۔ ان اجلاسوں میں شرکت کرنے والے براہ راست کراچی یا پشاور نہیں آتے تھے، بلکہ پیچیدہ راستے اختیار کرتے، مثلاً پہلے فرینکفرٹ سے بیکناک جاتے، پھر کراچی پہنچتے، اور وہاں سے سڑک کے ذریعے قندھار یا کابل لے جاتے۔

کوسوو و لبریشن آرمی (KLA) بھی القاعدہ کے ساتھ گٹھ جوڑ میں تھی۔ منشیات کی اسمگلنگ ایک اور کاروبار تھا جس میں القاعدہ پوری طرح ملوث تھی۔ وہ منشیات دنیا بھر میں بھارت اور کوسوو کے راستے پہنچاتی۔ آئی ایس آئی نے خفیہ طور پر پاکستان اور افغانستان میں کام کرنے والے سی آئی اے کے اہلکاروں پر نظر رکھی اور اسامہ بن لادن کو حساس معلومات فراہم کیں، جبکہ سی آئی اے کو بن لادن کی پناہ گاہوں اور القاعدہ کے تربیتی مراکز کے بارے میں معلومات نہیں دی گئیں۔ آئی ایس آئی اکثر سی آئی اے کو جعلی معلومات فراہم کر کے انہیں گمراہ کرتی رہی۔ وقت کے ساتھ، آئی ایس آئی اس پورے معاملے میں سب سے بڑا فائدہ اٹھانے والا ادارہ بن کر ابھری، چاہے وہ مالی فائدے ہوں یا عسکری، اور اس نے جہادیوں کو اسلحہ دے کر مضبوط کیا۔ پاکستانی عسکری اسٹیبلشمنٹ، جس کی قیادت آئی ایس آئی کر رہی تھی، نے بن لادن اور اس کے ساتھیوں کو مکمل تحفظ فراہم کیا، اور کشمیر میں جہادی سرگرمیوں کو دو گنا کر دیا تاکہ کشمیر کو تقریباً ایک آزاد ریاست کی حیثیت دی جاسکے۔ بالآخر، افغانستان۔ پاکستان کے اس جہادی منظر نامے

میں امریکی ایجنسیاں مؤثر کردار سے باہر ہو گئیں۔

پہلی خلیجی جنگ

اگست 1990 میں، صدام حسین نے کویت پر چڑھائی کردی اور اپنی افواج کو ہمسایہ ریاست میں داخل کر دیا۔ صدر جارج ایچ ڈبلیو بش نے اسے مشرق وسطیٰ میں امریکی مفادات کے لیے خطرہ سمجھا اور اقوام متحدہ اور یورپی ممالک کو شامل کر کے ایک عالمی اتحاد قائم کیا تاکہ کویت کو عراقی افواج سے آزاد کرایا جاسکے۔ اس فوجی کارروائی کو ”آپریشن ڈیزرٹ اسٹورم“ کا نام دیا گیا، اور امریکی کمان کے تحت افواج نے سعودی عرب میں اتر کر عراق پر زمینی اور فضائی حملے شروع کیے تاکہ کویت کو آزاد کرایا جاسکے۔ جنوری 1991 میں یہ کارروائی شروع ہوئی اور عراقی افواج کو کویت سے نکال باہر کیا گیا۔ پوری کارروائی صرف تین دن میں مکمل ہو گئی۔

تاہم، سعودی عرب میں امریکی افواج کی موجودگی اور ایک عرب ملک پر حملہ، اسامہ بن لادن اور اس کی انتہا پسند تنظیم کو ناگوار گزررا۔ وہابی سلفی عقیدے کا پیروکار بن لادن غیر مسلموں کو کافر سمجھتا تھا، اور مقدس سرزمین پر امریکی افواج کی موجودگی کو توہین سمجھتا تھا۔ اس کی امریکہ کے خلاف ناراضی مزید بڑھ گئی، باوجود اس کے کہ افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف جنگ کے دوران اُسے امریکی فوجی مشیروں سے امداد ملی تھی۔ سی آئی اے نے امریکی ڈالر کے ذریعے تمام جہادی گروپوں، بشمول القاعدہ، کو اسلحہ خریدنے اور عرب جنگجوؤں کو مسلح کرنے کے لیے مالی مدد فراہم کی تھی۔

فلسطین کا سگلتا ہوا مسئلہ اور اسرائیلی قبضوں کے لیے امریکہ کی کھلی حمایت اکثر اس کے ذہن میں آتی رہتی تھی، جس سے وہ امریکہ کے بارے میں مزید بے چین اور ناراض ہوتا گیا۔ اس دوران، 1990 کی دہائی کے اوائل میں، امریکہ نے صومالیہ میں بھی مداخلت کی تاکہ بظاہر وہاں کے مقامی ملیشیاؤں کے درمیان لڑائی ختم کر کے ”نظم و ضبط“ قائم کیا جاسکے۔

جہادی ہیرو کے طور پر اسامہ کا عروج

1995-96 تک، اسامہ بن لادن عالمی سطح پر ایک جہادی ہیرو کے طور پر مقبول ہو چکا تھا، اور جلد ہی وہ بین الاقوامی میڈیا کی نگاہ کا مرکز بن گیا۔ اس کی شخصیت کو عالمی سطح پر ایک برانڈ کی صورت میں پیش کیا گیا، اور جنوبی ایشیا سمیت دنیا بھر کے مسلمان نوجوان اسے اپنا رول ماڈل اور متاثر کن شخصیت تصور کرنے لگے۔ وہ بار بار اپنی قریبی ٹیم کے ساتھ یہ بات زیر بحث لاتا رہا کہ امریکیوں اور ان کی 'شیطانہ سلطنت' کو کس طرح سزا دی جائے۔ وہ امریکی فوجی طاقت سے بخوبی واقف تھا اور اس سے براہ راست ٹکر لینے کی غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے امریکی مفادات کو عرب خطے میں نشانہ بنانے اور ان کے رد عمل کو جانچنے کی ایک انوکھی حکمت عملی تیار کی۔ اس نے ایک خود کش حملے کا منصوبہ بنایا، جس میں دھماکہ خیز مواد سے بھری ہوئی کار کو سعودی عرب کے شہر الخبر میں واقع امریکی فضائیہ کے رہائشی کمپلیکس سے ٹکرا دیا گیا۔ یہ حملہ 25 جون 1996 کو ہوا، جس میں 19 سے زائد امریکی فوجی ہلاک ہوئے۔ اس حملے نے سعودی شاہی خاندان کو یہ سخت پیغام دیا کہ مقدس سرزمین پر غیر ملکی افواج برداشت نہیں کی جائیں گی۔

امریکی انٹیلیجنس ایجنسیوں، جیسے کہ سی آئی اے اور ایف بی آئی، کو شبہ ہونے لگا کہ الخبر ٹاور حملے میں اسامہ بن لادن اور اس کی تنظیم القاعدہ ملوث ہے۔ اسی دوران امریکی ایجنسیاں اس حقیقت سے آگاہ ہو رہی تھیں کہ سوویت یونین کو افغانستان سے نکالنے کے لیے بنائی گئی جہادی تنظیم القاعدہ، جسے 'دی بیس' بھی کہا جاتا تھا، نہ صرف اب بھی موجود ہے بلکہ بہت تیزی سے پھیل چکی ہے۔ اس وقت تک امریکی انٹیلیجنس کو آئی ایس آئی کی جانب سے القاعدہ کی قوت کے بارے میں مسلسل گمراہ کیا جا رہا تھا۔

افغان جہاد کے بعد، اسامہ بن لادن کو کبھی کابل اور کبھی سوڈان کے دار الحکومت خرطوم میں دیکھا گیا۔ اس نے سوڈان میں تعمیراتی کاروبار شروع کیا، جس کا مقصد سڑکیں تعمیر کرنا تھا۔ 1993 میں، نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی بیسمنٹ میں ایک کم شدت کا بم دھماکہ ہوا۔ امریکی حکومت نے سوڈانی حکومت پر اسامہ کو ملک بدر کرنے کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ 1996

میں، وہ دوسو پیر و کاروں کے ساتھ ایک چارٹرڈ طیارے میں کابل پہنچا، جہاں پاکستانی حمایت یافتہ طالبان حکومت نے اسے ایک خصوصی مہمان کا درجہ دیا۔

اسامہ نے جلد ہی وہاں بے پناہ اثر و رسوخ حاصل کر لیا، اور طالبان کے امیر، ملا عمر، اسے اپنا روحانی رہنما سمجھنے لگے۔ امریکی حکومت نے سعودی عرب پر بھی دباؤ ڈالا کہ وہ اسامہ کو امریکہ کے حوالے کرے، لیکن طالبان حکومت نے اس کی سخت مزاحمت کی۔ 1998 میں، اسامہ نے امریکیوں کے خلاف ایک فتویٰ جاری کیا، جس میں سعودی حکومت کو گرانے کی اپیل کی گئی۔ اسی سال، القاعدہ نے کینیڈا کے شہر نیروبی اور تنزانیہ میں واقع امریکی سفارت خانوں پر بیک وقت حملے کیے، جن میں دوسو سے زائد افراد ہلاک اور تقریباً دس ہزار زخمی ہوئے۔ پہلی بار، امریکی عوام اور میڈیا خواہ پر نہٹ ہو یا الیکٹرانک نے القاعدہ اور اس کے رہنماؤں، اسامہ بن لادن اور ایمن الظواہری، سے پیدا ہونے والے غیر معمولی خطرے کو سنجیدگی سے محسوس کیا۔

امریکی انٹیلیجنس ایجنسیاں مکمل طور پر بیدار ہو گئیں کہ افریقہ میں ان کے سفارت خانوں پر ہونے والے حملوں کے پیچھے القاعدہ اور اسامہ بن لادن کا ہاتھ تھا۔ اصل مسئلہ خود اسامہ بن لادن کی ذات تھی۔ صدر بل کلنٹن نے افغانستان میں بن لادن کے زیر انتظام تربیتی کیمپوں پر جوابی حملے کا حکم دیا۔ امریکی فوج نے 70 کروڑ میزائل داغے۔ ہدف تو نشانہ بنے، مگر بن لادن اور القاعدہ کے تمام اعلیٰ رہنما محفوظ رہے کیونکہ آئی ایس آئی نے انہیں پیشگی اطلاع دے دی تھی۔

بن لادن کے قریبی گروہ نے اس وقت امریکہ کے پیسے، طاقت اور جمہوریت کی علامتوں پر ایک شاندار حملے کی تیاری شروع کر دی تھی۔ اسی دوران خالد شیخ محمد، جو امریکہ کی ایک یونیورسٹی سے زرعی سائنس میں ڈگری لے چکا تھا، بن لادن کے سامنے کچھ حیرت انگیز خیالات لے کر آیا۔ ایک اجلاس میں اس نے تجویز دی کہ امریکہ کے مشرقی اور مغربی ساحلوں سے مسافر طیارے ہائی جیک کر کے انہیں امریکہ کی مشہور عمارتوں سے ٹکرا دیا جائے۔ بن لادن نے ابتدا میں اسے مسترد کرتے ہوئے کہا کہ یہ منصوبہ بہت بڑا ہے اور اس میں کئی لوگ شامل ہوں گے، اس لیے راز فاش ہونے کا خطرہ ہے۔ تاہم بعد میں اس نے یہی منصوبہ اختیار کیا اور مخصوص

اہداف چُن کر ان پر ہوائی جہازوں سے حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

اوائل 1999 میں، بن لادن نے خالد شیخ محمد کو قندھار بلایا اور منصوبے پر عملدرآمد کی اجازت دی۔ ایک اور اجلاس میں امریکی ایٹمی تخصیبات کو نشانہ بنانے کی تجویز بھی سامنے آئی، لیکن اس خیال کو رد کر دیا گیا کیونکہ اس سے امریکی مسلمانوں کی بڑی تعداد متاثر ہو سکتی تھی۔ حنالد نے پاکستان میں ایک محفوظ مقام سے منصوبے پر کام شروع کیا، جہاں وہ آئی ایس آئی کی نگرانی میں تھا۔ اس نے مالی وسائل اور دیگر لوجسٹک امور کو ترتیب دیا۔

حملہ آوروں کے چناؤ کا کام جرمنی کے شہر ہیمبرگ کی مسجد القدس کے امام فزازی کو سونپا گیا۔ اس مسجد میں آنے والے محمد عطا کو قیادت سونپی گئی، جو 1992 میں ارب بن پلاننگ کی تعلیم کے لیے جرمنی آیا تھا۔ امام فزازی وہابی سلفی نظریات کا سخت حامی تھا اور اس نے ایسے سعودی نوجوانوں کی نشاندہی کی جو نظریاتی طور پر انتہا پسند اور تعلیمی طور پر قابل تھے۔ انہیں پہلے ہیمبرگ اور بعد ازاں افغانستان بھیجا گیا تاکہ وہ بن لادن سے تربیت حاصل کریں۔

بن لادن نے ان کی تربیت میں خود حصہ لیا، انہیں لیکچرز، ویڈیوز اور دیگر ذرائع سے ذہنی طور پر تیار کیا گیا۔ امریکی مظالم کی ویڈیوز دکھا کر ان کے جذبات بھڑکائے گئے۔ قندھار کے تربیتی کیمپ میں بن لادن نے اصرار کیا کہ تمام حملہ آور سعودی شہری ہوں تاکہ انہیں امریکہ کے ویزے حاصل کرنے میں آسانی ہو۔ انہیں فلوریڈا کے فلائنگ اسکول میں داخلہ لینے کی ہدایت دی گئی تاکہ وہ کمرشل پائلٹ کا لائسنس حاصل کر سکیں۔ رقوم دہی اور بٹاک کے مینسکوں کے ذریعے امریکہ منتقل کی گئیں۔

11 ستمبر 2001 کو، دنیا لرز کر رہ گئی، جب اسے اندازہ ہوا کہ افریقی ممالک میں امریکی سفارت خانوں پر ہونے والے حملے صرف ایک پیش خیمہ تھے۔ اس دن، 19 سعودی القاعدہ کے حملہ آوروں نے امریکی ہوائی اڈوں کی سکیورٹی کی خامیوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے حپار طیارے ہائی جیک کیے۔ دو طیارے نیو یارک کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر سے ٹکرا دیے گئے، ایک طیارہ پینٹاگون کے قریب ورجینیا میں گرا، جبکہ چوتھا طیارہ، جو کینیڈا کی طرف جا رہا تھا، پنسلوانیا

میں مار گرایا گیا۔ اس واقعے میں 6000 افراد ہلاک اور 10000 سے زائد زخمی ہوئے۔ تاریخ میں پہلی بار، غیر ریاستی عناصر نے امریکی طاقت کی علامتوں پر ایسی کاری ضرب لگائی۔

نائن الیون کے بعد امریکہ کا رد عمل

20 ستمبر 2001 کو صدر جارج ڈبلیو بش نے امریکی کانگریس کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کیا۔ نائن الیون حملوں کے بعد پہلا خطاب تھا، جس نے اسلامی دہشت گردی کے خلاف امریکہ کا ایجنڈا متعین کیا۔ بد قسمتی سے یہ خطاب وہابی۔ سلفی عقیدے کی واضح شناخت کرنے میں ناکام رہا، جو 1979 سے سعودی عرب کی جانب سے کھلم کھلا پھیلا یا جا رہا تھا۔ یہی وہ سال بھی تھا جب مکہ مکرمہ کی عظیم مسجد پروہابی۔ سلفی شدت پسندوں کے ایک گروہ نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس سے پہلے بھی کئی امریکی اسکالرز نے اس پر تشویش ظاہر کی تھی کہ سعودی عرب نے وہابی۔ سلفی اسلام کی شکل میں ایک ایسا خطرناک نظریہ آزاد کیا ہے جو مسلمانوں کو دیگر مذاہب سے نفرت سکھاتا ہے اور بے گناہ انسانوں کے قتل کو جائز قرار دیتا ہے۔

اپنے خطاب میں صدر بش نے دنیا بھر کے مسلمانوں سے براہ راست مخاطب ہو کر کہا:

”ہم آپ کے دین کا احترام کرتے ہیں۔ لاکھوں امریکی اور امریکہ کے دوست ممالک میں کروڑوں افراد آزادی سے اس مذہب پر عمل کرتے ہیں۔ اس کے اصول اچھے اور پرامن ہیں، اور جو لوگ اللہ کے نام پر برائی کرتے ہیں وہ اللہ کے نام کی توہین کرتے ہیں۔ دہشت گرد اپنے ہی مذہب سے غداری کر رہے ہیں، اور حقیقت میں اسلام کو ہائی جیک کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ امریکہ کا دشمن ہمارے بے شمار مسلم دوست نہیں ہیں، نہ ہی ہمارے بے شمار عرب دوست۔ ہمارا دشمن دہشت گردوں کا ایک انتہا پسند نیٹ ورک ہے۔“

امریکی اسلامی اسکالرز اور سیکورٹی ماہرین نے پہلے ہی صحرائی اسلام یا وہابی۔ سلفی عقیدے پر اپنی تشویش ظاہر کی تھی، جسے سعودی عرب نے نائن الیون سے کئی دہائیاں قبل سے دنیا بھر میں پھیلا نا شروع کر دیا تھا۔ یہ کوئی راکٹ سائنس نہیں کہ یہ انتہا پسند دہشت گرد نیٹ ورک اسی سخت

گیروہابی۔ سلفی نظریے کے پیروکار ہیں، جو دیگر مذاہب کے خلاف نفرت اور شدت پسندی کو فروغ دیتا ہے۔ خود امریکہ کا قریبی اتحادی، سعودی عرب، مسجد الحرام کے واقعے کے بعد، اور سلفیوں اور سعودی شاہی خاندان کے درمیان معاہدے کے تحت، اسی انتہا پسند اسلام کو دنیا بھر میں پھیلانے میں ملوث رہا۔ وسیع تر اسلامی دنیا، جو صوفی سنی روایتوں پر یقین رکھتی ہے، یہ چاہتی تھی کہ صدر لبش اپنے خطاب میں واضح طور پر کہتے کہ جو بھی ملک شدت پسند، جہادی وہابی۔ سلفی نظریے کو پھیلاتا ہے، وہ امریکہ کا دشمن ہے۔ ایک خود مختار ملک کی حیثیت سے امریکہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے ملک میں وہابی۔ سلفی نظریے پر مبنی اسلامی طرزِ عمل پر پابندی عائد کرے، جیسا کہ مراکش کی اسلامی حکومت نے کیا ہے۔

9/11 کمیشن رپورٹ کے صفحہ 373 پر درج ہے:

”بہت سے امریکی سعودی عرب کو ایک دشمن کے طور پر دیکھتے ہیں، نہ کہ ایک گھیرے ہوئے اتحادی کے طور پر۔ ان کی نظر میں یہ ایک آمرانہ حکومت ہے جو عورتوں پر ظلم کرتی ہے، اور جس پر امیر اور سست اشرافیہ کا قبضہ ہے۔ سعودی حکام کے امریکی سیاستدانوں سے روابط اکثر سیاسی الزامات میں استعمال ہوتے ہیں۔ امریکی عوام اکثر ان کے تعلیمی اداروں اور مساجد میں پڑھائے اور سنائے جانے والے عدم برداشت، یہود دشمنی اور امریکہ مخالف خیالات سے شدید نالاں ہوتے ہیں۔“

7 اکتوبر 2001 کو، امریکہ نے جو ابی کارروائی کرتے ہوئے آپریشن اینڈورنگ فریڈم (Operation Enduring Freedom) کا آغاز کیا، جو افغانستان میں طالبان حکومت کے خلاف امریکی قیادت میں ایک بین الاقوامی کارروائی تھی۔ القاعدہ کے تربیتی کیمپوں پر مسلسل فضائی بمباری کی گئی۔ شمالی اتحاد کی افواج، جو ملا عمر کی طالبان حکومت کے مخالف تھے، کو کاہل پر قبضے کے لیے آگے بڑھنے کی ترغیب دی گئی۔

اس آپریشن میں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں طالبان جنگجو مارے گئے۔ ان میں سے کئی پاکستان کی طرف فرار ہو گئے۔ ایک بار پھر آئی ایس آئی نے مشکوک کردار ادا کیا، اور القاعدہ کے

سینئر رہنماؤں، بشمول اسامہ بن لادن اور ایمن الظواہری، کو پاکستان میں محفوظ پناہ گاہیں فراہم کیں۔ آئی ایس آئی نے سی آئی اے کو گمراہ کرتے ہوئے کہا کہ القاعدہ کی قیادت تو رابورا کے پہاڑوں میں منتقل ہو چکی ہے اور انہیں تلاش کرنا آسان نہیں ہوگا۔

حقیقت یہ تھی کہ انہیں پاکستان کے شہر ایبٹ آباد کے قریب وسیع وعریض بنگلوں میں رکھا گیا تھا، جہاں وہ اپنے بڑے خاندانوں کے ساتھ ہر طرح کی مادی آسائشوں میں رہ رہے تھے۔

نائن الیون کے بعد، بن لادن کی پشت پناہی یافتہ دہشت گردی نے دنیا بھر، خاص طور پر مغربی اور مسلم معاشروں میں، مختلف شکلوں میں جنم لیا۔ ان دہشت گردوں نے تمام بڑے مذاہب جیسے کہ عیسائیت، ہندومت اور یہودیت کے ساتھ براہ راست تصادم کیا۔ خود مسلم معاشرے کے اندر بھی ایک جنگ شروع ہو گئی، جس کا ہدف صوفی روایت اور اس کی علامتیں، جیسے بزرگانِ دین کے مزارات، بنے۔ سعودی عرب کے مذہبی اداروں نے، بھاری مالی وسائل کے ساتھ، دنیا بھر میں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں مساجد تعمیر کیں، اور ان مساجد میں قرآنی آیات اور احادیث کی وہابی تشریحات کو فروغ دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں ایک سخت گیر اسلامی نظریے کا غیر معمولی پھیلاؤ دیکھنے کو ملا، جو مغربی، ایشیائی اور افریقی مسلم کمیونٹیز میں بھی سراپت کر گیا۔ یہاں تک کہ وہابی اسلام کی جانب سے مرد و خواتین کے لیے متعین کردہ لباس بھی دنیا کے بڑے شہروں میں نمایاں طور پر دکھائی دینے لگا۔ انٹرنیٹ یا محلوں کی مساجد کے ذریعے شدت پسندی کی طرف مائل ہونے والے نوجوانوں کے الگ تھلگ حملے، جنہیں ’لون وولوز‘ (تنہا بھیڑیے) کہا جاتا ہے، آج بھی عالمی برادری کے لیے تشویش کا باعث ہیں۔ ایسی وارداتیں امریکہ، فرانس، جرمنی، انگلینڈ، بھارت، مراکش، انڈونیشیا اور مصر سمیت دنیا کے کئی ممالک سے رپورٹ ہوتی رہی ہیں..... اور یہ فہرست بہت طویل ہے۔

دوسری خلیجی جنگ

سنہ 2003 میں، امریکہ نے عراق پر پوری فوجی طاقت کے ساتھ حملہ کیا۔ اس کارروائی کو دوسری خلیجی جنگ کہا جاتا ہے، جس کا جواز صدام حسین کی جانب سے تباہ کن ہتھیاروں کی تیاری کو

بنایا گیا۔ اس جنگ کا اصل مقصد ایک سفاک حکمران کا تختہ الٹ کر نظام حکومت کی تبدیلی لانا تھا جو کہ امریکی سلامتی کے اداروں کا محبوب نعرہ بن چکا تھا۔ امریکہ اس مہم میں کامیاب رہا: صدام حسین کو اقتدار سے بے دخل کیا گیا اور شیعہ اکثریتی آبادی کو سیاسی طاقت دی گئی۔ تاہم، اس کے ساتھ ہی اسلامی تاریخ میں سب سے بدترین فرقہ وارانہ تقسیم کا آغاز بھی ہوا۔ تقریباً ایک دہائی تک، عراق ایک ایسی تجربہ گاہ بن گیا جہاں دہشت گرد اپنی جنگی تکنیکوں کو نکھار کر انہیں دنیا بھر میں پھیلا نے لگے۔

عراق میں جن دہشت گردی کی تکنیکوں کو فروغ ملا، ان میں خودکش حملوں کی مہم، جہادی پراپیگنڈہ پر مبنی ویڈیوز، ویب سائٹس، اور بم سازی کے طریقے شامل تھے۔ 2003 سے 2005 کے درمیان، عراق میں خودکش حملوں کی شدت اور رفتار میں اضافہ ہوا، اور پھر انہی طریقوں کو افغانستان اور پاکستان میں بھی استعمال کیا گیا۔ عراق وہ مقام بن گیا جہاں کار بم دھماکے اور VBIEDs (گاڑیوں میں نصب دیسی ساختہ دھماکہ خیز آلات) کے استعمال کو مکمل پختگی حاصل ہوئی۔

جب داعش نے عراق اور اس سے ملحقہ شام میں دہشت گرد سرگرمیوں پر قبضہ حاصل کیا، تو گاڑیوں سے کیے جانے والے حملوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ 2004 میں القاعدہ عراق کا مقصد امریکی و مغربی قبضے کو ہٹا کر وہابی سنی اسلامی حکومت قائم کرنا تھا۔ اس گروہ کا پہلا لیڈر ابو مصعب الزرقاوی تھا، جو اسامہ بن لادن کا قریبی پیروکار تھا۔ اس میں ظلم پسندی، شہرت کی ہوس اور ایک مبہم قیامت کی سوچ پائی جاتی تھی۔ 2006 میں وہ ایک فضائی حملے میں مارا گیا۔ اس کے بعد ابوالیوب المصری، جو کہ ایک مصری شہری تھا، نے قیادت سنبھالی لیکن وہ بھی ایک امریکی-عراقی کارروائی میں مارا گیا۔ کچھ وقت تک داعش بغیر کسی قائد کے رہی۔ پھر 2011 میں ابوبکر البغدادی منظر عام پر آیا اور اس نے تنظیم کی مکمل کمان سنبھال لی۔ اس نے عراقی شیعہ آبادی اور شام کے صدر بشار الاسد کی افواج کے خلاف فرقہ وارانہ جنگ کی قیادت کی۔

2013 میں داعش کے نام سے ایک نیا گروہ قائم کیا گیا، جو ایک وقت میں عراق اور شام کے

بڑے حصے پر قابض ہو گیا۔ اس گروہ کا مقصد شریعت پر مبنی ایک اسلامی ریاست قائم کرنا تھا، جیسا کہ ابن تیمیہ نے تیرہویں صدی میں نظریاتی طور پر بیان کیا تھا اور محمد بن عبدالوہاب نے اٹھارہویں صدی میں ایک عوامی تحریک کے طور پر اسے پروان چڑھایا۔

2014 میں، داعش نے عراق کے فلوچہ، موصل اور تکریت جیسے سنی اکثریتی علاقوں پر قبضہ کر لیا، اور ساتھ ہی دریائے فرات کے کنارے شام کے کئی قصبے بھی اس کے قبضے میں آ گئے۔ ان علاقوں میں زیادہ تر وہ لوگ بستے تھے جو صدام حسین کے حامی تھے، اور امریکی افواج نے ان تمام افراد کو حکومت اور سیکورٹی اداروں سے نکال باہر کیا جو کہ ایک انتہائی غیر دانشمندانہ قدم تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ افراد نئی شیعہ حکومت سے انتقام لینے پر آمادہ ہو گئے۔ جلد ہی عراق میں ایک مکمل فرقہ وارانہ جنگ کا آغاز ہوا، جہاں خود کش بمبار بغداد اور دیگر شہروں میں چیک پوسٹوں کو نشانہ بنانے لگے۔ داعش نے اپنے زیر قبضہ علاقوں میں سخت شریعت قوانین نافذ کیے۔

امریکی انتظامیہ نے خطے میں نئی سیکورٹی فورسز تشکیل دیں۔ لیکن زیادہ تر افسران، جو پہلے عراقی فوج کا حصہ تھے، اب داعش میں شامل ہو گئے اور ابو بکر البغدادی کی قیادت میں ایک طاقتور جنگجو فورس کی تشکیل دی۔ یہ افراد تجربہ کار اور ذہین تھے۔ جلد ہی انہوں نے ہزاروں نئے عراقی فوجی بھرتی شدگان کو ہلاک کر دیا اور عراق کے وسیع علاقے پر قبضہ جمالیا۔ تاہم کرد فورسز، جو کہ شمالی عراق میں خود مختار علاقے میں مقیم تھیں، نے داعش کو سخت مزاحمت دی اور انہیں اپنے شہروں سے دور رکھا۔ یزیدی اقلیت، جو شمالی عراق کے کچھ علاقوں میں رہتی تھی، داعش کی درندگی کا بدترین نشانہ بنی: انہیں قتل کیا گیا، عورتوں کی آبروریزی کی گئی اور غلامی میں لے جایا گیا۔ داعش نے انہیں کسی عجیب قسم کے عیسائی فرقے سے تعلق رکھنے والے کافر قرار دیا۔ داعش کی بربریت، جو عراق اور شام میں جاری تھی، 2016 کے آخر تک اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ عالمی میڈیا رپورٹس نے مہذب دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ داعش کے ٹیکنالوجی سے واقف اراکین نے سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کا استعمال اپنے جرائم کی تشہیر اور نوجوانوں کی بھرتی کے لیے کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ القاعدہ نے باضابطہ طور پر داعش سے تعلق توڑ لیا، کیونکہ القاعدہ کے مطابق بے گناہ

لوگوں کا پر تشدد قتل مسلم دنیا کو خود سے دور کر دے گا۔ داعش کے وحشیانہ جرائم کا سلسلہ 2017 تک جاری رہا۔ انہوں نے امریکی صحافیوں اور بین الاقوامی امدادی کارکنوں کو قتل کیا۔ انہوں نے عوامی مقامات پر دشمنوں کی گردنیں کاٹنے کی ویڈیوز بنا کر سوشل میڈیا پر نشر کیں۔

نومبر 2015 سے مئی 2017 کے درمیان، دنیا بھر میں جہادی دہشت گرد حملے دیکھنے کو ملے۔ یہ حملے فرانس (پیرس، تولوز، نیس)، بیلجیم (برسلز)، سپین (میڈرڈ، بارسلونا)، امریکہ (کیلی فورنیا، نیویارک، بوٹن، فلوریڈا)، برطانیہ (مانچسٹر، لندن) اور جرمنی (برلن) میں ہوئے۔ ان حملوں میں اکثر نوجوان، تعلیم یافتہ مسلمان ملوث تھے، جو یا تو سوشل میڈیا اور وہابی-سلفی نظریات پر مبنی ویب سائٹس سے شدت پسند بننے یا داعش سے متاثر ہوئے۔

نسل پرستی بمقابلہ اسلام پسندی

سال 2018 میں مغربی دنیا میں سفید فام بالادستی کے حملوں میں اضافہ دیکھا گیا۔ امریکہ کے شہر پٹسبرگ میں ایک یہودی عبادت گاہ، نیوزی لینڈ کے کرائسٹ چرچ کی ایک جمعے کی نماز کی جماعت، اور ناروے کے شہر اوسلو کی ایک مسجد پر حملہ کیا گیا۔ جب ڈوملڈ ٹرمپ نے 2016 کے متنازع صدارتی انتخابات جیتے، باوجود اس کے کہ ان کے تقریریں اور ٹویٹس شدید تنقید کا نشانہ بنتے رہے، تو ان کے اقدامات نے نسلی تعصب رکھنے والوں کو مزید حوصلہ اور تحریک دی۔ امریکی قدامت پسند میڈیا نے صدر ٹرمپ کی نسل پرستانہ بیانیہ کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا، خاص طور پر ڈیموکریٹس، لبرلز اور لاطینی تارکین وطن کے خلاف، جنہیں وہ امریکہ کی جنوبی سرحد سے آنے والا منشیات فروشوں اور مجرموں کا قافلہ قرار دیتے رہے۔ 2019 تک سفید فام قوم پرست نہ صرف مزید متحرک ہو چکے تھے بلکہ کھلم کھلا بولنے لگے تھے۔ ماضی میں تشدد سے جڑی یہ تنظیمیں اب خود کو ریاستی پشت پناہی یافتہ محسوس کرنے لگیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سفید فام بالادستی کے انتہا پسندوں کی انتہا پسندانہ سوچ، طریقہ اور بیانیہ درحقیقت داعش کی حکمت عملی سے ملتے جلتے تھے۔ درحقیقت، انتہا پسندی ایک نظریاتی ڈھانچہ ہے، چاہے وہ مغرب میں ہو یا مشرق میں۔ بظاہر، سفید فام قوم پرست اور داعش کے بھرتی شدہ افراد میں کوئی مماثلت نظر نہیں آتی۔ ایک طرف وہ

گروہ ہے جو نسل پرستی اور تارکین وطن دشمنی پر یقین رکھتا ہے اور اس خوف میں مبتلا ہے کہ جلد ہی رنگ دار لوگ اکثریت میں آجائیں گے؛ دوسری طرف وہ گروہ ہے جو غیر اسلامی ممالک میں ہجرت کو ایک مقصد سمجھتا ہے تاکہ وہاں اپنی تعداد بڑھا کر کفار کو قتل کرے اور شریعت پر مبنی خلافت قائم کی جاسکے۔ دونوں گروہوں نے سوشل میڈیا اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کا بھرپور استعمال کیا اور اپنی تقسیم پیدا کرنے والی نظریات کو پھیلا یا۔ دونوں کو یقین تھا کہ وہ وجودی بحران سے گزر رہے ہیں جو ان کے طرز زندگی کو خطرے میں ڈال رہا ہے اور بقا کا واحد راستہ تشدد ہے۔

اپنی طاقت کے عروج پر، داعش نے 60 سے 80 لاکھ افراد کی قابل ٹیکس آبادی، تیل کے کنویں اور ریفائنریاں، اناج کے گودام، اسمگلنگ کے منافع بخش راستے اور اسلحے کے بڑے ذخیرے پر قبضہ حاصل کر لیا تھا۔ ان کا معاشی دار الحکومت موصل تھا، جو عراق کا دوسرا سب سے بڑا شہر ہے۔ داعش سب سے طاقتور، دولت مند اور جدید اسلحے سے ایس جہادی تنظیم بن چکی تھی، جس میں تعلیم یافتہ اور ٹیکنالوجی کے ماہر جنگجو شامل تھے۔ اس کی فوجی مہم اور خلافت کے قیام نے پوری اسلامی دنیا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ابوبکر البغدادی نے موصل کی 950 سال پرانی انوری مسجد کے منبر سے اسلامی خلافت کا اعلان کیا، جس نے دنیا بھر کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔

داعش کا زوال

جلد ہی عراق اور شام میں داعش کی خلافت کو ختم کر دیا گیا، مگر اس تنظیم کی نظریاتی بنیاد اب بھی باقی ہے۔ 2018 کے آغاز تک داعش صرف عراق کے انبار صوبے کے ریگستانی علاقے اور شام میں دریائے فرات کے کنارے کے کچھ چھوٹے دیہات تک محدود ہو چکی تھی۔ تاہم، ان چھوٹے ٹھکانوں کو صاف کر دیا گیا اور ان کمپوں میں قید خواتین اور بچوں کو امریکی اور کرد فورسز نے رہائی دلائی۔ اسی وقت عراقی حکومت کو غربت اور فرقہ واریت کے شدید مسائل کا سامنا تھا جو آج بھی برقرار ہیں۔ 2003 سے اب تک، پہلے امریکی حملے اور پھر فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے تباہ ہونے والے شہروں اور بنیادی ڈھانچے کی تعمیر نو کے لیے اربوں ڈالر درکار ہیں۔

داعش کے جنگجو اب بھی مصر، افغانستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور فلپائن میں نمودار ہوتے رہتے

ہیں۔ یمن میں بھی یہ عناصر دیکھے گئے ہیں، جہاں وہ انتشار، خانہ جنگی اور کمزور یا ناپید حکومت کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ یہ شدت پسند گروہ افغانستان میں دوبارہ ابھر رہا ہے، جہاں اسے اسلامک اسٹیٹ خراسان (IS-K) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ 17 اگست 2019 کو کابل میں ایک شیعہ شادی کی تقریب پر ہونے والا حملہ اس بات کا ثبوت ہے کہ داعش افغانستان میں اپنے قدم جما رہی ہے۔

داعش کی خراسان شاخ نے باقاعدہ طور پر 2015 میں اپنے عملیات کا آغاز کیا۔ ”خراسان“ کا حوالہ قرون وسطیٰ کے علاقے کی طرف ہے جو آج کے افغانستان، ایران اور وسطی ایشیا کے کچھ حصوں پر مشتمل تھا۔ داعش نے اس خطے میں اپنی بنیاد ان سابق پاکستانی اور افغان طالبان کی مدد سے رکھی، جنہوں نے 2014 میں ابو بکر البغدادی سے وفاداری کا حلف لیا تھا۔ یہ گروہ مقامی طالبان ہمدردوں اور پاکستانی طالبان کے آوارہ گروہوں پر مشتمل تھا، جو مشرقی افغانستان میں اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ اپنے نظریاتی عقائد کے مطابق، یہ گروہ خواتین اور شیعہ برادری پر سفاک حملے کرتے رہتے ہیں۔ افغانستان میں داعش کے جنگجوؤں کی تعداد مقامی طور پر بھی بڑھی ہے اور ان میں وہ جنگجو بھی شامل ہیں جو شام سے خلافت کے خاتمے کے بعد یہاں منتقل ہوئے۔ ان کی اکثریت ننگر ہار صوبے میں موجود ہے۔

اقوام متحدہ کے مطابق، کابل کی شادی کی تقریب پر حملے کے بعد ان کی رسائی مزید علاقوں تک پھیل چکی ہے۔ بارہا، داعش نے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ وہابی۔ سلفی نظریے کے سب سے سخت گیر پیروکار ہیں، جو طالبان یا القاعدہ سے بھی زیادہ شدت سے اس نظریے پر عمل پیرا ہیں۔ فروری 2020 میں صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے خصوصی سفیر، زلمے خلیل زاد نے طالبان کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کیے، جس کے تحت امریکی افواج کو مرحلوں میں افغانستان سے مکمل طور پر نکالنے کا فیصلہ کیا گیا۔ طالبان قیادت نے طویل عرصے سے امریکی زیر قیادت فوجوں کے تدریجی انخلا کا مطالبہ کیا تھا۔ یہی طالبان رہنما، جو اب امریکہ کے ساتھ مذاکرات میں شامل ہیں، وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے دور حکومت میں سخت شرعی قوانین نافذ کیے تھے جن میں ٹی وی پر موسیقی اور فلموں پر پابندی، زانیوں کی سرعام سزائیں اور آثاری مقامات کی دانستہ تباہی شامل

تھی۔ آج وہ اپنے آپ کو بدلا ہوا اور معتدل ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر ان کی مذاکراتی ٹیم میں صرف ایک خاتون کی موجودگی رواداری کا جھوٹا تاثر پیش کرنے کی کوشش ہے۔ طالبان چالاکی سے امریکی مذاکراتی ٹیم کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہا ہے، اور یہ ظاہر کر رہا ہے کہ وہ اب صوفی اسلام کے روایتی اور بردبار نظریے کو اپنائے ہوئے ہے اور اب وہابی۔ سلفی فکر سے جڑا ہوا نہیں ہے۔ یہ کوششیں خاص طور پر سوشل میڈیا کے ذریعے کی جا رہی ہیں۔

طالبان کا ثقافتی کمیشن فیس بک اور ٹویٹر (جواب X ہے) پر مختلف زبانوں میں پروپیگنڈہ پھیلا رہا ہے۔ وہ واٹس ایپ، واہبر اور ٹیلی گرام پر چھوٹی خبریں پھیلانے میں بھی ملوث ہے۔ ان کا بنیادی مقصد دنیا کی رائے عامہ کو متاثر کرنا اور افغان مڈل کلاس کو اپنی استحکام پسندی کا یقین دلانا ہے۔ وہ اپنے آپ کو محب وطن کہہ کر بیانیہ کارخ موڑنے میں ماہر ہو چکے ہیں۔ چودھویں صدی کی قدامت پسند وہابی۔ سلفی تحریک کا اکیسویں صدی کی ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھانا واقعی ایک چالاک حکمت عملی ہے۔ امریکی افواج کے باعزت انخلا کے بدلے، طالبان نے کچھ اہم رعایتیں دی ہیں، مگر حقیقت میں وہ اب بھی انتہائی قدامت پسند وہابی۔ سلفی نظریے کے پیروکار ہیں۔ اب البتہ وہ اسے دنیا کے سامنے معتدل بنا کر پیش کرنے میں زیادہ مہارت رکھتے ہیں۔ طالبان اور القاعدہ کے نچلے درجے کے کارکنان اسی وہابی۔ سلفی سوچ میں پرورش پاتے ہیں، اور ان کی شیعہ اولیاء کے مزاروں اور صوفی ازم سے شدید نفرت بالکل عیاں ہے۔ تاہم، یہ تازہ ترین امن معاہدہ امریکہ کے لیے تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے، کیونکہ طالبان کی قیادت کو اپنے شدت پسند کارکنوں پر مکمل کنٹرول حاصل نہیں ہے۔ چاہے وہ طالبان، القاعدہ یا داعش سے تعلق رکھتے ہوں، سب کا ماننا ہے کہ وہ ایک دن متحد ہو کر خراسان میں ایک مضبوط اسلامی ریاست قائم کریں گے۔ ادھر، صدر ٹرمپ نے شمالی شام سے امریکی افواج کے انخلا کی منظوری دی، جس کے بعد ترکی کو وہاں داخلے کی اجازت مل گئی۔ اس اقدام سے شام میں تارتخ دہرانے کا خطرہ بڑھ گیا ہے یعنی افراتفری اور غیر یقینی مستقبل۔

کردوں کی قیادت میں قائم شام کی ملیشیا (SDF) وہ اہم زمینی قوت تھی جس نے شام میں

داعش کو شکست دی۔ مگر اب امریکی حمایت کے بغیر، کردوں کو ترکی یا شامی حکومت سے کسی بہتر معاہدے کی امید نہیں رہی۔ نتیجتاً، داعش کے خفیہ سیل اس صورت حال کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ترکی کے شمالی شام پر حملے نے نئی شورش کو جنم دیا ہے۔ اب جب کہ داعش واپسی کی تیاری میں ہے، تو مشرق وسطیٰ اور افغانستان ایک بار پھر امریکی پالیسیوں کی ناکامی کی بھاری قیمت چکانے کے دہانے پر ہیں۔ ان تمام حالات کے بیچ، اسرائیل نے مسلسل ایران کے ایٹمی طاقت بننے کے خلاف آواز بلند کی ہے، گویا مشرق وسطیٰ میں سنی اور شیعہ فرقوں کے درمیان دراڑ کو مزید گہرا کرنا اس کا مقصد ہو۔ اسرائیلی قیادت بخوبی سمجھتی ہے کہ اگر وہ پرامن طریقے سے رہنا چاہتے ہیں تو سعودی عرب اور مصر کو اپنے ساتھ رکھنا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسرائیل کا ایران سے براہ راست کوئی تنازعہ نہیں ہے، مگر تہران دیگر دنیا کی طرح فلسطینی عوام کی اسرائیلی قبضے کے تحت ناقابل بیان اذیتوں کی ترجمانی کرتا ہے۔

اسرائیل کی جانب سے اسکولوں اور پارٹمنٹ بلاکس پر بمباری، جس میں ہزاروں بے گناہ فلسطینی جاں بحق ہوئے، کون بھلا سکتا ہے؟ اسرائیلی رہنما بنیامین نتن یاہو، جو عربوں کے دوست ہونے کا ڈھونگ رچاتے ہیں، نے ایران کے نیوکلیر معاہدے کو ایک چونکا دینے والی تاریخی غلطی قرار دیا، اور اس طرح چالاکی سے علاقائی فرقہ واریت کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کیا۔

نوجوان سعودی قیادت کو سمجھنا چاہیے کہ ہمارے ذہن میں ایک قسم کی حفاظتی دیوار ہوتی ہے جو ہمیں غلط خیالات سے بچاتی ہے۔ اسرائیل سعودی عرب اور ایران کے درمیان فرقہ وارانہ تقسیم کو اسی دیوار میں ایک بڑی دراڑ سمجھتا ہے۔ وہ ایران کے نیوکلیر معاہدے پر حملے جاری رکھے ہوئے ہے اور اسرائیل۔ فلسطین دوریاستی حل کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔

یہ وقت ہے کہ مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک اس حقیقت کو تسلیم کریں کہ بڑھتی ہوئی داعش کی آئیڈیالوجی پورے عالم اسلام کے لیے ایک حقیقی وجودی خطرہ بن چکی ہے۔ اگر یمن، شام، عراق، لبنان اور لیبیا جیسے ممالک فرقہ وارانہ تنازعات میں الجھے رہے تو داعش جیسے گروہ جلد ہی ایک اتھارٹی بن کر ابھریں گے اور جہاں کہیں بھی موقع ملے، سخت ترین شریعت نافذ کر کے ایک

سلفی اسلامی ریاست قائم کرنے کی کوشش کریں گے۔ داعش دراصل القاعدہ اور سلفی آئیڈیالوجی سے ہی نکلی ہے۔ یہ قومیت اور سیکولرزم کو رد کرتی ہے اور بادشاہتوں کو ہٹا کر ایک عالمی اسلامی خلافت قائم کرنے کا خواب دیکھتی ہے۔ اپنے عروج کے دور میں ہزاروں غیر ملکی مسلمان داعش میں شامل ہوئے۔ ان میں فرانس، برطانیہ، ^{بیلجیم} جرمنی، ہالینڈ، آسٹریلیا، بھارت، پاکستان، انڈونیشیا اور امریکہ سے تعلق رکھنے والے افراد شامل تھے۔

تجزیہ نگار اب بھی اس بات پر حیران ہیں کہ یورپ اور امریکہ کی تیسری اور چوتھی نسل کے مسلمان اور نو مسلم کیسے اس تنظیم کی طرف راغب ہوئے۔ مغربی ممالک میں رہنے والی مسلم برادریاں ساتھ ساتھ مگر الگ الگ رہتی ہیں۔ تیسری اور چوتھی نسل کے مسلمان دو انتہاؤں کے درمیان بٹے ہوئے ہیں: اسکول اور دوستوں سے وہ آزاد خیالات اور سماجی اقدار سیکھتے ہیں، جب کہ گھر میں انہیں سخت سلفی اسلامی اصولوں پر عمل کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ انہیں اپنے مغربی دوستوں سے ملنے اور مخلوط تقریبات میں شرکت کرنے سے روکا جاتا ہے۔ اکثر ہفتہ وار تعطیلات اور چھٹیاں وہ گھر میں ہی گزارتے ہیں، جہاں ماحول خشک اور محدود ہوتا ہے۔ اسی بے رنگ گھریلو ماحول کے باعث وہ انٹرنیٹ پر بہت زیادہ وقت گزارتے ہیں۔ نوجوان ذہن اس پر شدت سے رد عمل دیتے ہیں؛ وہ جہادی ویب سائٹس اور دیگر سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کے عادی ہو جاتے ہیں۔ دھیرے دھیرے وہ خفیہ ایپس کے ذریعے ایک دوسرے سے جڑ جاتے ہیں، جہاں گروپ کی شناخت چھپائی جاتی ہے۔ کچھ نوجوان اپنے والدین کے فیصلوں کو مسترد کر کے مغربی اقدار اختیار کر لیتے ہیں اور مرکزی دھارے میں شامل ہو جاتے ہیں۔

داعش کی سوشل میڈیا ٹیموں نے امریکہ اور یورپی ممالک سے ہزاروں ذہین، تسلیم یافتہ اور ٹیکنالوجی سے واقف نوجوانوں کو جو بیس گھنٹے پروپیگنڈا پھیلانے کے لیے بھرتی کیا ہے۔ 'لون ولف' قسم کے حملہ آور، جیسا کہ ڈلاس، ٹیکساس اور چائٹوگا میں ہوئے، کسی بڑی سازش کا حصہ نہیں تھے۔ بلکہ یہ بور اور الجھن کا شکار نوجوان تھے جو انتہا پسند نظریات سے متاثر ہو کر جنت کے وعدے کے ساتھ جہاد کے رومانوی تصور سے بہک گئے۔

عرب نژاد امریکی نوجوان محمد عبدالعزیز، جس نے چائٹو کا حملہ کیا، نے اپنی آخری بلاگ پوسٹ میں لکھا کہ اس کے لیے دنیا ایک 'یکسانیت اور معمول کی جیل' تھی۔ مختصراً، جو کچھ ہوا وہ یہ کہ 1979 کے بعد سعودی عرب سے نکلنے والا عدم برداشت اور عورت دشمن اسلام کا وائرس دنیا بھر میں پھیلتا گیا، اور ہر جگہ اپنے میزبان ماحول سے کچھ نہ کچھ نیا سیکھ کر ایک زیادہ مہلک شکل اختیار کر گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک زہریلا جہاد ازم ارتقا پذیر ہوا، جو القاعدہ اور داعش کی شکل میں سامنے آیا۔

سعودی عرب میں معتدل اسلام کا ظہور

خوش آئند بات یہ ہے کہ سعودی عرب کے باثرو لی عہد شہزادہ محمد بن سلمان (MBS) 2017 سے وہابی اسلام میں نرمی اور اصلاحات لانے کے مشن پر گامزن ہیں۔ انہوں نے سعودی عرب کی خوفناک مذہبی پولیس کے اختیارات محدود کر دیے ہیں، جو پہلے کسی خاتون کو صرف اس وجہ سے گرفتار کر سکتی تھی کہ اس نے اپنے جسم کا کوئی انچ ننگا چھوڑ دیا ہو۔ انہوں نے خواتین کو گاڑی چلانے اور بغیر کسی مرد سرپرست کے سفر کرنے کی اجازت بھی دی ہے۔ انہوں نے نیو یارک ٹائمز کے معروف کالم نگار تھامس فریڈمین کو ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ وہ اسلام کی نئی تعبیر نہیں کر رہے، بلکہ 'اسلام کو اس کی اصل حالت کی طرف لوٹا رہے ہیں'۔ ان کا کہنا تھا کہ سعودی عرب میں بگاڑ 1979 سے شروع ہوا، جب اسلام کو سیاست سے جوڑ دیا گیا، ایران میں آیت اللہ خمینی کے عروج اور مکہ مکرمہ میں مسجد الحرام پر انتہا پسندوں کے قبضے جیسے واقعات کے ذریعے۔

مارچ 2018 میں ایک '60 منٹ' کے انٹرویو کے دوران، شہزادہ محمد بن سلمان نے کہا کہ 1979 سے پہلے سعودی عرب دیگر خلیجی ممالک کی طرح تھا، خواتین گاڑیاں چلاتی تھیں، میوزیکل تھیٹرز ہوتے تھے، مردوں اور عورتوں کے درمیان میل جول عام بات تھی، اور عیسائیوں اور یہودیوں کے لیے عزت و احترام موجود تھا۔ درحقیقت، 1950 کی دہائی میں سعودی خواتین بغیر حجاب کے آزادانہ گھومتی تھیں۔ وہ اسکرٹس پہنتی تھیں، مردوں کے ساتھ عوامی مقامات پر چلتی تھیں اور موسیقی کی محفلوں میں شریک ہوتی تھیں۔

مختصراً، 1979 کے ان واقعات سے پہلے سعودی عرب دنیا کے دیگر ممالک کی طرح ایک نارمل

ریاست کے طور پر کام کر رہا تھا۔ گو ماضی کی دھند ابھی مکمل طور پر چھٹی نہیں، لیکن کچھ امید کی کرنیں ضرور نظر آرہی ہیں، کم از کم دورانِ فقر۔ طالبان اب امریکہ سے مذاکرات میں مصروف ہیں، داعش سوشل میڈیا پر اپنی نئی تصویر بنانے کی کوشش کر رہی ہے، اور سعودی شاہی خاندان اصلاحات کے ذریعے اپنے شہریوں کو زیادہ آزادی دینے کے لیے مصروف عمل ہے۔

امریکہ کی مشرق وسطیٰ پالیسی میں بنیادی تبدیلی

کئی دہائیوں تک امریکی خارجہ پالیسی کا مرکز مشرق وسطیٰ میں اسرائیل۔ فلسطین تنازع رہا۔ تمام امریکی صدور نے ہمیشہ اسرائیل کے ساتھ ایک دو طرفہ تعلق اور خصوصی رشتہ برقرار رکھا۔ گزشتہ چار امریکی صدور، دو ریپبلکن اور دو ڈیموکریٹ، نے خود کو اسرائیل۔ فلسطین تنازع میں ایک منصفانہ ثالث کے طور پر پیش کیا اور ہمیشہ دور یاستی حل کی حمایت کی۔

رچرڈ ہاس نے 2020 میں فارن افیئرز میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں لکھا کہ:

”صدر ٹرمپ نے مشرق وسطیٰ میں امریکی خارجہ پالیسی کو درہم برہم کر دیا ہے اور

اسرائیل اور عرب بادشاہتوں کو ایران کے خلاف ایک صفحے پر اکھڑا کیا ہے۔“

صدر ٹرمپ نے افسوسناک طور پر غریب اور کمزور فلسطینیوں کو یکسر تنہا کر دیا، دور یاستی حل کو مسترد کیا، گولان کی پہاڑیوں کے اسرائیلی انضمام کو تسلیم کیا، یروشلم کو اسرائیل کا دارالحکومت تسلیم کیا، اور متبوضہ مغربی کنارے کے اسرائیلی انضمام کی بنیاد بھی رکھ دی۔

باب اول

وہابیت: عالمی جہاد کا نظریاتی ماخذ

وہابیت بنیادی طور پر ایک الہیاتی تحریک ہے جو اٹھارویں صدی کے اختتام سے سنی اسلام سے ابھری، اور اس کے نظریاتی بنیادیں سلفیت سے وابستہ ہیں۔ لفظ سلفی عربی اصطلاح السلف الصالح سے نکلا ہے، جس کا مطلب ہے ”نیک سلف“۔ یعنی وہ ابتدائی دو یا تین نسلیں جو سلفی لوگ نمونہ سمجھ کر ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

چودھویں صدی کے اسلامی عالم تقی الدین احمد ابن تیمیہ (1263-1328) نے کہا تھا کہ 1258 میں منگولوں کے ہاتھوں بغداد میں عباسی خلافت کا زوال اسلامی اقدار کی تنزلی کا فطری نتیجہ تھا۔ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں جب مسلم علاقوں پر مغربی ممالک نے قبضہ کر لیا، تو مشرق وسطیٰ کی مسلم سوسائٹیوں میں سلفی نظریات نے زور پکڑا۔ سلفی مصلحین نے مسلمانوں کے زوال کی وجہ ان کے ”اصلی ایمان“ سے ہٹنے کو قرار دیا اور دلیل دی کہ اب صرف ایک ہی راستہ بچا ہے: اسلام کے ”قدیم اور خالص“ طریقے کی طرف واپسی۔

سلفیت نے مغربی اثرات اور ان تمام عناصر کو، جنہیں وہ اصل دین سے انحراف سمجھتے ہیں، جیسے کہ شیعیت، تصوف، اور غیر سلفی سنی اسلام، اسلام سے ”صاف کرنے“ کی کوشش کی۔ ان کا مرکزی لٹریچر ابن تیمیہ اور ان کے شاگردوں کی تحریروں پر مبنی تھا، جو قرآن و سنت کی لفظی تشریح

کے ذریعے خالص اسلامی عقائد کی بحالی پر زور دیتے تھے۔ سلفیت کا محور شرک کا خاتمہ اور توحید کا اعلان ہے۔ وہ خود کو اسلام کے سچے پیروکار سمجھتے ہیں۔ اولیاء اللہ کی تعظیم کرنے یا ان کے مزارات پر دعا مانگنے والوں کو وہ مرتد اور دین سے خارج سمجھتے ہیں۔

سلفی نظریات عورتوں کی آزادی کو محدود کرتے ہیں اور انہیں عموماً گھروں تک محدود رکھتے ہیں، حتیٰ کہ انہیں رسمی تعلیم سے بھی محروم کیا جاتا ہے۔

اٹھارویں صدی کی اصلاحی تحریک وہابیت، جو محمد بن عبدالوہاب (1703-1792) نے سعودی عرب میں شروع کی، درحقیقت وہی سلفی فکر تھی جسے ابن تیمیہ نے کئی صدیوں پہلے پیش کیا تھا۔ وہابیت کا مرکزی عقیدہ توحید ہے۔ جزیرہ عرب میں مسلمانوں کی اخلاقی گراؤ اور سیاسی کمزوری نے اس تحریک کو مضبوطی بخشی۔

سلطنت عثمانیہ کی بنیاد و ادارہ خفی صوفی سنی اسلام پر تھی، مگر محمد بن سعود (پہلی سعودی ریاست کے بانی) نے مذہبی عالم عبدالوہاب سے 1744 میں ایک معاہدہ کیا جس نے ایک سماجی، سیاسی اور مذہبی تحریک کو جنم دیا، اور آخر کار سعودی عرب میں عثمانی اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ اس تحریک نے بنیادی توحید اور قرآن وحدیث کی لفظی تشریح کو مرکز بنایا۔

اس تحریک کے تحت چلنے والی مہم کو ”جہاد“ کا نام دیا گیا، جس میں صوفی اولیاء کے مزارات اور مقبروں کی تباہی شامل تھی، جو قرون وسطیٰ میں پروان چڑھے تھے۔ وہابیت شریعت کے سخت نفاذ پر زور دیتی ہے۔ یہ مغربی اثرات، اور اسلامی فنون و عرفان کی روایتوں کی شدید مخالف ہے۔ سعودی عرب کی بادشاہت نے وہابی تحریک کو ایک ریاست فراہم کی، جس میں مقدس شہر مکہ اور مدینہ بھی شامل تھے، جس کی وجہ سے یہ تحریک مسلم دنیا میں مزید قبولیت حاصل کرنے لگی۔

1970 کی دہائی کے اوائل میں تیل کی قیمتوں میں تین گنا اضافے کے بعد وہابی اثر مسلم ثقافت اور فکر پر غیر معمولی طور پر بڑھنے لگا۔ اس کے بعد سے، سعودی حکومت نے دنیا بھر میں وہابیت کے فروغ کے لیے اربوں ڈالر خرچ کیے ہیں، جن میں وہابی عقائد کی تبلیغ کرنے والی مساجد، مدارس اور اسلامی مراکز کی تعمیر شامل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مقامی اسلامی تعبیرات، جو

وہابی اسلام کی طرح سخت گیر نہیں تھیں اور زیادہ تر صوفی اسلامی روایات پر مبنی تھیں، آہستہ آہستہ حاشیے پر چلی گئیں اور بالآخر ایک سخت گیر جہادی اسلام کی صورت میں مکمل طور پر تبدیل ہو گئیں۔ تمام وہابی دراصل سلفی ہوتے ہیں، لیکن تمام سلفی وہابی نہیں ہوتے۔ تاہم، یہ دونوں اصطلاحات اکثر ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتی ہیں۔ الہیاتی نقطہ نظر سے، وہابیت اور سلفیت ایک ہی عقائد پر مبنی ہیں۔ ان نظریات کے دو بنیادی ستون ہیں: ایک انتہائی پاکیزہ پسندی (puritanical outlook) اور دوسرا، اسلام کے ابتدائی دور کی طرف واپسی کی آرزو، جب خیال کیا جاتا ہے کہ اسلام بیرونی اثرات سے آلودہ نہیں ہوا تھا۔

سلفی اور وہابی دونوں ان تمام دینی و فقہی ترقیات کو ناپسند کرتے ہیں جو پیغمبر اسلام کے بعد آنے والی ابتدائی نسلوں (السلف الصالح) کے بعد وقوع پذیر ہوئیں۔ یہ تصوف کو رد کرتے ہیں اور سنی اسلامی فقہ کے جنہی مکتب کی پیروی کو مسترد کرتے ہیں۔ تاہم، وہابیت پر ایک تنقیدی مضمون میں، یونیورسٹی آف کیلیفورنیا کے پروفیسر حمید الگار نے سلفیوں اور وہابیوں کے درمیان فرق کرنے کے دو طریقے بیان کیے ہیں:

1 دوسرے مسلمانوں کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے جبر کے بجائے قائل کرنے کی کوششوں پر انحصار۔

2 مسلم دنیا کو درپیش سیاسی و سماجی - معاشی بحران کے بارے میں ایک باشعور فہم۔

1744 میں سعود - وہاب اتحاد

وہابیت کو ایک اسلامی اصلاحی اور تجدیدی نظریہ کے طور پر محمد بن عبدالوہاب سے منسوب کیا جاتا ہے، جنہوں نے 1744 میں سعودی عرب کے حکمران شاہی خاندان آل سعود کے ساتھ ایک معاہدے کے ذریعے اتحاد قائم کیا۔ تب سے یہ نظریہ سعودی ریاست کا سرکاری نظریہ بن چکا ہے، جس کا آئین قرآن مجید کو قرار دیا گیا ہے۔

اکیسویں صدی کے اسلامی انتہا پسندی کے رجحان کو سمجھنے کے لیے عرب جزیرہ نما کی تہہ در تہہ

تاریخ اور وہابی نظریات سے اس کے ربط کو گہرائی سے سمجھنا ضروری ہے، کیونکہ یہی نظریہ موجودہ سعودی عرب کی اساس ہے۔

عبدالوہاب 1703 میں نجد کے بنو تمیم قبیلے میں پیدا ہوئے، جو کہ موجودہ سعودی عرب کے وسطی حصے میں واقع ایک پسماندہ اور خشک علاقہ تھا۔ ان کے والد ایک فقیہ تھے، جو سنی فقہ کے حنبلی مکتب سے تعلق رکھتے تھے، جو اپنی سخت گیری اور قدامت پسندی کے لیے جانا جاتا ہے۔

عبدالوہاب نے حجاز کے علاقے کا سفر کیا، جہاں انہوں نے مکہ اور مدینہ جیسے مقدس شہروں میں فقہ، الہیات اور تصوف کی تعلیم حاصل کی۔ مدینہ میں قیام کے دوران وہ مشہور عالم ابن تیمیہ (1263-1328) کی تعلیمات سے متاثر ہوئے، جنہوں نے صلیبیوں کے خلاف جہاد کیا تھا اور اس عقیدے کے حامل تھے کہ اسلام کی بنیاد قرآن اور تلواریں پر ہے۔ ان تعلیمات نے نوجوان عبدالوہاب پر گہرا اثر چھوڑا، اور بعد میں انہوں نے ان نظریات کو شدت کے ساتھ اپنایا۔

ابن تیمیہ تصوف کے ساتھ ساتھ سنی اور شیعہ مسلک کے ماننے والوں کے سخت مخالف تھے اور انہیں بدعتی یا گمراہ قرار دیتے تھے۔ عبدالوہاب نے ایران، عراق اور شام کے اپنے سفر کے دوران دیکھا کہ ان علاقوں کے مسلمان بزرگوں کے مزار تعمیر کرتے ہیں اور اولیاء و اماموں کے مزاروں پر حاضری دے کر ان کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔ مدینہ میں بھی وہ اکثر مسلمانوں کو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضہ اقدس پر عبادت کرتے ہوئے دیکھتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ اعمال توحید باری تعالیٰ کے اصولوں کو مجروح کرتے تھے۔ ان کے لیے یہ بات انتہائی تشویش ناک تھی کہ مکہ اور مدینہ، جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وطن ہیں، وہاں بھی اس قسم کے افعال عام تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ یہ اعمال اسلام کے حقیقی راستے سے انحراف ہیں، جو امت مسلمہ کی اخلاقی زوال کا سبب بن رہے ہیں۔

عبدالوہاب اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ تمام مسلمانوں کو واپس اسی ”خالص“ اسلام کی طرف لوٹنا ہوگا، جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد چند ابتدائی صدیوں میں رائج تھا۔ انہوں نے اجتہاد کی دعوت دی، جس کے مطابق بعد از پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم تمام مذہبی ترقیات، روایات اور تفسیروں

کو از سر نو جانچنا چاہیے، اور صرف قرآن و سنت کو رہنما بنانا چاہیے۔ اسی بنیاد پر انہوں نے ان مسلمانوں کے خلاف جنگ کو جائز اور واجب قرار دیا، جو ان کے مطابق شرک میں مبتلا تھے۔ ان کا استدلال تھا کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا صریح شرک ہے، جو قرآن کی ہدایت کے برخلاف اور ناقابل معافی گناہ ہے۔

مخبر کے علاقے میں ان کی یہ شدت پسند مذہبی تشریح اور اولیاء کی تعظیم کو چیلنج کرنے والا نظریہ سخت تنازع کا باعث بن گیا۔ ان کے والد اور بھائی نے نہ صرف ان سے لاتعلقی اختیار کی بلکہ انہیں اپنی فکر سے دستبردار ہونے کی نصیحت کی۔ یہاں تک کہ ان پر قاتلانہ حملے بھی ہوئے۔

1740 میں والد کے انتقال کے بعد عبدالوہاب نے نجد کے چھوٹے سے بازار قصبہ درعیہ (Diriyah) کا رخ کیا، جہاں مقامی سردار محمد بن سعود کی حکومت تھی۔ عبدالوہاب نے ان سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی، لیکن بن سعود ایک متنازع عالم دین سے ملاقات کے لیے ہچکچاہے تھے۔ بن سعود کی جاگیر انتہائی غریب تھی اور آمدنی کے ذرائع محدود تھے، ان کے اثر و رسوخ کا دار و مدار چند قریبی کنوؤں کی ملکیت پر تھا۔ بالآخر ان کی بیوی نے انہیں عبدالوہاب سے ملنے اور ان کا موقف سننے پر آمادہ کیا۔ ابتدائی طور پر محمد بن سعود، عبدالوہاب کی تشریحات سے مشکوک تھے، لیکن انہیں زکوٰۃ کی رقم میں سے حکمران کے حصے کا تصور پسند آیا۔

آخر کار دونوں کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا، جس میں مذہبی اور انتظامی اختیارات کی صاف تفریق کی گئی۔ اس معاہدے کے مطابق، عبدالوہاب اور ان کی نسل کو تمام مذہبی امور پر اختیار حاصل ہوگا، جبکہ محمد بن سعود اور ان کی اولاد کو ریاست کے انتظامی معاملات پر اختیار حاصل رہے گا۔

یہ تاریخی اور انقلابی اتحاد بن سعود کو مذہبی جواز کا ایک نیا ذریعہ اور زکوٰۃ کی صورت میں مالی فائدہ بھی فراہم کرتا تھا۔ اس کے بدلے میں عبدالوہاب کو مکمل تحفظ دیا گیا اور انہیں اپنے نظریات کی تبلیغ کے لیے ایک مضبوط پلیٹ فارم فراہم کیا گیا۔ اس معاہدے نے انہیں ان لوگوں کے خلاف جہاد کرنے کا بھی مکمل اختیار دیا، جو ان کی تعلیمات کی مخالفت کرتے تھے۔ یہ اتحاد دونوں رہنماؤں کے لیے فائدہ مند ثابت ہوا۔

ابن سعود کو اس سے یہ موقع ملا کہ وہ اپنی چھوٹی سی جاگیر کی سرحدوں کو وسیع کرتے ہوئے جزیرہ نماعرب کے دوسرے علاقوں پر قبضہ کرے، جبکہ عبدالوہاب کو اس منفرد اتحاد کی بدولت اسلام کے بیانیے کو قرآن و سنت کی بنیاد پر از سر نو مرتب کرنے کا موقع ملا۔ بعد کی تاریخ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب نہ ہوتا اگر یہ اتحاد نہ ہوتا۔

سعود و وہاب اتحاد کا آغاز بستیوں سے جنگجو بھرتی کرنے کی مہم سے ہوا۔ جیسا کہ متوقع تھا، کئی حلقوں کی طرف سے سخت مخالفت ہوئی، کیونکہ لوگ وہابیت یا اپنی صدیوں پرانی روایتی اسلامی اقدار میں کسی قسم کی تبدیلی کے خلاف تھے۔ اس جوڑی نے سخت طریقے اپنائے اور لوگوں کو آل سعود کے نئے حکمران کی اطاعت پر مجبور کیا۔ جو لوگ مزاحمت کرتے، ان پر ظلم، حملے اور قتل کے ذریعے قابو پایا جاتا۔

جب اس اتحاد کو مقامی آبادی میں پذیرائی ملنے لگی، تو انہوں نے ایک مستقل جنگی لشکر تیار کیا، جس کی بنیاد عبدالوہاب کی نظریاتی تعلیمات پر تھی۔ بظاہر وہابیت نے بدوی خانہ بدوشوں اور مقامی آبادیوں کے درمیان ایک ایسا مذہبی میل ملاپ قائم کیا، جو سخت گیر اسلامی عقائد کو رسمی عبادات کی شدت کے ساتھ یکجا کرتا تھا۔

1972 تک، ابن سعود کے بیٹے، عبدالعزیز، کی قیادت میں قائم اس اتحاد نے ریاض، خرج اور قصیم کے صوبوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ نئی فتح شدہ بستیوں میں وہابی قاضی کو نئے حکمران کا نمائندہ مقرر کیا جاتا، تاہم امیر نے پرانی بستیوں کے سرداروں کو ان کے عہدوں پر برقرار رکھا، بشرطیکہ وہ زکوٰۃ ادا کریں، جو ان کی اطاعت کی علامت ہوتی۔ اس اتحاد نے جزیرہ نماعرب کے وسطی اور جنوبی علاقوں پر اپنی مضبوط گرفت قائم کر لی تھی اور اب ان کا منصوبہ شیعہ مسلم آبادی والے علاقوں جیسے حجاز پر قبضہ کرنے کا تھا، جو وہابی نظریے کے مطابق اہل بدعت (ahl-al-Bida) کے علاقے سمجھے جاتے تھے۔ تاہم، 1797 تک، حجاز، قطیف، قطر اور بحرین مکمل طور پر سعودی امیر کے قبضے میں آچکے تھے۔

عثمانی خلافت اور پہلی سعودی ریاست

نئی طاقت حاصل کرنے کے بعد آل سعود حکمرانوں نے اپنی توجہ حجاز کی جانب مرکوز کی، جو ہر

سال حج کے ذریعے ایک بڑی آمدنی کا ذریعہ تھا۔ حجاز، جہاں اسلام کے دو مقدس ترین شہر مکہ اور مدینہ واقع ہیں، 1517ء سے سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھا۔ عثمانی سلطان نے اپنے لیے حنام الحرمین الشریفین کا لقب بھی اختیار کر رکھا تھا، جو اسلام کے محافظ کی حیثیت کی علامت تھی۔ آل سعود کے حکمران نے عثمانیوں پر اسلامی اصولوں کی خلاف ورزیوں کے متعدد الزامات عائد کیے، جن میں بدعنوانی، شراب نوشی، اماموں اور اولیاء کی قبروں کی تعظیم شامل تھی، جنہیں اس نے غیر اسلامی قرار دیا۔

اسی دوران، وہابی روایت میں حنبلی عالم ابن تیمیہ کی تحریروں بھی شامل کر لی گئیں۔ ابن تیمیہ کے نظریات نے یہ نظریاتی جواز فراہم کیا کہ اگر کوئی حکمران اسلام کے تقاضے پورے نہ کرے تو اس کے خلاف بغاوت جائز ہے۔ وہابی سعودی جنگجوؤں نے شدید مزاحمت کے باوجود 1803ء میں حجاز پر قبضہ کر لیا۔ فتح کے بعد، سعودی افواج نے بین النہرین (Mesopotamia) پر حملہ کیا، کربلا میں واقع شیعہ مزارات کو تباہ کیا اور وہاں ہزاروں شیعہ باشندوں کو قتل کر دیا۔

تاہم، اُسی سال، کربلا کے حملے کے بدلے میں آل سعود کے حکمران عبدالعزیز کو شیعہ کارکنوں نے قتل کر دیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ نجد کی بستیوں میں سعودی مہم کی توسیع کی سب سے اہم وجہ وہابیت تھی، ایک ایسی نظریاتی قوت جو اپنے پیروکاروں کو ”راہِ خدا“ میں جنگ پر ابھارتی تھی۔ بد قسمتی سے نئی سعودی۔ وہابی ریاست زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔

1811ء میں سلطنت عثمانیہ نے ایک بڑی فوجی مہم روانہ کی، جس کی قیادت ابراہیم پاشا کے سپرد کی گئی۔ بدو سعودی جنگجو، تربیت یافتہ اور مکمل ہتھیاروں سے لیس عثمانی افواج کا مقابلہ نہ کر سکے۔ آخر کار 11 ستمبر 1818ء کو جب درعیہ میں آل سعود کا مرکزی کیمپ تباہ ہو گیا، تو یا تو سعودی جنگجو مارے گئے یا پھر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوئے۔ عثمانی سلطان کے حکم پر وہابی علماء اور سعودی امیر، عبداللہ بن سعود کو پھانسی دے دی گئی۔

کچھ برسوں بعد، جب سلطنت عثمانیہ کمزور ہونے لگی، تو عرب جزیرہ میں بھی عثمانی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔ 1824ء میں سابق امیر عبداللہ بن سعود کے بیٹے، ترکی بن عبداللہ کو ایک بار پھر

سعودی - وہابی اتحاد کو زندہ کرنے اور خطے پر کنٹرول قائم کرنے کا موقع ملا۔ ترکی بن عبداللہ سخت وہابی نظریات کا حامل تھا، لیکن اس نے حملے صرف چھوٹے اور معاشی لحاظ سے غیر اہم علاقوں تک محدود رکھے۔ اس نے حجاز پر حملہ کرنے کی جسارت نہیں کی، کیونکہ وہاں اب بھی عثمانی افواج کا کنٹرول برقرار تھا، اور ہر سال حج کے موقع پر ہزاروں غیر ملکی مسلمان وہاں آتے تھے، جس سے عثمانی گورنر اور مقامی لوگوں کو خاطر خواہ آمدنی ہوتی تھی۔

1834 میں ترکی بن عبداللہ کو ایک خاندانی جھگڑے کے نتیجے میں قتل کر دیا گیا اور اس کے بیٹے فیصل نے امارت سنبھالی۔ 1837 میں جب فیصل نے حجاز پر عثمانی اقتدار کو تسلیم کرنے سے انکار کیا، تو اسے گرفتار کر کے قاہرہ بھیج دیا گیا جہاں اسے قید کر لیا گیا۔ اس کے بعد عثمانیوں نے آل سعود خاندان کے خالد کو جنوبی نجد کا حکمران مقرر کیا، مگر اسے بھی جلد ہی خاندان کے ایک اور فرد نے قتل کر دیا۔

آل سعود خاندان کے درمیان شدید باہمی جھگڑے اور اقتدار کی کشمکش نے عرب جزیرہ میں ان کے اقتدار کو کمزور کر دیا، خاص طور پر اقتصادی لحاظ سے اہم علاقے حجاز میں۔ نجد کے علاقے میں آل سعود کے حریف ”راشدی امارت“ نے طاقت پکڑی اور 1893 میں آل سعود خاندان کو شکست دے کر انہیں کویت جلا وطن کر دیا۔

سعودی عرب کی جدید تاریخ کا آغاز دراصل کویت سے ہوا، جب آل سعود خاندان کے عبدالعزیز بن عبدالرحمن، جو عام طور پر ابن سعود کے نام سے مشہور ہیں، نے اپنے جلاوطنی کے دور میں ایک حکمت عملی تیار کی تاکہ ریاض کو دوبارہ فتح کیا جاسکے۔ انہوں نے مذہبی سرگرم کارکنوں، جنہیں اخوان (قبائلی جنگجو) کہا جاتا تھا، کی مدد سے اور کرائے کے فوجیوں کے ذریعے ریاض پر حملہ کیا، اور حیرت انگیز طور پر بغیر زیادہ جانی نقصان کے شہر کو فتح کر لیا۔ اس کامیابی کے بعد ابن سعود کو ریاض کا حکمران مقرر کیا گیا۔

اس کے بعد انہوں نے اپنے خاندان کے کھوئے ہوئے علاقے، جو اب بن راشد کے قبضے میں تھے، دوبارہ حاصل کرنے کی مہم شروع کی۔ سلطنت عثمانیہ نے بن راشد کی افواج کو ابن سعود کے خلاف لڑنے کے لیے مالی امداد اور اسلحہ فراہم کیا۔ تاہم، رفتہ رفتہ عثمانی سلطنت اپنی طاقت کھو

رہی تھی اور عرب جزیرہ پر اس کا کنٹرول کمزور پڑ رہا تھا۔

اسی دوران برطانیہ نے، جو اُس وقت مشرق وسطیٰ میں عثمانی سلطنت کے ساتھ سیاسی غلبے کی دوڑ میں تھا، مبینہ طور پر ابن سعود کی حمایت کی۔ برطانوی سرپرستی میں ابن سعود نے جزیرہ نمسا عرب کے بڑے حصے پر اپنی حکمرانی قائم کر لی۔

مئی 1913 میں، عثمانی سلطنت اور سعودی امیر ابن سعود کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا، جس کے تحت ابن سعود کو نجد کا گورنر تسلیم کر لیا گیا۔

اینکلو سعودی معاہدہ

الاحساء کے صوبے پر قبضے کے بعد ابن سعود کو دو بڑے چیلنجز کا سامنا تھا۔ اول، مشرقی علاقہ شیعہ مسلمانوں کی اکثریت پر مشتمل تھا، اور ابن سعود کے لیے یہ ایک مسئلہ تھا کہ انہیں اپنی سعودی ریاست میں کیسے ضم کیا جائے۔ ابن سعود نے الاحساء کے شیعہ علما سے ایک معاہدہ کیا کہ اگر وہ اس کی اطاعت قبول کریں تو انہیں مذہبی آزادی دی جائے گی۔ تاہم، یہ وعدہ کبھی پورا نہ ہوسکا، کیونکہ ابن سعود کی حکومت سے منسلک وہابی عناصر شیعوں کو بدعتی اور گمراہ سمجھتے تھے۔

دوسرا بڑا مسئلہ ابن سعود کے اپنے حامی، اخوان تھے۔ اخوان، جو سخت وہابی نظریات کے پیروکار تھے، شیعوں سے کسی بھی قسم کے سمجھوتے کے سخت مخالف تھے اور انہوں نے ابن سعود پر وہابی عقائد کو نرم کرنے کا الزام لگایا۔ برطانوی حکومت بھی ابن سعود پر نالاں تھی کیونکہ اس نے 1913 میں سلطنت عثمانیہ کے ساتھ ایک معاہدہ کر کے نجد پر حکمرانی کا حق حاصل کیا تھا۔

لیکن پھر پہلی عالمی جنگ کا آغاز ہوا، جو ابن سعود کے لیے ایک سنہری موقع ثابت ہوا۔ عثمانی سلطنت، جو اب کمزور ہو چکی تھی، جزیرہ نما عرب سے نکلنے کے بہانے تلاش کر رہی تھی۔ چنانچہ 1914 میں ابن سعود اور عثمانیوں کے درمیان ایک دوسرا معاہدہ ہوا، جس کے تحت آل سعود خاندان کو نجد پر وراثتی حکمرانی کا حق ملا، بشرطیکہ وہ جنگ میں عثمانیوں کی فوجی مدد کریں۔

مگر دسمبر 1915 میں ابن سعود نے اس عثمانی معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے

اینگلو سعودی معاہدہ کر لیا۔ اس معاہدے کے تحت برطانیہ نے ابن سعود کو اس کے تمام علاقوں کے لیے فوجی تحفظ دینے کا وعدہ کیا۔ مزید برآں، برطانیہ نے ابن سعود کو مالی امداد اور اسلحہ بھی فراہم کیا تاکہ وہ اپنے پرانے حریف، بن راشد کے خلاف جنگ جاری رکھ سکے۔

پہلی عالمی جنگ کے خاتمے کے باوجود جزیرہ نما عرب میں اقتدار کی جنگ ختم نہ ہو سکی۔ بدوی افواج، ابن سعود اور بن راشد نے اپنے اپنے علاقوں میں کنٹرول مضبوط کیا۔ کئی برسوں تک جاری رہنے والی خونریز لڑائیوں کے بعد، ابن سعود کی افواج نے بالآخر 1925 میں حجاز کے قیمتی علاقے پر قبضہ کر لیا اور مکہ و مدینہ جیسے مقدس شہروں کو فتح کر لیا۔

1926 کے اوائل میں، امریکا اور برطانیہ کی حمایت سے ابن سعود نے خود کو ”بادشاہ حجاز“ اور ”سلطان نجد“ قرار دیا، جو بعد میں جدید سعودی عرب کی بنیاد بنی۔ برطانوی حکومت نے 1927 میں ایک اور معاہدہ کیا، جس میں ابن سعود کی مکمل خود مختار حکومت کو تسلیم کیا گیا اور اسے اپنے جانشینوں کے انتخاب کا حق دیا گیا۔ اس معاہدے کے تحت، ابن سعود کو خطے میں برطانوی سرپرستی میں موجود ریاستوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات برقرار رکھنا تھے۔ نئی قائم شدہ سعودی سلطنت نے برطانوی فضائیہ کی مدد سے 1929 میں اخوان تحریک کو کچل دیا، جو اس کے لیے ایک بڑا خطرہ بن گئی تھی۔ اس کامیابی کے بعد ابن سعود کی حکمرانی مزید مضبوط ہو گئی، اور سلطنت کے تمام ممکنہ داخلی مخالفین کا صفایا ہو گیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب آل سعود کی قیادت میں وہابی نظریات پر مبنی سعودی عرب کی جدید سلطنت پوری طرح ابھر کر سامنے آئی۔

جدید مملکت سعودی عرب

1932 میں شاہ عبدالعزیز بن عبدالرحمن آل سعود نے جزیرہ نما عرب میں تمام مزاحمتوں کو کچل کر مملکت سعودی عرب کی بنیاد رکھی۔ صرف ایک سال بعد، انہوں نے اسٹینڈرڈ آئل کمپنی آف کیلیفورنیا (جو آج کل شیورون کے نام سے جانی جاتی ہے) کے ساتھ ایک معاہدہ کیا تاکہ مملکت کے شیعہ اکثریتی مشرقی علاقے میں تیل کی تلاش کی جاسکے۔ یہ معاہدہ دراصل امریکہ کی خطے میں تیل کی تلاش کے بہانے معاشی اور سیاسی مداخلت کا نقطہ آغاز تھا۔

بعد ازاں، بحرین میں قائم ایک عیسائی مشن ”ریفارم چرچ“ نے بادشاہ کو امریکیوں کے ساتھ مزید روابط استوار کرنے کا مشورہ دیا۔ اسی چرچ کے طبی شعبے کو پہلی مرتبہ مملکت میں داخلے کی اجازت دی گئی تاکہ فوجی اہلکاروں کا علاج کیا جاسکے اور خود بادشاہ کو جدید طبی سہولیات فراہم کی جائیں۔

آل سعود خاندان کو جلد ہی احساس ہوا کہ امریکی رویہ برطانویوں کے مقابلے میں زیادہ غیر رسمی، خوش مزاجی اور مساوات پر مبنی ہے، جو اسلامی تصور مساوات (مساوات) سے قریب تر ہے۔ یہی وجہ تھی کہ عام عرب عوام بھی امریکیوں کی طرف جلد مائل ہو گئے۔

امریکی نائب وزیر خارجہ، جارج میگلے نے شاہ عبدالعزیز کے ساتھ خفیہ ملاقاتیں کیں، جس کے نتیجے میں ایک اہم سیکیورٹی معاہدہ طے پایا۔ اس معاہدے کے تحت طے پایا کہ امریکہ سعودی عرب کو کمیونسٹ خطرات سے محفوظ رکھے گا؛ اور برطانوی حمایت یافتہ ہاشمی حکومتوں (اردن و عراق) کے ممکنہ حملوں سے بھی مملکت کا دفاع کرے گا۔

امریکہ کے ساتھ تعلقات کو مضبوط بنانے کے لیے شاہ عبدالعزیز نے تیل کی تمام مراعات صرف امریکی کمپنیوں کو تفویض کر دیں، برطانوی کمپنیوں کو اس عمل سے مکمل طور پر الگ رکھا اور دمام میں امریکہ کو پہلا فضائی اڈہ قائم کرنے کی اجازت دی تاکہ مملکت کی سلامتی کو یقینی بنایا جاسکے۔

دوسری عالمی جنگ نے امریکہ کو یورپ کے محاذ جنگ میں اتحادی افواج کے رہنما کے طور پر داخل کر دیا۔ صدر روز ویلٹ کی حکومت کو یہ احساس ہونا شروع ہوا کہ تیل جنگ کے دوران اور اس کے بعد ایک انتہائی اہم عنصر بننے جا رہا ہے۔ 1943 میں امریکہ اور سعودی عرب کے درمیان ایک خصوصی تعلق جنم لینے لگا۔ صدر روز ویلٹ نے اعلان کیا کہ ”سعودی عرب کا دفاع، امریکہ کے دفاع کے لیے ناگزیر ہے۔“

یہ بیان بہت سے امریکیوں کے لیے حیران کن تھا، جنہوں نے شاید پہلے کبھی سعودی عرب کا نام بھی نہ سنا ہو۔ صدر کے سکرٹری برائے بحریہ، ولیم ناکس نے مارچ 1944 میں کانگریس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ جنگ نے امریکی حکومت کو تیل کی مسلسل فراہمی کی اہمیت کا گہرا احساس دلایا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ جنگ کے بعد کے دور میں امریکہ کو اپنے سرحدوں سے

باہر تیل کے وسائل تلاش کرنے ہوں گے، کیونکہ یہ امریکہ کی سلامتی اور بقاء کے لیے ناگزیر ہوگا۔ یہی وہ بنیادی وجہ تھی کہ امریکی حکومت نے صحرا میں واقع اس مملکت، سعودی عرب، میں گہری دلچسپی لینا شروع کی۔

1943 میں کیلیفورنیا کی اسٹینڈرڈ آئل کمپنی نے سعودی عرب میں تیل دریافت کیا، لیکن تیل سے حاصل ہونے والی آمدنی آنے میں کچھ وقت لگا۔ ابتدائی برسوں میں بادشاہ ریاستی اخراجات کے لیے تیل کمپنیوں سے قرضہ لیا کرتے تھے۔ فروری 1945 میں صدر فرینکلن ڈی روز ویلٹ اور شاہ عبدالعزیز کی ملاقات مصر کی گریٹ بٹر لیک پر لنگر انداز امریکی جنگی بحری جہاز USS Quincy پر ہوئی۔ اسی ملاقات کے بعد سے امریکہ اور سعودی عرب کے درمیان ایک تزویراتی (strategic) تعلق قائم ہو گیا۔ اس معاہدے کے تحت، امریکہ نے سعودی شاہی خاندان کو تحفظ فراہم کیا، اور اس کے بدلے میں سعودی عرب نے امریکی تیل کمپنی کو مملکت میں کام کرنے کی اجازت دی۔ 1950 میں، کیلیفورنیا میں قائم ایک امریکی کمپنی بیکٹل (Bechtel) نے مشرقی سعودی عرب میں واقع غوار آئل فیلڈ سے تیل لے جانے کے لیے ایک 1000 میل طویل پائپ لائن تعمیر کی۔ یہ پائپ لائن اردن اور شامی گولان کی پہاڑیوں سے گزرتی ہوئی لبنان کے شہر صیدا (Sidon) تک پہنچتی تھی، جہاں سے امریکی اور مغربی خریداروں کو تیل کی ترسیل کی جاتی تھی۔

امریکہ - سعودی اتحاد کو درپیش چیلنجز

امریکہ اور سعودی عرب کے درمیان تاریخی طور پر قریبی تعلقات نے سرد جنگ کے دوران سوویت یونین کے خلاف جنگ میں مذہب کو بطور ہتھیار استعمال کرنے کی امریکی حکمت عملی کو جنم دیا، جس میں سعودی عرب اور پاکستان امریکہ کے فطری اتحادی بن گئے۔ ویتنام کی شکست سے امریکہ نے یہ سبق سیکھا کہ دشمنوں سے براہ راست لڑنے کے بجائے غیر ملکی سرزمین پر پراکسی افواج کے ذریعے جنگ لڑی جائے۔ سوویت یونین کے خلاف سعودی عرب قدرتی طور پر اس لیے موزوں تھا کیونکہ وہ ہمیشہ کمیونزم کا مخالف رہا، جسے مذہب دشمن نظریہ تصور کیا جاتا تھا، اور پاکستان بھی زیادہ تر وہابی سنی آبادی پر

مشتمل ہونے کی وجہ سے کمیونزم کا مخالف اور امریکہ کا اتحادی تھا۔ 1945 سے جب امریکہ-سعودی تعلقات کا جدید دور شروع ہوا، دونوں ممالک نے مختلف محاذوں پر اپنے باہمی مفادات کے تحفظ کے لیے قریبی اتحاد قائم رکھا۔ اس اتحاد کی بنیاد ”تحفظ کے بدلے تیل“ کے اصول پر رکھی گئی تھی، جس کے تحت سعودی عرب امریکہ کو مناسب سیاسی و معاشی نرخوں پر تیل کی فراہمی یقینی بناتا اور امریکہ بدلے میں مملکت سعودی عرب کی داخلی و خارجی سلامتی کی ضمانت دیتا۔ تاہم وقت کے ساتھ، خاص طور پر امریکہ میں شیل گیس کی دریافت کے بعد، اس فارمولے میں نمایاں تبدیلیاں آئیں۔ اس کے باوجود، امریکہ آج بھی سعودی عرب کو جو دنیا کا سب سے بڑا خام تیل پیدا کرنے والا ملک ہے، عالمی منڈی میں تیل کی قیمتوں پر قابو پانے کی اپنی حکمت عملی کا ایک اہم حصہ تصور کرتا ہے۔

سلامتی کے اس فارمولے کے تناظر میں، امریکہ نے اپنی اسٹریٹجک ترجیحات کو ہندرج ایشیا کی جانب منتقل کیا، جس کا حصہ صدر اوباما کی جانب سے شروع کیا گیا ’Pivot to Asia‘ نامی مشرقی ایشیائی خارجہ پالیسی پروگرام تھا، جو بعد میں صدر ٹرمپ کی انتظامیہ نے بھی جاری رکھا۔ گزشتہ چالیس برسوں میں امریکہ کے دیگر اہم مقاصد میں ایران کو عالمی سطح پر تنہا کرنا اور سعودی عرب کو ہر سال اربوں ڈالر کے فوجی ساز و سامان کی فروخت شامل رہی ہے۔ تاہم امریکہ-سعودی تعلقات کا سب سے نچلا مقام نائن الیون کے دہشت گرد حملے کے بعد سامنے آیا، کیونکہ حملہ آوروں اور اس حملے کی منصوبہ بندی کرنے والوں کی اکثریت سعودی شہریوں پر مشتمل تھی، جو ایک بین الاقوامی دہائی-سلفی تحریک سے تعلق رکھتے تھے وہی نظریہ جسے سعودی حکومت نے اندرون و بیرون ملک مساجد سے منسلک اتوار اسکولوں اور مدارس کے جال کے ذریعے فروغ دیا تھا۔ ایران میں امریکہ مخالف اسلامی انقلاب کے بعد سعودی عرب نے امریکہ کے ساتھ مضبوط تعلقات قائم کرنے کی جو کوششیں کیں، وہ بظاہر مخلص نظر آئیں، لیکن درحقیقت ان کی اصل نیت شیعہ نظریات کا توڑ تھا۔ اس وقت کے امریکی پالیسی سازوں نے یہاں تک سوچا کہ سعودی عرب کے سنی اسلام کو ایران کے شیعہ اسلام کے خلاف صف آرا کر دیا جائے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ وہی شدت پسند نظریہ جسے سعودی حکومت نے امریکی خاموش حمایت سے دنیا

بھر میں پھیلا یا، آنے والے برسوں میں مسلم معاشروں کو شدید حد تک انتہا پسندی کی طرف لے گیا۔ القاعدہ اور اس سے منسلک تنظیمیں اسی پرانی سعودی حکمت عملی کی پیداوار ہیں، جس کے تحت وہابی۔ سلفی نظریہ اسلام کی مرکزی تعبیر کے طور پر پیش کیا گیا۔ 1990-91 کی خلیجی جنگ امریکہ۔ سعودی تعاون کی معراج تھی، جب سعودی عرب میں تعمیر کردہ ستر سالہ فوجی اور شہسری انفراسٹرکچر کو استعمال کرتے ہوئے، امریکہ نے آدھی ملین فوج کی مدد سے صدام حسین کو کویت سے پسپا کیا اور خلیج فارس میں سابقہ صورتحال کو بحال کر دیا۔

ممنوعہ اخوان گروہ، جو گہرائی سے وہابی۔ سلفی جہادیت سے وابستہ تھا، نے ایک عرب ملک اور عرب قوم پرست رہنما صدام حسین پر امریکی حملے کو ذلت آمیز قرار دیا۔ اخوان سے منسلک عرب دانشوروں اور حامیوں کا ماننا تھا کہ سعودی حکومت کو اپنی 'مقدس سرزمین' کو استعمال کرنے کی اجازت کسی عرب ملک کے خلاف جنگ کے لیے نہیں دینی چاہیے تھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب سنی اسلام کے پیروکاروں نے امریکہ اور مغربی قوتوں کے خلاف بیانیہ قائم کرنا شروع کیا۔ اگرچہ سعودی حکومت چاہتی بھی، تب بھی سلفی جہادیت کا نظریاتی اور تنظیمی طور پر سامنا کرنا اس کے لیے سیاسی طور پر بہت مہنگا پڑتا، کیونکہ اس کے لیے سلفیت کی داخلی طور پر نئی تعریف پیش کرنا پڑتی، جو جہاد کے نظریے سے گہری جڑی ہوئی ہے، اور اس طرح وہابیت کی بنیادوں کو متزلزل کر سکتی تھی، وہابیت جو اٹھارہویں صدی سے سعودی اقتدار کا نظریاتی ستون بنی ہوئی ہے۔

تاہم جیو پولیٹیکل مفادات کا تقاضا تھا کہ نائن الیون کے بحران کے بعد بھی سعودی عرب اور امریکہ کے درمیان تعاون جاری رہے۔ لیکن حقیقت میں، واشنگٹن کے مشرق وسطیٰ پر مہارت رکھنے والے تھنک ٹینکس نے پہلی بار یہ تسلیم کیا کہ پُر تشدد سلفی جہادیت کا مقابلہ کرنا ضروری ہے، کیونکہ یہی نظریہ دنیا بھر میں مسلم معاشروں میں امریکہ مخالف اور مغرب مخالف بیانیے کی بنیاد ہے۔

راک فیملر برادرز فنڈ کے صدر اسٹیفن ہائٹز نائن الیون حملے سے شدید متاثر ہوئے، کیونکہ یہ حملہ عرب افراد، جن میں اکثریت سعودی شہریوں کی تھی، کی قیادت میں کیا گیا اور اس کی منصوبہ بندی اور نفاذ براہ راست اسامہ بن لادن نے کیا، جو سعودی بن لادن خاندان سے تعلق رکھتا تھا،

جس کے سعودی شاہی خاندان سے قریبی تعلقات رہے ہیں۔ بن لادن خاندان کی ملکیت میں سعودی عرب کی سب سے بڑی تعمیراتی کمپنیوں میں سے ایک ہے، جس نے مملکت کے تمام محلات اور اہم سرکاری عمارات تعمیر کی ہیں۔ 2001 کے آخر میں، ایک ایسے وقت میں جب کہ امریکہ کی توجہ القاعدہ کے بڑھتے خطرات پر مرکوز تھی راک فیلر برادرز فنڈ نے نیویارک سٹی کے شمال میں واقع اپنے پوکانٹیکو سینٹر میں ایک خصوصی بورڈ اجلاس منعقد کیا تاکہ مشرق وسطیٰ کے لیے نئی حکمت عملیوں پر غور کیا جاسکے۔ اس اجلاس میں خصوصی مدعو افراد میں سے ایک سید حسین نصر بھی تھے، جو جارج واشنگٹن یونیورسٹی، واشنگٹن ڈی سی میں ایرانی نژاد پروفیسر ہیں۔ اس نشست کے دوران، اسٹیفن ہائمنز کو پروفیسر نصر نے ایران کی جغرافیائی و تزویراتی اہمیت اور اس کے علاقائی سنی عرب ممالک سے تعلقات کی پیچیدگیوں پر قائل کیا۔ اس کے بعد راک فیلر فنڈ نے اقوام متحدہ کی امریکی شاخ (United Nations Association of the USA) کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے ایران پر وجیکٹ شروع کرنے کا فیصلہ کیا، جو اقوام متحدہ کے پروگراموں کو فروغ دینے والا ایک غیر منافع بخش واشنگٹن میسڈ تھنک ٹینک ہے۔ اس ایران پر وجیکٹ میں ان سابقہ امریکی سفارت کاروں کو شامل کیا گیا، جنہوں نے ماضی میں ریپبلکن انتظامیہ کے تحت خدمات انجام دی تھیں۔ یو این فاؤنڈیشن کے صدر ویلیم لیورز نے اقوام متحدہ میں ایران کے مشن کے ذریعے ایرانی سفارت کار جواد ظریف سے رابطہ کیا۔ 2002 کے اوائل میں ایران پر وجیکٹ نے تہران کے انسٹی ٹیوٹ برائے سیاسی و بین الاقوامی مطالعات کے ساتھ ملاقات کا بندوبست کیا، جو حکومت کے قریب ایک تھنک ٹینک ہے۔ یہ ملاقات اسٹاک ہوم انٹرنیشنل پیس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی سرپرستی میں اسٹاک ہوم کے نواح میں منعقد ہوئی۔

یہ پہلا اجلاس ایرانی اور امریکی شرکاء کے درمیان ہوا۔ ایرانی وفد مخصوص نکات کے ساتھ آیا اور دودن کے مباحثے کے بعد بغیر کسی معاہدے کے اجلاس اختتام پذیر ہوا۔ اس ابتدائی نشست کا مقصد واشنگٹن اور تہران کے درمیان مستقبل کی شراکت داری کے لیے ایک روڈ میپ تیار کرنا تھا۔ اس پر وجیکٹ سے منسلک امریکی شرکاء وہائٹ ہاؤس اور اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کو تمام پیش

رفت سے آگاہ رکھتے رہے۔ لیکن یہ یورپی دارالحکومتوں میں ہونے والی خفیہ ملاقاتیں 2005 میں اس وقت معطل کر دی گئیں، جب محمود احمدی نژاد ایران کے صدر منتخب ہوئے، جو سخت گیر تصور کیے جاتے تھے۔ ان کے دورِ صدارت میں امریکی وفد نے جواد ظریف سے اپنے تعلقات کو پس پردہ رکھا۔ تاہم، 2013 میں صدر حسن روحانی کے انتخاب اور جواد ظریف کے وزیر خارجہ بننے کے بعد، مذاکرات کا عمل دوبارہ شروع ہوا۔

تقریباً 20 ماہ کی مسلسل کوششوں اور 17 دن کی روزانہ طویل میٹنگز کے بعد، امریکی وفد کی قیادت اُس وقت کے سیکریٹری آف اسٹیٹ جان کیری نے کی، جبکہ ایرانی وفد کی قیادت جواد ظریف اور دیگر اہم اسٹیک ہولڈرز نے کی۔ بالآخر 14 جولائی 2015 کو یانامیں ایک معاہدہ طے پایا، جس کے تحت ایران کی ایٹمی صلاحیت کو اگلے 15 برسوں تک محدود کیا گیا۔ اس معاہدے کے مخالفین اور حامیوں دونوں کے پاس مضبوط دلائل موجود تھے۔ کئی ناقدین، جن میں ریپبلکن اراکین کانگریس، ڈونلڈ ٹرمپ جیسے صدارتی امیدوار اور کچھ ڈیموکریٹ رہنما بھی شامل تھے، اس معاہدے میں بہت سی کمزوریاں دیکھتے تھے۔ بظاہر، سعودی عرب اور اسرائیل کی قیادت میں عرب ریاستیں اس معاہدے کی شدید مخالف تھیں، کیونکہ ان کے مطابق ایران اپنی تیل کی دولت کو شیعہ عسکری تنظیموں کی مدد کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔ مقتول سعودی تجزیہ کار جمال خاشقجی نے اس صورتحال کو نہایت جامع انداز میں بیان کیا تھا کہ:

”پابندیوں کے ساتھ ایران مسلسل دوسری کی مانند ہے، لیکن اگر یہ پابندیاں ہٹ گئیں تو ایران ایک علاقائی طاقت کے طور پر ابھرے گا اور مشرق وسطیٰ کی سیاست کو نئے سرے سے ترتیب دے گا۔“

دوسری جانب، ایران اور امریکہ کے درمیان ہونے والا معاہدہ بظاہر ایران کی عسکری صلاحیت کو محدود کرتا ہے، لیکن اقوام متحدہ کی پابندیوں کے خاتمے کے نتیجے میں اس کی معیشت کو زبردست تقویت بھی بخشتا ہے، جو اسے دنیا کی معیشت سے جوڑ دے گا۔ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عرب خطے میں امن کی واپسی ہوگی، تاہم تجزیہ کاروں کا خیال ہے کہ اس معاہدے کے بعد

جوہری پھیلاؤ کی دوڑ کو ایک نیا دھچکا لگے گا، اور سعودی عرب و اسرائیل جیسے بڑے کھلاڑی اس میدان میں قدم رکھیں گے۔

اسرائیلی وزیراعظم بنجمن نیتن یاہو نے اس معاہدے پر سخت ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے اسے ”حیران کن تاریخی غلطی“ قرار دیا اور عزم ظاہر کیا کہ وہ ایران کی جوہری خواہشات کو روکنے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے۔ امریکی کانگریس کے اسپیکر جان بینر نے بھی اس معاہدے کو ناقابل قبول قرار دیا۔ اس کے برعکس، صدر اوباما نے اپنے خطاب میں واضح کیا کہ یہ معاہدہ اعتماد پر نہیں بلکہ ”تصدیق پر مبنی“ ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ معاہدہ امریکہ، اس کے اتحادیوں اور دنیا کے لیے بہترین آپشن ہے تاکہ ایران کو عالمی برادری کے ساتھ جوڑا جاسکے۔

یہ معاہدہ سعودی عرب اور اسرائیل کو ایک دوسرے کے قریب لایا، جیسا کہ کہا جاتا ہے: ”دشمن کا دشمن، دوست ہوتا ہے۔“ اس وقت سعودی عرب یمن میں حوثی بغاوت میں الجھا ہوا ہے، اور یہ کوئی راز نہیں کہ حوثیوں کو ایران کی حمایت حاصل ہے۔ سعودی عرب کے پاس مالی قوت ہے اور اسرائیل کے پاس ٹیکنالوجی۔ دونوں مل کر سعودی عرب کے لیے ایک عرب جوہری بم بنانے کے منصوبے پر کام کریں گے۔ اس سے اسرائیل کی علاقائی حکمت عملی کو تقویت ملے گی تاکہ ایران کے خلاف طاقتور عرب ریاستوں کو متحد کیا جاسکے اور فلسطین۔ اسرائیل تنازعے پر سے عالمی دباؤ ہٹا دیا جائے۔ آج یہودی قیادت کو ایک سفارتی کامیابی حاصل ہوئی ہے، کیونکہ مشرق وسطیٰ کی جغرافیائی سیاست میں پہلی بار توازن مکمل طور پر اسرائیل کے حق میں ہو چکا ہے۔

اسرائیل اور سعودی عرب کے درمیان اسٹریٹیجک شراکت داری آنے والے برسوں میں فروغ پائے گی، اور سائنس دان جلد ہی سعودی مالی معاونت سے جوہری بم کی تیاری پر کام شروع کریں گے۔ امریکہ نے ایران کے ساتھ جوہری معاہدہ کر کے مشرق وسطیٰ سے اپنے فوجی انخلاء کی راہ ہموار کر لی ہے اور ایران۔ عرب خلیج کو استعمال کرتے ہوئے اپنی حکمت عملی کو کامیابی سے آگے بڑھایا ہے۔

سعودی عرب اور اس کے علاقائی اتحادی ایران کو خطے میں بدامنی کا ذمہ دار سمجھتے ہیں، خصوصاً شام میں بشار الاسد کی حمایت، لبنان میں حزب اللہ اور عراق میں شیعہ ملیشیاؤں کے ذریعے اس

کی مداخلت کو۔ عرب تجزیہ نگاروں کا ماننا ہے کہ ایران کے ساتھ جو ہری معاہدہ، جس سے امریکی رویے میں نرمی ظاہر ہوتی ہے، 9/11 کے بعد مشرق وسطیٰ کی پالیسی میں بڑا رخ موڑ ہے۔ امریکی پالیسی سازوں نے سنی-شیعہ قوتوں کے درمیان ایک نیا توازن قائم کرنے کی کوشش کی ہے، اور شام، یمن اور عراق میں داعش کے خلاف لڑنے کا کام ایران کو سونپ دیا ہے۔

سعودی عرب نے 2003 میں عراق پر امریکی حملے کے خلاف بُش انتظامیہ پر سیاسی دباؤ ڈالنے کی کوشش کی تھی کیونکہ وہ اس حملے کے نتائج سے بخوبی واقف تھا۔ سعودی حکومت جانتی تھی کہ صدام حکومت کے خاتمے کے بعد عراق میں مکمل شیعہ غلبہ قائم ہوگا، کیونکہ وہاں کی 60 فیصد آبادی شیعہ ہے۔ نئی شیعہ حکومت قدرتی طور پر ایران کی اتحادی بن جائے گی، اور ایران ایک سے زائد عرب دارالحکومتوں میں اپنا اثر قائم کر لے گا۔ سعودی عرب کو خدشہ تھا کہ مشرقی سعودی عرب، بحرین میں شیعہ بغاوت اور یمن میں حوثی-زیدی تحریک کو ایسے حالات میں احسناتی تقویت حاصل ہوگی، جو سلطنت کے لیے سنگین خطرہ ثابت ہو سکتا ہے۔

عالمی جہاد کا نظریاتی ماخذ

1962 میں، سعودی عرب نے اسلام کی تبلیغ کے لیے ایک بین الاقوامی غیر سرکاری تنظیم ”مسلم ورلڈ لیگ“ (MWL) قائم کی۔ تاہم، وقت کے ساتھ ساتھ یہ ادارہ پوری دنیا میں وہابی اسلام کی ترویج کا مرکزی ذریعہ بن گیا۔ جہاں کہیں مسلمان بڑی تعداد میں آباد تھے، وہاں اس کے دفاتر قائم کیے گئے۔ سعودی وزارت مذہبی امور نے وہابی مکتبہ فکر کے تحت قرآن کے ترجمے اور دیگر درسی کتب و لٹریچر شائع کر کے دنیا بھر میں تقسیم کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک پوری نئی نسل ایسی پروان چڑھی جو چیزوں کو متعصب، فرقہ وارانہ نظریات کے ساتھ دیکھتی تھی اور دیگر مذاہب کے خلاف ایک منفی رویہ رکھتی تھی۔

رفتہ رفتہ، عالمگیریت نے دنیا کی معیشت کو باہم جوڑ دیا، عالمی مواصلاتی نظام کو ایک سطح پر لے آیا اور قومی سرحدوں کی اہمیت کم ہوتی چلی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ مختلف علاقائی اور بین الاقوامی تنظیموں نے عالمی نظام پر اثر ڈالنا شروع کر دیا۔ اکیسویں صدی میں غیر ریاستی عناصر کی طرف

سے قومی سلامتی کو غیر معمولی خطرات لاحق ہوئے، اور شدت پسند مذہبی تنظیموں میں بے پناہ اضافہ دیکھنے کو ملا، جن میں القاعدہ سب سے نمایاں ہے۔ سعودی حکومت، آل سعود خاندان کی قیادت میں اور محمد بن عبدالوہاب کی نسل سے تعلق رکھنے والے علما کی زیر نگرانی، دنیا بھر میں وہابی سلفی اسلام کے فروغ میں مصروف رہی۔

مصری شدت پسند اسلامی رہنما، محمد عبدالسلام فرج، جنہیں 1982 میں صدر انور سادات کے قتل کی سازش میں ملوث ہونے پر سزائے موت دی گئی، نے کہا تھا: ”اسلامی ریاست کا قیام ہر مسلمان پر فرض ہے، اور اگر یہ جنگ کے بغیر ممکن نہ ہو تو پھر جہاد ہر مسلمان پر واجب ہے۔“ ان کے ماننے والے یہ بھی کہتے تھے کہ جہاد ایک انفرادی فرض ہے، جس کے لیے ماں باپ سے اجازت لینے کی بھی ضرورت نہیں، بالکل اسی طرح جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔

1998 میں القاعدہ کے سربراہ اسامہ بن لادن اور ان کے نائب ایمن الظواہری نے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا، اور تمام مسلمانوں پر مسجد اقصیٰ کو اسرائیلی قبضے سے آزاد کروانے کے لیے جنگ لازم قرار دی۔ خود کش حملوں کی ایک سلسلہ وار مہم، جو بن لادن کی نگرانی میں انجام دی گئی، میں القاعدہ نے کینیا اور تنزانیہ میں امریکی سفارت خانوں پر حملہ کیا، جس میں 213 افراد مارے گئے اور تقریباً 4000 زخمی ہوئے۔ ان حملوں نے القاعدہ کو ایک عالمی دہشت گرد تنظیم کے طور پر منظر عام پر لا کھڑا کیا، اور امریکہ واس کے اتحادیوں کو ایک واضح پیغام دے دیا۔

امریکی صدر بل کلنٹن کی انتظامیہ نے افغانستان میں القاعدہ کے تربیتی کیمپوں پر حملہ کر کے جوابی کارروائی کی، لیکن لگتا ہے کہ امریکی حکومت نے اس تنظیم کی طاقت اور منصوبہ بندی کو کم تر سمجھا۔ القاعدہ نے امریکہ کے کچھ مشہور ترین مقامات جیسے ورلڈ ٹریڈ سینٹر، پینٹاگون اور کپیتل ہل پر حملے کا تفصیلی منصوبہ تیار کر رکھا تھا۔ ان حملوں کے ذریعے القاعدہ دنیا، بالخصوص امریکہ کو یہ پیغام دینا چاہتی تھی کہ اسلام کو کمزور یا دبا یا نہیں جاسکتا، اور اگر ضرورت پڑی تو وہ زبردست جواب دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

11 ستمبر 2001 کو، عرب نسل سے تعلق رکھنے والے 19 خودکش حملہ آوروں نے، جو تربیت یافتہ پائلٹ تھے، مشرقی امریکہ سے مغربی ساحل کی طرف جانے والے چھ مسافر طیارے اغوا کیے، جن میں بڑی مقدار میں ایوی ایشن فیول موجود تھا۔ ان طیاروں کو بطور ہتھیار استعمال کرتے ہوئے حملہ کیا گیا۔ دو طیارے نیویارک کے ٹوئن ٹاورز سے ٹکرا دیے گئے، جس میں 3000 سے زائد بے گناہ امریکی شہری مارے گئے۔ پینٹاگون پر حملے میں بھی سو سے زائد افراد حباں بحق ہوئے، جب کہ چوتھا طیارہ، جو ممکنہ طور پر واشنگٹن ڈی سی کے کسی اور اہم مقام کو نشانہ بنانے والا تھا، خوش قسمتی سے راستے ہی میں کریش کر گیا۔

دنیا بعد میں کئی ممالک جیسے انڈونیشیا، ترکی، اسپین اور برطانیہ میں دہشت گرد حملوں کی گواہ بنی۔ 2003 میں امریکہ کے عراق پر حملے کے بعد، القاعدہ اور اس سے منسلک تنظیموں نے خودکش حملہ آوروں کی تیاری کا عالمی نظام قائم کیا، اور ان سب کا مشترکہ عقیدہ یہ تھا کہ ایک ایسی اسلامی ریاست قائم کی جائے جو شریعت کے قوانین پر مبنی ہو اور جس کی قیادت ایک خلیفہ کرے۔

سابق امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن نے سعودی عرب کی طرف سے ”دنیا بھر میں انتہا پسند مدرسوں اور مساجد کی کھلی حمایت“ پر تنقید کی تھی، جنہوں نے ”ذہین، اعلیٰ تعلیم یافتہ یونیورسٹی گریجویٹس اور پروفیشنلز کو انتہا پسندی کے راستے پر ڈال دیا۔“ انہوں نے سعودی عرب کو دنیا میں دہشت گردی کا سب سے بڑا معاون قرار دیا۔

بھارتی- کشمیری نژاد امریکی فرح پنڈت، جنہوں نے امریکی وزیر خارجہ کے تحت مسلم ممالک کے لیے پہلی امریکی ایجنسی کے طور پر خدمات انجام دیں، نے 80 سے زیادہ ممالک کے دوروں کے بعد مشاہدہ کیا کہ سعودی مالی طاقت نے اسلام کی روایتی صوفی سنی برداشت پر مبنی روایت کو مکمل طور پر ختم کر دیا ہے۔ ان کا یہ تجزیہ درست ہے کہ وہ صوفی روایت، جو مسلم ممالک میں صدیوں سے پروان چڑھی تھی، اب ایک عدم برداشت پر مبنی وہابی سلفی اسلام نے ہڑپ کر لی ہے، اور دنیا آج اس کے نتائج مختلف شکلوں میں بھگت رہی ہے۔ مغربی معاشروں میں نوجوان مسلمان وین، کاریاٹرک کو ہتھیار بنا کر بے گناہ شہریوں کو کچل رہے ہیں تاکہ دہشت پھیلائی جاسکے۔

بار بار ایسے شواہد سامنے آئے ہیں کہ سعودی فنڈنگ سے چلنے والی مساجد اور امام، متوسط طبقے کے کیریئر پسند مسلمان نوجوانوں کو شدت پسندی کی طرف راغب کرتے ہیں۔ تقریباً تمام صحافی اور ٹی وی تجزیہ نگار سعودی عرب کو جہادی تشدد کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ مشہور بھارتی-امریکی ٹی وی تجزیہ کار فریڈز کریا نے مشاہدہ کیا ہے کہ سعودی عرب نے ”اسلامی دنیا میں ایک عفریت پیدا کر دی ہے۔“

اب یہ بات تقریباً عالمی سطح پر تسلیم کی جا چکی ہے کہ سعودی عرب گزشتہ کئی دہائیوں سے دنیا کو ایک سخت گیر، متعصب، مردانہ غلبے پر مبنی اور انتہا پسند نظریہ برآمد کر رہا ہے، جو عالمی اسلامی انتہا پسندی کو ہوا دے رہا ہے۔ واشنگٹن میں قائم معروف تھنک ٹینک ”بروکنگز انسٹی ٹیوشن“ کے اسلام اور امریکہ تعلقات پر مبنی پروجیکٹ کے رکن ولیم مکینٹس نے لکھا ہے کہ سعودی عرب ایک انتہائی زہریلا اسلام فروغ دے رہا ہے، جو غیر مسلموں پر حملے کو جائز قرار دیتا ہے اور پر تشدد جہاد کو مذہبی جواز فراہم کرتا ہے۔

سعودی اثر و رسوخ کی رسائی حیران کن ہے، یہ تقریباً ہر اس ملک تک پہنچ چکی ہے جہاں مسلمان بڑی یا چھوٹی تعداد میں آباد ہیں: سویڈن کے ”گو تھن برگ مسجد“ سے لے کر چاڈ کی ”کنگ فیصل مسجد“، تنک، لاس اینجلس کی ”کنگ فہد مسجد“ سے لے کر جنوبی کوریا کی ”سیول سینٹرل مسجد“ تک۔ ان تمام مساجد کی تعمیر یا تو سعودی شاہی خاندان کے ارکان، سعودی خیراتی اداروں، یا سعودی مالی امداد سے چلنے والے اداروں جیسے ”ورلڈ مسلم لیگ“ اور ”ورلڈ اسمبلی آف مسلم یوتھ“ کی مدد سے ہوئی ہے۔ سعودی اثر و رسوخ کس طرح ظاہر ہوتا ہے، یہ اکثر اس ملک کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات پر بہت زیادہ منحصر ہوتا ہے۔

براعظم افریقہ اور جنوب مشرقی ایشیا کے کئی علاقوں میں سعودی تعلیمات نے مسلم برادریوں کے ثقافتی رویوں کو واضح طور پر متاثر کیا ہے، اور مجموعی طور پر انہیں ایک حد سے زیادہ قدامت پسند سمت کی طرف دھکیل دیا ہے۔ وہاں کی خواتین سختی سے اپنے سروں کو حجاب سے ڈھانپتی ہیں، مرد بغیر مونچھ کے داڑھیاں رکھتے ہیں اور پاجامے یا پتلون ٹخنوں سے اونچی پہنتے ہیں۔ کئی

جگہوں پر عورتیں سیاہ چادروں میں اپنے جسم کا ہر انچ ڈھانپ لیتی ہیں، صرف آنکھوں کے لیے ایک باریک سوراخ چھوڑتی ہیں۔ شمالی امریکہ اور یورپ کی مسلم مہاجر برادریوں میں، پہلی اور دوسری نسل مکمل طور پر سعودی اسلام سے متاثر ہو چکی ہے۔ جنوبی ایشیا کے کئی ملک جیسے بھارت، بنگلہ دیش، سری لنکا، پاکستان اور افغانستان میں سلفی عقائد رکھنے والے افراد شیعہ اور صوفی سنی مسلمانوں کے خلاف مکمل طور پر متعصب ہو چکے ہیں۔

خود کش حملہ آور افغانستان، مالی اور پاکستان میں صوفی بزرگوں کے مزارات اور شیعہ مساجد کو نشانہ بنا رہے ہیں، جہاں سیٹروں بلکہ ہزاروں مسلمان جاں بحق ہو چکے ہیں۔ امریکہ اور یورپ کے کئی مغربی ممالک جیسے برطانیہ، فرانس اور سویڈن میں، سعودی طرز کا سنی اسلام یہودی اور عیسائی عقائد کو بدھ تنقید بناتا ہے، جبکہ مسلمان اپنے بچوں کو مغربی ثقافت سے متاثر ہونے کے خوف سے ہوم اسکولنگ کی طرف مائل کرتے ہیں۔

ترکی کے ایک سینئر اسلامی عالم دین مہمت گورمز نے ایک انٹرویو میں کہا: ”وہابی تعلیم اسلام کی وہ روایتی قدریں کمزور کر رہی ہے جو کثرت رائے، رواداری اور علم و سائنس کی پذیرائی پر مبنی رہی ہیں۔“ اسلامی ریاست (داعش) نے عبدالوہاب، جو کہ وہابی ازم کے بانی اور اٹھارہویں صدی کے سلفی نظریہ کے نمائندہ تھے، کی تمام کتب کو اپنے مدارس کے نصاب کا حصہ بنایا ہے۔ حتیٰ کہ مکہ کی عظیم مسجد کے امام نے بھی فخر سے کہا کہ ”اسلامی ریاست کے رہنما اپنے خیالات اور نظریات کے لیے وہابی ازم سے رہنمائی لیتے ہیں، جو سعودی عرب میں رائج ہے۔“

واشنگٹن ڈی سی میں موجود امریکی اسلامی ماہرین اور اسلام و مشرق وسطیٰ کے سفارتی ماہرین بخوبی جانتے ہیں کہ وہابی ”جہاں بینی“ کو سعودی عرب منظم انداز میں فنڈ کرتا ہے جس میں دینی درسی کتب، مسجدوں کی تعمیر، ٹی وی اسٹیشنز اور ائمہ کی تربیت شامل ہے۔ گزشتہ پانچ دہائیوں میں وہابی۔سلفی اسلام کے انتہا پسند بیانیے نے مسلمانوں کی سوچ اور طرز زندگی کو یکسر بدل کر رکھ دیا ہے۔

اب اہم سوال یہ ہے کہ سعودی عرب ایسا نظریہ کیوں پھیلا رہا ہے جسے دنیا کا بڑا حصہ ناپسند کرتا ہے؟ اس کا جواب ممکنہ طور پر اس تاریخی معاہدے میں پوشیدہ ہے جو سعودی ریاست کے بانیوں

نے ایک ایسے مذہبی عالم کے ساتھ کیا تھا جو کہ ملک بھر میں اپنے نظریے کو پھیلانے کے لیے انتظامی حمایت کا خواہاں تھا۔ یہ معاہدہ، جو فریقین کے لیے مفید تھا، آج بھی سعودی ریاست کی اساس ہے۔ سلفی عالم ابن عبدالوہاب کو اپنی تحریک کے لیے عسکری تحفظ فراہم کیا گیا، اور بدلے میں سعودی شاہی خاندان کو ایک اسلامی عالم کی حمایت ملی۔ وہاب کا اسلام کا تصور دو تاریخی حادثات میں سے پہلا تھا جس نے بعد ازاں سعودی اثر و رسوخ کو عالمی سطح پر متعین کیا۔ امریکی یونیورسٹی میں ابن خلدون چیئر کے حامل پروفیسر اکبر احمد وہابیت کو ”قبائلی صحرائی اسلام“ مترار دیتے ہیں۔ یہ ایک سخت گیر صحرائی ماحول میں تشکیل پایا جو کہ غیر ملکی عناصر سے خوفزدہ، مزارات و قبور سے سخت مخالف، فن و موسیقی سے نالاں، اور بغداد، بیروت اور قاہرہ کے کاسموپولیٹن اسلام سے یکسر مختلف تھا۔

دوسرا تاریخی حادثہ 1938 میں پیش آیا، جب امریکی تیل کی تلاش کرنے والوں نے سعودی عرب میں دنیا کے سب سے بڑے تیل کے ذخائر دریافت کیے۔ عرب امریکن آئل کمپنی (آرامکو) سے حاصل ہونے والے تیل کے منافع نے مملکت کو بے تحاشا دولت سے مالا مال کر دیا۔ لیکن اس دولت نے ایک ایسے سخت گیر سماجی و مذہبی ڈھانچے کو وقت میں منجمد کر دیا، جس نے سعودی حکمران طبقے کو ایک شاہانہ بحث دیا تاکہ وہ اپنے شدت پسند اسلام کو دنیا بھر میں برآمد کرے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ سعودی مذہبی علما و ائمہ کی ساکھ عالمی مسلم برادری میں بہت بلند مانی جاتی ہے، کیونکہ انہیں پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کے وطن سے تعلق رکھنے کی بنا پر اسلام کا بہت بڑا عالم سمجھا جاتا ہے۔ جب سعودی امام کسی غیر عرب مسلم ملک میں روایتی لباس زیب تن کیے، چیک بک ہاتھ میں لیے، قرآن و حدیث کے حوالوں کے ساتھ آتے ہیں، تو ان کا استقبال کسی مقبول ستارے کی طرح کیا جاتا ہے۔ حیرت زدہ مسلمان برادریاں ان کی طرف رہنمائی کے لیے دیکھتی ہیں، خاص طور پر ان معاشروں میں جہاں مختلف مذاہب اور ثقافتوں کے لوگ بستے ہیں۔ یہ ائمہ دوسروں مذاہب اور ثقافتوں سے عدم مفاہمت اور علیحدگی کی تعلیم دیتے ہیں۔ وہ وہابی۔ سلفی تشریح اسلام کو پھیلانے کا مشورہ دیتے ہیں اور غیر مسلموں کو اسلام مقبول کرنے کی

ترغیب دیتے ہیں۔

1979ء کا اسلامی انقلاب ایک انقلابی شیعہ حکومت کو ایران میں اقتدار میں لے آیا، جس نے علامتی طور پر سعودی عرب کی وہابی حکومت کو چیلنج کیا۔ اسلامی جمہوریہ ایران کے قیام کا اعلان مشرق وسطیٰ کی جدید تاریخ کے اہم ترین لمحات میں سے ایک تھا، کیونکہ اس نے اسلام کے دو بڑے مکاتب فکر 'سنی اور شیعہ' کے درمیان مسابقت کو نئی سطح پر پہنچا دیا۔ سعودی عرب نے ایران کے شیعہ ابھار کو عالم اسلام میں اپنی قیادت کے لیے ایک بڑے خطرے کے طور پر دیکھا۔ اس کے بعد سے سعودی اسٹیبلشمنٹ نے وہابیت کو دوسرے ممالک میں برآمد کرنے کی اپنی کوششوں کو دو گنا کر دیا، اور اس کے ساتھ ایک طاقتور شیعہ مخالف بیانیہ بھی پھیلایا۔

جب 1979 میں مکہ مکرمہ کی مسجد الحرام پر 500 سے زائد خوان انتہا پسندوں کے ایک گروہ نے قبضہ کر لیا، تو وہ کھلے عام سعودی حکمرانوں کو مغرب کی کٹھ پتلی اور اسلام کے غدار قرار دے رہے تھے۔ اگرچہ جلد ہی بغاوت کو کچل دیا گیا، لیکن سعودی علمائے کرام نے سلطنت کی حمایت اسی وقت دوبارہ قبول کی جب انہیں یہ یقین دہانی کرائی گئی کہ وہ مملکت میں بے راہ روی کے خلاف سخت کارروائی کریں گے اور وہابیت کو بیرون ملک جارحانہ انداز میں برآمد کیا جائے گا۔

امریکہ اور افغانستان

1980 کی دہائی میں امریکہ اور سعودی عرب نے مل کر سوویت یونین کو افغانستان میں شکست دینے کے لیے قریبی تعاون کیا۔ یہاں تک کہ صدر رونالڈ ریگن نے افغان اسلامک پارٹی کے رہنما گلبدین حکمت یار، جو کہ ایک شدت پسند اور مغرب مخالف ذہن کے جہادی تھے، کو وائٹ ہاؤس کے اوول آفس میں مدعو کیا۔ تاہم، نائن الیون کے بعد تمام افغان مجاہدین طالبان کے ساتھ مل گئے تاکہ امریکہ کے خلاف جنگ لڑ سکیں۔ 1986 سے 1992 کے درمیان امریکہ نے افغان مجاہدین اور افغانستان میں سرگرم غیر ملکی جہادیوں کو اسلحہ فراہم کرنے کے لیے پچاس ملین امریکی ڈالر سے زائد خرچ کیے۔ اس دوران اسامہ بن لادن، سعودی عرب اور یمن سے آئے

ہوئے سیکڑوں اخوانی رضا کاروں کے ساتھ پاکستان اور افغانستان میں سوویت قبضے کے خلاف لڑنے کے لیے یکپ لگا چکے تھے۔ غیر ارادی طور پر، امریکہ نے ان اسلامی جہادیوں کی مدد کی جو ایک نہایت سخت گیر اور وہابی اسلام پر یقین رکھتے تھے، جن میں خود بن لادن بھی شامل تھا۔ یہ تاریخ کے بار بار دہرانے والے المیوں میں سے ایک تھا کہ بعد میں امریکہ کو انہی نظریات کے خلاف اربوں ڈالر خرچ کر کے جنگ لڑنی پڑی جن کی کبھی خود اس نے سرپرستی کی تھی۔

امریکی حمایت کے نتیجے میں اسلامی جہادیوں کی طاقت میں اضافہ ہوا اور سوویت افواج کو بالآخر 15 مئی 1988 کو افغانستان سے پسپا ہونا پڑا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ریگن انتظامیہ کی مالی اور تکنیکی مدد نے افغانستان میں غیر ریاستی اسلامی جہادی قوتوں کو بے پناہ طاقت عطا کی، اور یہی قوتیں بعد ازاں عالمی سطح پر عدم استحکام کا باعث بنیں۔

نیا جہادی بریگیڈ، جو مختلف نسلوں اور خطوں سے تعلق رکھنے والے افراد پر مشتمل تھا، وہابی-سلفی نظریات سے متاثر ہو کر جلد ہی افغانستان اور پاکستان میں القاعدہ کی قیادت کے تحت ایک بڑے اتحاد میں شامل ہو گیا۔ اس طرح، امریکہ نے ایک ایسا خوفناک عفریت پیدا کی جو آنے والے برسوں میں خود اسی کے لیے ایک سنجیدہ خطرہ بن گئی۔ ریگن انتظامیہ نے سوویت افواج کے انخلا کے بعد سمجھا کہ افغانستان میں اس کا مشن مکمل ہو چکا ہے، اور جلد ہی اپنی سرپرستی ختم کر دی کیونکہ وہ سوویت اثر سے آزاد افغانستان میں جمہوریت کو فروغ دینے میں دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔ سالوں بعد، جارج ڈبلیو بوش انتظامیہ نے عراق میں بھی ایسی ہی غلطی دہرائی، جب ایک آمر حکومت کو زبردستی ہٹا کر امریکہ نے وہاں خلا پیدا کر دیا۔

سوویت افواج کے انخلا سے پیدا ہونے والے خلا نے افغانستان کو مختلف متحارب گروہوں کی جنگ کا میدان بنا دیا، جس سے ملک مکمل طور پر تباہی کا شکار ہوا۔ پاکستان کی فوجی اسٹیبلشمنٹ اور اس کی خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی نے اس ابھرتے ہوئے منظر نامے میں ایک موقع دیکھا اور چالاک سے سخت گیر سلفی مدارس کے نوجوان طلبہ (طالبان) کو افغانستان کی طرف دھکیلنا شروع کیا۔ یہ طلبہ افغان نژاد تھے، جو پاکستان و افغانستان کی بین الاقوامی سرحد کے قریب واقع مہاجر

کیمپوں میں قائم مدارس میں زیر تعلیم تھے۔ ان طلبہ کو پاکستانی فوجی افسران نے تربیت دی اور ٹینک، پک اپ ٹرک اور توپوں سے لیس کیا۔ 1990 کی دہائی میں پاکستانی افسران کی زیر نگرانی یہی نوجوان افغانستان میں فیصلہ کن قوت بن کر ابھرے۔

کابل میں ملا عمر کی حکومت آئی ایس آئی اور پاکستانی فوجی آپریشنوں کی براہ راست نگرانی میں قائم کی گئی۔ پاکستان اور سعودی عرب نے فوری طور پر اس نئی طالبان حکومت کو تسلیم کر لیا۔ یوں افغانستان پاکستان کا ”کلائنٹ اسٹیٹ“ بن گیا اور جہادیوں کی ایک نرسری بن گیا جہاں سے انھیں دنیا کے دیگر علاقوں، خاص طور پر ہندوستانی کشمیر، میں بھیجا جاتا۔ ملا عمر وہابی اسلام کے پیروکار تھے۔ سعودی حکومت اس پیش رفت سے خوش تھی اور اس نے طالبان حکومت کو اربوں ڈالر کی امداد دی۔ پاکستان کو بھی ہمسایہ وہابی حکومت کی حمایت کے بدلے میں دل کھول کر مالی امداد ملی۔ پاکستانی مبصرین نے افغانستان میں اس مداخلت کو ہندوستان کی مشرقی سرحد سے ممکنہ حملے کے پیش نظر ”اسٹریٹجک ڈپٹھ“ (تزویریاتی گہرائی) قرار دیا۔

مئی 1996 میں، امریکہ کی جانب سے سخت سفارتی دباؤ پر سوڈان کی حکومت نے اسامہ بن لادن کو ملک سے نکالنے پر آمادگی ظاہر کی۔ سعودی نژاد جہادی، جو خرطوم میں ایک تعمیراتی کمپنی کی آڑ میں اپنی امریکہ مخالف سرگرمیاں چلا رہا تھا، ایک چارٹرڈ طیارے میں افغانستان پہنچا، جہاں اسے حکومت کی طرف سے ایک خاص مہمان کا درجہ دیا گیا۔ اس نے اپنے بھائیوں کے لیے تحفے کے طور پر طالبان حکومت کو تقریباً 30 لاکھ امریکی ڈالر دیے۔ بدلے میں کابل نے اسے مکمل سیکورٹی اور تربیتی کیمپوں کے لیے زمین فراہم کی۔ یہ وہی علاقہ تھا جہاں اس نے سوویت قبضے کے خلاف مجاہدین کے ساتھ جنگ لڑی تھی۔ بن لادن نے یہاں اپنے جہادی پیغام کو از سر نو زندہ کیا اور امریکہ و مغرب کے خلاف اپنی تحریروں اور خطابات کو شدت بخش دی۔

لادن کی کرشماتی شخصیت نے یورپ اور مسلم دنیا سے 30000 سے زائد جہادیوں کو اس کے مختلف تربیتی کیمپوں کی طرف متوجہ کیا۔ ان تمام افراد کو افغانستان بھر میں قائم وسیع و عریض سہولیات میں آرام دہ طور پر رکھا گیا۔ 1990 میں جب امریکی افواج نے سعودی فضائی اڈے

سے عراق پر حملہ کیا تو بن لادن نے کھل کر سعودیوں کی مخالفت شروع کی۔ اس نے سعودی شاہی خاندان کو مرتد قرار دیا اور اس کے بعد سے وہ شدید طور پر امریکہ مخالف بن گیا۔

ابتدائی طور پر القاعدہ نے سعودی عرب میں نرم فوجی اہداف کو نشانہ بنایا اور آہستہ آہستہ وہ ایک طاقتور رہنما اور ملا عمر کے لیے سرپرست کی حیثیت سے ابھرا۔ اس نے اپنی سرگرمیوں کو منشیات اور انسانی اسمگلنگ تک بھی وسعت دی۔ اس کے باقاعدہ خطابات نے طالبان اور کابل کی ان کی حکومت کو مکمل طور پر انتہا پسند بنا دیا۔ طالبان نے عام افغان شہریوں پر وہابی اسلام کے سخت قوانین نافذ کیے۔

پاکستانی فوج اور آئی ایس آئی طالبان حکومت کو اس کے تباہ کن اہداف کی تکمیل میں مکمل معاون اور شریک کا رتھے۔ پاکستان نے باقاعدہ اپنی اور افغان دینی درسگاہوں (مدارس) سے پاکستانی و افغانی نوجوانوں کی بھرتی کر کے طالبان کو افرادی قوت فراہم کی، تاکہ طالبان کو مسلسل جنگجو میسر رہیں۔ محض جنگجو فراہم کرنے تک ہی محدود نہیں، بلکہ پاکستان نے ملا عمر کی حکومت کو فوجی ساز و سامان بھی فراہم کیا۔

القاعدہ نے 9/11 کے حملے سے یہ بات پوری دنیا پر واضح کر دی کہ وہ ایک عالمی دہشت گرد تنظیم کے طور پر نہایت منظم منصوبہ بندی اور بے مثال عملدرآمد کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ان کے کارندوں نے امریکہ میں فلائنگ کی تربیت حاصل کی، منصوبہ بندی کے اجلاس ملائیشیا میں منعقد ہوئے، جبکہ اس منصوبے کے قائدین جرمنی کے شہر ہیمبرگ سے تعلق رکھتے تھے۔ مالی وسائل دہی کے بینکوں کے ذریعے منتقل کیے گئے اور افغانستان میں موجود القاعدہ کی قیادت نے تمام سرگرمیوں کی نگرانی کی۔

9/11 کا حملہ القاعدہ اور اس کے پاکستانی و افغانی سرپرستوں کے لیے ایک بڑی کامیابی تھی۔ اس منظم حملے نے امریکہ کے قلب میں کئی اہم اہداف کو نشانہ بنایا۔ دنیا بھر میں اس حملے کو براہ راست دکھایا گیا اور کروڑوں لوگوں نے اسے دیکھا۔ عالمی برادری غصے اور صدمے میں ڈوب گئی۔ نیٹو (NATO) نے پہلی مرتبہ اپنے چارٹر کے آرٹیکل 5 کا اطلاق کیا، جس کے تحت تمام رکن ممالک نے

اجتماعی دفاع کا اعلان کیا۔ 7 اکتوبر کو امریکہ کی قیادت میں اتحادی افواج نے افغانستان پر حملہ کر دیا۔ امریکہ نے پاکستان اور دیگر عرب ممالک پر دباؤ ڈالا کہ وہ القاعدہ کے ان کارندوں کو گرفتار کریں جو مختلف شناختوں میں ان ممالک میں چھپے ہوئے تھے۔ امریکی کانگریس نے فوری طور پر یو ایس اے پیٹریاٹ ایکٹ (USA PATRIOT ACT) منظور کیا، جس کا مقصد دہشت گردی کی روک تھام کے لیے قانون نافذ کرنے والے اداروں جیسے ایف بی آئی کو وسیع تر تفتیشی اور نگرانی کے اختیارات دینا تھا۔

القاعدہ کے اندر کے بعض افراد نے اعتراف کیا کہ اسامہ بن لادن نے امریکہ کے مکمل ردِ عمل کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ اس نے یہ سوچا تھا کہ شاید امریکہ صومالیہ کی طرح مشرق وسطیٰ سے پیچھے ہٹ جائے گا یا طالبان کیمپوں پر چند کروڑ میزائل فائر کر کے بات ختم کر دے گا۔ لیکن دونوں اندازے غلط نکلے۔ امریکہ نے افغانستان میں بھرپور فضائی طاقت کے ساتھ مسلسل حملے جاری رکھے۔ ساتھ ہی پشاور وادی سے افغان نارڈن الائنس (Northern Alliance) کی افواج نے طالبان کے خلاف پیش قدمی کی۔ صدر بش نے پاکستان کو واضح پیغام دیا کہ اگر اس نے طالبان کو کسی قسم کی فوجی مدد فراہم کی تو وہ امریکہ کی شدید ناراضی کا سامنا کرے گا۔

امریکہ کی چشم پوشی

کیا 9/11 حملوں میں سعودی تعلق کو چھپانا اکیسویں صدی کی سب سے بڑی دانستہ چشم پوشی نہیں ہے؟ آخر صدر بش نے 9/11 کمیشن کی 800 صفحات پر مشتمل رپورٹ کے 28 صفحات کو بغیر کسی وضاحت کے سنسر کیوں کیا؟ یہ صفحات مکمل طور پر خالی چھوڑ دیے گئے تھے، وہ صفحات صرف نکتے لگا کر بھر دئے گئے، جہاں پہلے تقریباً 7200 الفاظ موجود تھے۔ سعودی عرب نے ہمیشہ یہ مؤقف اپنایا کہ القاعدہ نے یہ حملے ریاستی سرپرستی کے بغیر کیے، اور سعودی حکومت کا اس میں کوئی کردار نہیں۔

لیکن سی آئی اے نے ایسی ناقابلِ تردید شواہد حاصل کیے جن میں سعودی شاہی خاندان کے افراد، سابق سفارتکاروں اور انٹیلی جنس اہلکاروں کی جانب سے حملہ آوروں کو مالی اور عملی مدد فراہم

کیے جانے کا انکشاف ہوا۔ انٹیلی جنس فائلز کے مطابق واشنگٹن ڈی سی میں سعودی سفارتخانہ اور لاس اینجلس میں سعودی قونصل خانہ اس سازش میں ملوث پائے گئے، جس سے یہ حملہ محض دہشت گردی نہیں بلکہ ایک کھلا اعلان جنگ بن جاتا ہے۔

سعودی ایجنٹ اسامہ باسنان نے سان ڈیاگو میں حملہ آوروں کے لیے ایک محفوظ ٹھکانہ بنایا۔ انہیں رہائش، گاڑیاں اور ایک سعودی فنڈ مسجد کے امام انور العولقی سے ملاقاتیں کروائی گئیں۔ اس وقت کے امریکہ میں سعودی سفیر شہزادہ بندر اور ان کی اہلیہ نے باسنان کو 130000 امریکی ڈالر کے چیکس بھیجے۔ اگرچہ انہوں نے دعویٰ کیا کہ یہ رقم باسنان کی بیماری کی علاج کے لیے تھی، لیکن ایف بی آئی کی تحقیقات سے ثابت ہوا کہ یہ رقم حملہ آوروں کی مالی معاونت کے لیے استعمال ہوئی۔ اس کے علاوہ بھی القاعدہ کو دی جانے والی کئی رقم کا سراغ سفیر بندر اور سعودی سفارتخانے سے جوڑا گیا۔ یہاں تک کہ 2004 میں واشنگٹن ڈی سی کے معروف رگزیٹک نے سعودی شہریوں کا اکاؤنٹ کھولنے پر پابندی عائد کر دی۔ امام العولقی نے 2001 میں ورجینیا کے فالز چرچ علاقے میں واقع دارالجمہ مسجد اور اسلامک سینٹر کے امام کا منصب سنبھالا تھا۔ وہ تمام ہائی جیکرز سے مل چکا تھا اور اپنے رابطہ کاروں کے ذریعے ان کے لیے رہائش اور شناختی دستاویزات کا بندوبست کرتا تھا۔ وہ اسامہ بن لادن کا زبردست مداح تھا اور اس سے کئی بار ملاقات بھی کر چکا تھا۔ امام العولقی 9/11 حملے کی مکمل معلومات رکھتا تھا، اور حملوں سے کافی پہلے ایک سعودی پرواز کے ذریعے مشتبہ طور پر امریکہ سے فرار ہو گیا تھا۔ اُسے نیویارک کے جان ایف کینیڈی بین الاقوامی ہوائی اڈے پر مختصر وقت کے لیے حراست میں لیا گیا، لیکن جلد ہی اُسے سعودی سفارت خانے کے نمائندوں کی تحویل میں چھوڑ دیا گیا۔

سابق ڈیموکریٹ سینیٹر باب گراہم کو طویل عرصے سے شبہ تھا کہ کیلیفورنیا کی متعدد مساجد کے امام اور وہ مبلغین جو سعودی وزارت اسلامی امور، دعوت اور ارشاد کے تحت کام کرتے تھے، ہائی جیکرز اور سعودی ایجنٹوں کے درمیان سب سے مضبوط اور براہ راست کڑی تھے۔ اُن میں سے ایک مرکزی شخصیت فہد الثمیری تھا، جو لاس اینجلس کی کنگ فہد مسجد کا امام تھا اور امریکہ مخالف شدید نظریات کے لیے جانا جاتا تھا۔ الثمیری سعودی وزارت اسلامی امور، دعوت و ارشاد کا

ملازم بھی تھا۔ ایک اور اہم شخصیت اس آپریشن میں عمر البیومی تھا، جو اشمیری کا رابطہ کار تھتا اور سان ڈیاگو میں عرب کمیونٹی میں مشکوک انداز میں گھومتا پھرتا تھا۔ یہ دونوں افراد مل کر ہائی جیکرز کے خفیہ قیام اور امریکہ میں فلائٹ ٹریننگ پروگرامز کی سہولت کاری کر رہے تھے۔

مین ہیٹن میں قائم قانون داں ادارہ کریندرل اینڈ کریندرل، جو 9/11 کے متاثرین کے لواحقین کی جانب سے زرتلائی کے لیے نمائندگی کر رہا تھا، نے کئی ایسے شواہد پیش کیے جن سے ہائی جیکرز اور سعودی عرب کے درمیان روابط ثابت ہوتے تھے۔ اس سے قبل، اس ادارے نے، لی کریندرل کی سربراہی میں، جو امریکہ میں فضائی حادثات سے متعلق قانون کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں، 1998 کے پان ایم لوکربی بم دھماکے میں ہلاک ہونے والوں کی جانب سے شہری مقدمہ لڑا تھا، جس کا الزام لیبیا پر عائد کیا گیا تھا۔ اس کیس میں ادارے نے لیبیا کے خلاف کامیابی حاصل کی اور متاثرین کے لواحقین کے لیے 3 ارب امریکی ڈالر کا ہرجانہ منظور کرایا۔ 9/11 کے متاثرین کے رشتہ دار اس ادارے کی سابقہ کامیابیوں سے واقف تھے اور انہیں اُمید تھی کہ لی کریندرل اس کیس میں بھی مجرموں کو بے نقاب کریں گے۔ بدقسمتی سے، حملے کے صرف ایک سال بعد لی کریندرل کا فالج کے باعث انتقال ہو گیا۔ تاہم، کیس کی پیروی لی کے جانشین جم کریندرل نے جاری رکھی۔

1998 کے اواخر میں، القاعدہ کا ایک صومالی کارکن محمد سلیمان باری نے کراچی، پاکستان میں دہاشیل (Dahabshiil) نامی ایک صومالی بین الاقوامی ترسیلات زر کمپنی کی شاخ قائم کی۔ 9/11 حملوں کے ماسٹر مائنڈز میں سے ایک، خالد شیخ محمد، جو اُس وقت کراچی میں مقیم تھا، اسی ادارے کے ذریعے دیہی سے امریکہ رقم منتقل کر رہا تھا تا کہ ہائی جیکرز کی تربیت کے اخراجات پورے کیے جاسکیں۔ کریندرل لاء فرم کا موقف ہے کہ امریکی سفارت خانوں پر بم دھماکوں اور اس کے بعد امریکہ کی سختی کے باعث القاعدہ کے کارکنان نے مالی لین دین کے لیے بالواسطہ اور چکر دار راستے اختیار کیے، جس کی وجہ سے ان رقوم کی ترسیل کا سراغ لگانا مشکل ہوتا گیا۔

کریندرل لاء فرم کی طرف سے سعودی عرب کے خلاف دائر کردہ مقدمے کا انجام ابھی غیر یقینی

ہے۔ امریکی کانگریس نے ”جسٹس ایگینسٹ اسپانسرز آف ٹیررزم ایکٹ“ (JASTA) کے نام سے ایک قانون منظور کیا تاکہ 9/11 حملوں کے متاثرین کے اہل خانہ کو یہ قانونی حق حاصل ہو کہ وہ ان افراد کو جواب دہ ٹھہرا سکیں جو سعودی حکومت کا حصہ رہے ہوں اور جن پر حملوں میں کسی بھی طرح کے کردار کا شک ہو۔ صدر اوباما نے اس بل کو ویٹو کر دیا، یہ دلیل دیتے ہوئے کہ اس قانون سے ریاستی خود مختاری کا اصول ختم ہو جائے گا اور دنیا بھر میں تعینات امریکی فوجیوں کے خلاف قانونی کارروائیوں کی راہ ہموار ہو جائے گی۔ تاہم، کانگریس نے صدارتی ویٹو کو مسترد کرتے ہوئے بل کو منظور کر لیا۔

یہ بات سامنے آئی ہے کہ سعودی حکومت نے اس حوالے سے با اثر لابیگ فرمز کی خدمات حاصل کرنے پر کروڑوں ڈالر خرچ کیے ہیں۔ صدارتی مہم کے دوران صدر ٹرمپ نے اوباما کے ویٹو کو شرمناک قرار دیا تھا، لیکن صدر بننے کے بعد وہ بھی غالباً اسی سابقہ پالیسی پر واپس آ گئے۔ ان حالات میں یہ امکان بہت کم ہے کہ کریئڈر لاء فرم سعودی حکومت سے متاثرین کے لیے کسی قسم کی مالی تلافی حاصل کر سکے گی۔

امریکہ اور یورپ کے پالیسی ساز بخوبی جانتے ہیں کہ وہابی تعلیمات اور انتہا پسندی کے درمیان گہرا تعلق ہے، جو 9/11 جیسے دہشت گردانہ حملوں اور دنیا کے مختلف حصوں میں اکیلے شدت پسندوں کے ذریعے کیے جانے والے حملوں کا سبب بنتا ہے۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو وہابیت، جدیدیت اور آزاد خیال دنیا کے ترقی پسند انداز فکر کے خلاف کھڑی ہو کر، امریکہ اور مغربی تہذیب کے لیے ایک سنگین خطرہ بن چکی ہے۔

9/11 کے بعد، امریکہ کے پاس ایک موقع تھا کہ وہ وہابیت کو قابو میں لاتا، جیسا کہ اس نے عراق کے لیے جمہوری حکومت کا تصور پیش کیا تھا، ویسے ہی نظام سعودی عرب میں بھی نافذ کرتا اور بادشاہت کا خاتمہ کرتا۔ لیکن حیران کن سوال یہ ہے کہ صدر بش کو کس نے اس سازشی تیوری پر قائل کیا کہ عراق کے پاس تباہ کن ہتھیار موجود ہیں اور وہاں براہ راست مداخلت کے ذریعے حکومت کی تبدیلی ضروری ہے؟ یا تو صدر بش کے قریبی مشیروں کو سعودی شاہی خاندان نے بھاری رشوت

دے کر اصل توجہ ہٹانے پر آمادہ کیا، یا پھر وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ سعودی عرب میں حکومت کی تبدیلی سے دنیا بھر کے 1.2 ارب مسلمانوں کو ناراض کرنا امریکہ کے مفاد میں نہیں ہوگا۔

پوری دنیا اس حقیقت سے آگاہ تھی کہ 9/11 کے واقعے میں 19 حملہ آوروں میں سے 15 سعودی شہری تھے، اور سی آئی اے اور ایف بی آئی نے اس بھیانک واقعے میں ان کے کردار کے شواہد صدر لبش کی انتظامیہ کو فراہم کیے تھے۔ ان افراد میں شاہی خاندان کا ایک رکن اور وزارت مذہبی امور کے ملازمین بھی شامل تھے۔ تاہم، سعودی حکمرانوں نے ان افراد کو محض چند گمراہ عناصر قرار دے کر ان کے کردار کو نظر انداز کر دیا۔

دو جماعتی 9/11 کمیشن، جس کی صدارت تھامس کین اور نائب صدارت لی ہیملٹن کے پاس تھی، اس مقصد کے لیے قائم کیا گیا تھا کہ اس مبینہ سازش اور مختلف اداروں، بشمول غنیمت ملی حکومتوں کے ممکنہ کردار کی حقیقت کو بے نقاب کیا جاسکے۔ کمیشن نے اپنی تحقیق میں عراق یا ایران کو اس جرم سے براہ راست یا بالواسطہ طور پر جوڑنے کے کوئی شواہد نہیں پائے، کیونکہ یہ دونوں ممالک حملوں کی منصوبہ بندی کے دائرے میں شامل نہیں تھے۔ یہ جاننا نہایت اہم ہے کہ تمام حملہ آور سلفی، مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ سب سعودی عرب سے برآمد کردہ وہابی نظریے کے ذریعے انتہا پسندی کی طرف مائل اور شدت پسندی کے لیے تیار کیے گئے تھے۔ یہی عدم برداشت پر مبنی نظریہ آج بھی اُن تمام امریکی اور یورپی مساجد کا مرکزی بیانیہ ہے، جو سعودی سرمائے سے تعمیر ہوئیں اور جہاں شدت پسند اور امریکہ مخالف امام خطبے دیتے ہیں۔

یہ سوچنا سراسر سادہ لوحی ہے کہ 9/11 کے حملوں میں ایران کا کوئی کردار رہا ہوگا، کیونکہ وہابی مکتبہ فکر شیعوں کو گمراہ اور بدعتی سمجھتا ہے، اور یہ تصور کرنا کہ وہ کسی وہابی سازش میں ان کے شریک کار ہوں گے، تو بین آئیزبات ہوگی۔ جہاں تک عراق کا تعلق ہے، صدام حسین ایک سیکولر حکمران تھا، نہ کہ کوئی سخت گیر مذہبی شخص۔ تاہم، کویت پر اس کی چڑھائی کے بعد سعودی حکومت کو اس کے رویے سے شدید تشویش لاحق ہونے لگی، کیونکہ وہ خطے میں بالادستی کے عزائم رکھنے لگا تھا۔

سعودی عرب طویل عرصے تک 9/11 کیس کی چھان بین کرنے والی امریکی ایجنسیوں کے

لیے ایک معمہ بنا رہا۔ اصل سوال یہ نہیں تھا کہ اس سازش میں کس نے شراکت کی، بلکہ یہ تھا کہ وہ کون سی نظریاتی بنیاد تھی جس نے اس سازش کو جنم دیا۔ توجہ کا مرکز اُس وہابی اسلام کو ہونا چاہیے تھا، جو امریکہ میں موجود تمام مساجد، اتوار کے اسکولوں اور اسلامی مطالعاتی مراکز پر برسوں سے غالب آچکا تھا۔ یہی نظریہ نو جوان مسلمانوں کو شدید متعصب اور عدم برداشت پر مبنی جہاد یوں میں تبدیل کر رہا تھا، جو بے گناہ انسانوں کو سڑکوں پر مارنے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔

امریکی، یورپی دانشور اور رسول سوسائٹی کے افراد اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ وہابیت اسلامی انتہا پسندی کا اصل سرچشمہ ہے۔ تقریباً تمام دہشت گرد تنظیمیں اپنی فکری غذا وہابیت سے حاصل کرتی ہیں اور مالی معاونت سعودی عرب سے پاتی ہیں۔ صرف چند ایک استثنائی مثالیں جیسے حزب اللہ ہیں، جو شیعہ ایران سے منسلک ہیں، اور ان کا ہدف بھی مغرب سے لڑنا نہیں بلکہ شامی صدر بشار الاسد جیسے شیعہ نواز حکمرانوں یا یمن میں حوثیوں کی حمایت کرنا ہے۔

گزشتہ سولہ برسوں کے دوران تقریباً تمام دہشت گرد حملے، جن میں امریکہ میں نائن الیون، بوئین میراتھن بم دھماکہ، اور سان برنارڈینو فائرنگ شامل ہیں، کا تعلق براہ راست وہابیت سے رہا ہے۔ سعودی عرب میں تربیت یافتہ اماموں اور مساجد میں استعمال ہونے والے سلفی نصاب کے کردار کو امریکی حکومت کی اعلیٰ ترین سطحوں پر جان بوجھ کر چھپایا گیا۔ اکثر اوقات اس معاملے کو نرم رویے سے لیا جاتا ہے تاکہ تیل سے مالا مال سعودی عرب کے ساتھ امریکہ کے نازک اتحاد کو نقصان نہ پہنچے۔

یورپی پارلیمنٹ نے 2013 میں وہابیت کو عالمی دہشت گردی کا بنیادی ماخذ قرار دیا تھا۔ امریکی انتظامیہ اور اس کے بعد آنے والے تمام صدور کو یہ حقیقت تسلیم کرنی چاہیے۔ انہیں جان لینا چاہیے کہ وہابیت درحقیقت ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پیدا کی گئی بگاڑ ہے، ایک ایسی مکروہ شے جو سلطان کی طرح اسلامی دنیا میں پھیل چکی ہے اور اب دیگر مذاہب کے ساتھ اسلام کے تعلق کو تباہ کرنے کی دھمکی دے رہی ہے۔ وہابیت اسلام نہیں ہے، کیونکہ اسلام کبھی بھی قتل، لوٹ مار، ظلم و بربریت کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام آمرانہ طرز حکومت، ناانصافی، حرص و ہوس

اور انتہا پسندی کا مخالف ہے۔ اسلام ہر اس چیز کے خلاف ہے جو غیر معتدل ہو؛ اور وہ انصاف، رحمت، مہربانی اور ہمدردی کے اصولوں کا علمبردار ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ دنیا اس تلخ سچائی کو تسلیم کرے کہ جہادی دہشت گردی کا یہ بھیانک دیوبہایت کی ناجائز اولاد ہے، جس نے سعودی عرب میں جنم لیا اور عرب پٹرول ڈالرز کے خزانے سے پروان چڑھی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ جہادیوں کی مجرمانہ حرکتیں اکثر نئے نوآبادیاتی طاقتوں کے لیے بہانہ بن جاتی ہیں تاکہ وہ اپنی عسکری مداخلت کو جائز ٹھہرا سکیں۔

نہ صرف امریکہ اور یورپی اقوام، بلکہ ایشیائی ممالک بھی اس تباہ کن مذہبی بگاڑ یعنی وہابیت کے چنگل میں آ چکے ہیں۔ 2019 میں سری لنکا میں البیٹرسنڈے کے دن ہونے والے دہشت گرد حملے ایک شدت پسند وہابی مبلغ، زہران ہاشم، کی سازش تھے۔ وہ داعش کے نظریات کا پُر زور حامی تھا اور سلفی اسلام کے انتہا پسندانہ بیانیے کو تسلیم کرتا تھا۔ وہ اپنے وعظ آن لائن پلیٹ فارمز پر ڈال کر تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اپنی طرف راغب کرتا تھا۔ 2014 میں اس نے ”نیشنل توحید جماعت“ کے نام سے ایک تنظیم قائم کی، جس کا نظریہ سخت گیر وہابی روایت سے اخذ شدہ تھا، ایک ایسا تصور دین جو دعویٰ کرتا ہے کہ وہ بعینہ اس اسلام پر عمل پیرا ہے جو رسول اکرم ﷺ کے دور میں تھا۔ زہران کا عقیدہ تھا کہ سری لنکن مسلمانوں پر سیکولر سری لنکن قوانین کی بجائے شریعت نافذ ہونی چاہیے۔

زہران ہاشم نے غیر ملکی فنڈنگ سے اپنی ذاتی مسجد قائم کی اور ایک امیر ترین کاروباری خاندان کو شدت پسندی کی طرف مائل کرنے کو اپنا ہدف بنایا، کیونکہ یہ وہی طریقہ کار تھا جو اس سے پہلے بوٹن اور بعد میں استین میں انتہا پسندوں نے اپنایا تھا۔ محمد یوسف ابراہیم کولمبو میں مصالحہ جات کی برآمد کا ایک بڑا صنعت کار تھا۔ ابراہیم خاندان کے قریبی افراد کا کہنا ہے کہ اس کا چھوٹا بیٹا، الحام، خاندان کے باقی افراد کی نسبت زیادہ مذہبی رجحان رکھتا تھا، اور اس کی نوجوان بیوی فاطمہ مکمل نقاب کرتی تھی، جو سری لنکن مسلمانوں میں ایک غیر معمولی بات تھی۔ جبکہ بڑے بیٹے، انصاف ابراہیم، کو خاندانی کاروبار سنبھالنے کی تربیت دی جا رہی تھی۔ مگر زہران ہاشم نے دونوں بھائیوں کو اس حد تک ذہنی طور

پر متاثر کیا کہ وہ خود کش حملہ آور بن کر غیر مسلموں کو مارنے کے لیے رضا مند ہو گئے۔

وہابیت کی ایک نمایاں تعلیم دوسرے مذاہب سے نفرت کرنا ہے، اور یہ تعلیم فرد کے امیر یا غریب، تعلیم یافتہ یا غیر تعلیم یافتہ ہونے سے قطع نظر اثر رکھتی ہے۔ پولیس کو چند ہی گھنٹوں میں اس کاروباری خاندان کے اس حملے میں ملوث ہونے کا پتہ چل گیا، اور انہوں نے ابراہیم خاندان کی رہائش گاہ کو گھیر لیا۔ جب پولیس گیٹ پر پہنچی تو ایک عورت نے دروازہ کھولا، پھر اچانک پلٹ کر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ یہ الحام کی بیوی فاطمہ تھی۔ سیڑھیوں کی چوٹی پر، اپنے تین کم سن بچوں کے سامنے، فاطمہ نے خود کو دھماکے سے اڑا لیا، جس میں تین پولیس اہلکار، اس کے تمام بچے اور ایک آٹھ ماہ کا شیرخوار بچہ ہلاک ہو گیا۔ یہ واقعہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ الحام کا پورا خاندان اس مولوی کے ہاتھوں انتہا پسندی کا شکار ہو چکا تھا، اگرچہ یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ خواتین نے اس منصوبے میں کیا کردار ادا کیا۔ تاہم، فاطمہ کی شراکت واضح تھی، کیونکہ وہ پہلے ہی اس بات کے لیے تیار تھی کہ شوہر کی کارروائی کے بعد خود کو بم سے اڑا دے۔

اسلام نے عورت کو معاشرے میں اس کا جائز مقام عطا کیا ہے۔ آج کی مسلمان عورت بھی اپنی زندگی میں کامیاب ہونا چاہتی ہے، جیسا کہ ابتدائی اسلامی تاریخ کی کئی جری اور باصلاحیت خواتین نے مثالیں قائم کیں۔ سب سے نمایاں مثال خود حضرت خدیجہؓ کی ہے، جو رسول اکرم ﷺ کی زوجہ اور ایک کامیاب تاجرہ تھیں۔ لیکن وہابیت عورت کو ہر حق سے محروم رکھتی ہے اور چاہتی ہے کہ عورت صرف گھر کی چار دیواری میں محدود رہے۔

دنیا بھر میں پھیلی ہوئی 1.6 ارب سے زائد مسلم آبادی وہابی۔ سلفی اسلام کے محاصرے میں ہے۔ امریکہ اور یورپی ممالک کے لیے یہ لمحہ فکریہ ہے کہ وہ حقیقت کو پہچانیں اور سعودی عرب پر دباؤ ڈالیں کہ وہ اس خطرناک نظریے کی عالمی برآمد بند کرے۔ واحد متبادل یہ ہے کہ ایک منصوبہ بند حکمت عملی کے تحت اسلام کے ایک پرامن اور روا دار دھارے، جیسے تصوف، کا متبادل بیان پیش کیا جائے، اور دنیا بھر کی مسلم برادریوں، بشمول امریکہ، میں اس کے لیے واضح جگہ بنائی جائے۔

امریکہ اور یورپ جیسے خود مختار ممالک کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مراکش کی مثال کو سامنے رکھتے

ہوئے مساجد، اتوار اسکولوں اور ان سے منسلک ثقافتی مراکز میں اصلاحات نافذ کریں۔ 2007 میں مراکش کے شہر کاسابلانکا میں ہونے والے دہشت گرد حملے کے بعد، بادشاہ محمد ششم نے ملک کے مذہبی ڈھانچے پر مضبوط نگرانی قائم کی۔ انہوں نے تقریباً 6500 مساجد سے وہابی جھکاؤ رکھنے والے اماموں کو ہٹایا، دینی تعلیم کے نصاب سے متنازعہ اسباق کو نکالا، اماموں کی تربیت کے نظام میں اصلاح کی اور صوفی سنی اسلام کے معتدل نظریے کو فروغ دیا۔

روایتی اسلام، جس کی جڑیں فن، ثقافت اور جمالیات سے بھرپور ایک طویل تاریخ میں پیوست ہیں، وہ وہابیت کی حالیہ اور سخت گیر تشریح کو قبول نہیں کرتا ہے۔ آج دنیا کے مسلمانوں کے سامنے دو راستے ہیں: یا تو وہ پر امن تاریخی اسلام کو اختیار کریں، جو فن، موسیقی، سائنس، جمالیات اور کثرت تہذیب کا احترام کرتا ہے، یا پھر وہ سخت گیر، متعصب اور نفرت انگیز نظریات سے لبریز، سیاسی رنگ میں رنگا ہوا وہابی۔ سلفی اسلام اپنائیں۔

باب دوم

فرقہ وارانہ خلیجیں اور مشرق وسطیٰ کا مستقبل

مشرق وسطیٰ میں سنی مسلمانوں کی اکثریت مصر، اردن اور سعودی عرب میں تقریباً 90 فیصد پر مشتمل ہے۔ قطر، متحدہ عرب امارات، فلسطین، ترکی، افغانستان اور پاکستان میں بھی سنی مسلمانوں کی غالب اکثریت ہے، جبکہ یمن، شام اور کویت میں ان کی معمولی برتری ہے۔ اس کے برعکس، شیعہ مسلمان ایران میں آبادی کا تقریباً 95 فیصد ہیں؛ عراق، آذربائیجان اور بحرین میں ان کا تناسب 70 فیصد سے زیادہ ہے۔ لبنان میں وہ معمولی اکثریت رکھتے ہیں، جب کہ یمن، ترکی، کویت، شام، سعودی عرب، افغانستان اور پاکستان میں اقلیت میں ہیں۔ شیعیت کے اندر کئی ذیلی فرقے بھی موجود ہیں، جیسے شام میں علوی، ترکی میں علوی، یمن میں زیدی۔ حوثی، اور جنوبی ایشیا میں اسماعیلی بوہرہ۔

سنی اور شیعہ کے درمیان اختلاف بنیادی طور پر خلافتِ رسول اور جانشینی کے سوال پر ہے یعنی خلیفہ کی اہلیت، تقرری کا طریقہ، اور اس کے اختیارات و فرائض کی حدود کیا ہوں۔ تاہم، سنی۔ شیعہ اختلاف کا فیصلہ کن لمحہ سن 680 عیسوی میں عراق کے میدانِ کربلا میں پیش آنے والی جنگ تھی۔ یہ واقعہ شیعہ شناخت کے لیے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے، اور دنیا بھر کے شیعہ مسلمان ہر سال عاشورہ کے دن اس کی یاد مجلسیں منعقد کرتے ہیں۔

مشرق وسطیٰ میں فرقہ واریت نے ایک نیا موڑ اُس وقت لیا جب جنوری 1979 میں ایران میں اسلامی انقلاب برپا ہوا۔ اس انقلاب کی قیادت آیت اللہ خمینی نے کی، جنہوں نے محمد رضا پہلوی کے تحت قائم ایک سیکولر ریاست کو ہٹا کر ایک تھیوکریٹک (مذہبی) ریاست قائم کی۔ اس انقلاب نے سعودی عرب میں وہابی-سلفی مذہبی قیادت کو بھی شدید پریشان کیا، کیونکہ انہوں نے اس انقلاب کو نہ صرف اپنے خطے میں ایک خطرہ سمجھا بلکہ اسلامی دنیا میں اپنی قیادت کے لیے ایک بڑا چیلنج بھی محسوس کیا۔ ایران میں آنے والے اس انقلاب سے متاثر ہو کر عراق، لبنان، شام، بحرین اور یمن کے شیعہ مسلمانوں نے خود کو پہلے سے زیادہ پُر اعتماد محسوس کیا، اور انہوں نے روحانی اور سیاسی رہنمائی کے لیے تہران کی جانب دیکھنا شروع کر دیا۔

بہت سے عرب ممالک نے ایران کے ظہور کو خطے میں سنی بالادستی کے لیے ایک سنگین خطرہ تصور کیا۔ اس کے رد عمل کے طور پر، سعودی عرب میں وہابی-سلفی علما نے نومبر 1979 میں مسجد الحرام (مکہ مکرمہ) پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے سعودی شاہی خاندان کو دو ٹوک پیغام دیا کہ اب بہت ہو چکا، اب سعودی عرب کو واپس اسی سخت گیر اور خالص اسلامی اصولوں کی طرف لوٹنا ہو گا جو ابتدائی اسلامی دور میں رائج تھے، جنہیں سلفیت کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اگرچہ قابض افراد بعد میں گرفتار ہو کر سزا پا گئے، لیکن ریاض حکومت نے مکمل طور پر ان کے مطالبات کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور وہابی-سلفی علما کو اندرون ملک اور بیرون ملک اپنی نظریاتی تعلیمات پھیلانے کی کھلی اجازت دے دی۔ ان کے ذہن میں ایران کا شیعہ اسلامی انقلاب ایک مستقل خطرے کے طور پر موجود تھا، جس کا مقابلہ صرف ایک ہی صورت میں ممکن تھا کہ ایک شدت پسند سلفی نظریہ پورے خطے میں پھیلا یا جائے۔ دو مختلف نظریات ایک شیعہ انقلاب اور دوسرا مسجد الحرام پر قبضے کی صورت میں، نے مشرق وسطیٰ میں فرقہ واریت کی نئی لہر کو جنم دیا۔ بعد ازاں، 2001 میں افغانستان اور 2003 میں عراق پر امریکی حملوں کے بعد ایران کی علاقائی طاقت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ آج یمن، شام اور لبنان میں جاری تنازعات کی جڑ بھی فرقہ واریت ہی ہے، جہاں ایران اور سعودی عرب براہ راست آمنے سامنے ہیں۔

شیعت بحیثیت سرکاری مذہب

صفوی سلطنت کے بانی، شاہ اسماعیل اول (1501-1524) کی تاج پوشی 1501 میں ایران کے بادشاہ کے طور پر ہوئی۔ وہ آذربائیجان کے ترک زبان بولنے والے ایک شیعہ تھے، جو نہ صرف زبردست جنگجو تھے بلکہ ایک باصلاحیت شاعر بھی تھے، اور شیعہ عقیدے میں غیر معمولی یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ اب سے شیعہ اسلام ان کی سلطنت کا سرکاری مذہب ہوگا، اور ایران کی تمام سرزمین کو ایک حکمران کے تحت متحد کر لیا۔ صفوی سلطنت (1501-1772) کا آغاز صفوی سلسلہ صفویہ سے ہوا تھا۔ دیگر شیعہ مسالک کی طرح وہ بھی حضرت علیؑ (601-661)، جو شیعہ عقیدے کے مطابق پہلے امام ہیں، کی غیر معمولی عقیدت رکھتے تھے۔ صفوی حکمران شیعیت کے فروغ کے لیے بے پناہ جوش و جذبہ رکھتے تھے اور اس کے دائرہ اثر کو بڑھانے کے لیے پرعزم تھے۔ مغرب میں سنی عثمانیوں اور مشرق میں سنی مغلیہ سلطنت کے وہ سخت حریف بن گئے۔ بالخصوص عثمانی اور صفوی سلطنتیں مشرق وسطیٰ کے قلب میں غلبے کے لیے آپس میں برسرِ پیکار رہیں۔ یہ مسابقت وقت کے ساتھ فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر گئی، کیونکہ صفوی سلطنت ایک شیعہ سلطنت کے طور پر ابھری اور اس نے خود کو شیعیت کی محافظ قرار دیا۔ دوسری طرف، عثمانیوں نے، جو کچھ عرب علاقوں پر حکمرانی کر رہے تھے، 1517 میں استنبول کو دارالخلافہ بنا کر خلافت کا دعویٰ کیا اور اپنے آپ کو اہل سنت کا نمائندہ قرار دیا۔ تاہم، حقیقت یہ ہے کہ سولہویں صدی تک خلافت کی حیثیت زیادہ معنوی یا عملی نہ رہ گئی تھی کہ جس پر شیعہ یا سنی کوئی حقیقی کشمکش کرتے۔

درحقیقت، عثمانیوں نے خلافت کا جو ورثہ سنبھالا تھا، وہ ایک فعال ادارہ نہیں بلکہ محض سنی دنیا کی علامتی قیادت تھی۔ عثمانیوں اور صفویوں کے درمیان کئی جنگیں ہوئیں۔ صفویوں نے کچھ عرصے کے لیے عراق پر بھی قبضہ کیا اور ریاستی طاقت کے ذریعے اپنی سلطنت کے زیرِ نگین پوری آبادی کو یا تو زور زبردستی سے یا تبلیغ کے ذریعے شیعہ مذہب میں تبدیل کر دیا۔ صفوی دور میں شیعہ مذہبی تعلیم و ثقافت نے خوب ترقی کی۔ انہوں نے 1660 میں وسطی ایران میں اصفہان کو

اپنا دار الحکومت بنایا، اور اس شہر کی شاندار تعمیرات، جو آج بھی دیکھی جاسکتی ہیں، صفوی دورِ حکومت کی یادگار ہیں۔

سنہ 1722 میں صفوی سلطنت کا خاتمہ افغانستان سے آنے والی سنی افواج کے ہاتھوں ہوا، جس کے بعد عظیم ایرانی بادشاہ نادر شاہ نے اقتدار سنبھالا۔ تاہم، نہ تو افغان فاتحین اور نہ ہی نادر شاہ ایران میں سنی اسلام کو بطور سرکاری مذہب نافذ کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ بالآخر ان کی کامیابیاں بھی اُس وقت دم توڑ گئیں جب شیعہ عوام نے سنی غلبہ کو پسپا کیا۔ ایران میں شیعیت نہ صرف برقرار رہی بلکہ بیسویں صدی میں اس کے تسلسل نے خطے میں انتہائی اشتعال انگیز نتائج کو جنم دیا۔

جدید عراق

بغداد کے قلب میں واقع الرشید اسٹریٹ پر موجود برطانوی ریزیدنسی ایک وقت میں انگریز سفارت کار، مصنفہ اور ماہر آثارِ قدیمہ گرگٹ وڈ ہیل کے زیرِ استعمال تھی۔ آکسفورڈ سے تعلیم یافتہ یہ کوہ پیما اور منتظم 1900 میں پہلی بار بغداد آئی تھیں۔ اگلے دس برسوں کے دوران وہ مشرق وسطیٰ کے طول و عرض میں بطور ماہر آثارِ قدیمہ اور برطانوی سیاسی افسر کے طور پر گھومتی رہیں۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد برطانوی سلطنت نے عراق کو نوآبادی بنانے کا فیصلہ کیا اور محترمہ سیل ہی وہ شخصیت تھیں جنہوں نے عراق کی آئندہ تاریخ کی راہیں متعین کیں۔ انہوں نے عراق کی سرحدوں کا تعین کیا اور مکہ کے امیر فیصل کو عراق کا پہلا حکمران مقرر کیا۔ ان کے نزدیک یہ نیا بادشاہ، جو دراصل برطانوی سلطنت کا کٹھ پتلی تھا، مختلف قبائل اور ذیلی قبائل کے درمیان مقبول ہو سکتا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ محترمہ ہیل کو شیعہ برادری سے متعلق گہرا شک پیدا ہو گیا تھا اور وہ ان کے مذہبی رہنماؤں سے نالاں رہنے لگیں۔ ان کا ماننا تھا کہ شیعہ نہ تو برطانوی تاج کے وفادار ہیں اور نہ ہی وفادار ہو سکتے ہیں بلکہ وہ ہمیشہ برطانوی نوآبادیاتی اقتدار کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتے ہیں۔

جدید عراق کی ریاست 1921 میں برطانوی مینڈیٹ کے تحت ایک بادشاہت کی صورت میں قائم کی گئی تھی اور 1932 میں اسے ایک خود مختار قومی ریاست کی حیثیت سے آزادی دی گئی۔

تاہم، عراق ایک خطے یا مختلف صوبوں کے مجموعے کے طور پر ایک ہزار سال سے زائد عرصے تک مختلف حکمرانوں کے تحت موجود رہا، جن میں عباسی، منگول اور عثمانی شامل ہیں۔ مشرق وسطیٰ کے امور کے محقق، فنار حداد نے عراقی عربوں کی تین اقسام کی شناختوں کی نشان دہی کی ہے: متحدہ عراقی قوم پرستی، سنی عراقی قوم پرستی اور شیعہ عراقی قوم پرستی۔ یہ تینوں اقسام کی قومی شناختیں بیک وقت موجود ہیں۔ تاہم، حالیہ برسوں میں عراق بھر میں شیعہ عوام کی جانب سے ایران مخالف مظاہرے ان کی فرقہ وارانہ شناخت کے بجائے ان کی متحدہ عراقی قوم پرستی سے جنم لیتے ہیں۔

نجف کی شیعہ قیادت مس بیل کے لیے زیادہ تر اجنبی تھی، اور اُس نے فیصلہ کر لیا بھت اکدنی ریاست عراق کا اقتدار سنیوں کے سپرد کیا جائے گا۔ برطانوی سرپرستی میں سنی عربوں نے نئی عراقی فوج اور پارلیمان پر کنٹرول حاصل کر لیا۔ سنی اشرافیہ کے حلقوں میں یہ سوچ جڑ پکڑنے لگی کہ فوج کو ریاست پر اپنا تسلط قائم رکھنے اور عراقی قومی شناخت کی تشکیل کے لیے بطور آلہ استعمال کیا جائے۔ 1920 میں برطانوی اقتدار سے قبل، عثمانی دور میں تربیت یافتہ سنی عرب فوجی اور سیاسی افسران کو ایک مضبوط ریاست کے عثمانی تصور کی تعلیم دی گئی تھی۔ بعد کے آٹھ عشروں تک سنی اقلیت نے اکثریتی ذہنیت کے ساتھ حکمرانی کی۔

جب 1958 کی بغاوت میں بادشاہ فیصل دوم کے 23 سالہ پوتے فیصل دوم کو معزول کر کے قتل کر دیا گیا، تو شیعہوں نے مختصر عرصے کے لیے اقتدار کا مزہ چکھا، کیونکہ اس بغاوت کے رہنما قاسم کی والدہ شیعہ تھیں۔ تاہم، قاسم کو 1963 میں ایک اور بغاوت کے ذریعے معزول کر دیا گیا، اور عرب قوم پرستی اور بعث ازم کے عروج نے شیعہ برادری کو مکمل طور پر حاشیے پر دھکیل دیا۔ 1960 کی دہائی میں بعث پارٹی کا مرکز ی ڈھانچہ سنی عرب عراقیوں پر مشتمل تھا، جنہیں صدام حسین کی صدارت سے بھرپور فائدہ پہنچا۔ اس کے برعکس، شیعہ عراقی انقلاب کے بعد دوسرے درجے کے شہری بن کر رہ گئے۔ انہیں نظر انداز کیا گیا اور بعض اوقات سنی حکومت کے ہاتھوں شدید مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ سنی اسلام کے برعکس، جو بندے اور خدا کے درمیان براہ

راست تعلق کو اہمیت دیتا ہے، عراقی شیعہ اماموں اور مجتہدوں کے گرد منظم تھے۔

بہت سے اقتدار پسند شیعہ عرب قوم پرستی کے علمبردار بن گئے اور بعث پارٹی میں اہم مناصب تک پہنچے۔ اگرچہ بعث ازم بظاہر ایک سیکولر اور قوم پرستانہ نظریہ تھا، مگر اس کی بنیاد دراصل ایک سخت گیر سنی بالادستی پر قائم تھی۔ روایتی طور پر قبائلی سنی قیادت نے وہابی اثرات کے تحت سخت شیعہ مخالفت کا رویہ اپنایا تھا۔ بعث پارٹی کے 35 سالہ دور حکومت نے شیعوں کے لیے سخت مشکلات پیدا کیں، اور صدام حسین کا دور حکومت ان کے لیے بدترین ثابت ہوا۔ اُس نے شیعوں کے ساتھ مسلسل ظلم روا رکھا، حتیٰ کہ عاشورا اور دیگر شیعہ رسومات کی عوامی ادا کیگی پر بھی پابندی لگادی۔ جنوبی عراق کے دجلہ و فرات کے نچلے میدانوں سے لاکھوں شیعہ بے دخل کیے گئے، جنہیں مجبوراً بغداد کے شمال مشرقی علاقے میں واقع صدام سٹی کی جھگیوں میں رہنا پڑا۔ امریکی حملے کے بعد اس علاقے کا نام تبدیل کر کے مقتول شیعہ رہنما آیت اللہ محمد صادق الصدر کے نام پر الصدر سٹی رکھ دیا گیا۔ عراق میں تقریباً ہر معروف شیعہ علما خاندان کو صدام حکومت کے ہاتھوں اذیت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں سے کئی ایران منتقل ہو گئے، جبکہ کچھ یورپ چلے گئے۔ شیعہ برادری امریکہ کی طرف دیکھ رہی تھی اور مداخلت کی منتظر تھی۔

جب 2003 میں جارج ڈبلیو بش کی قیادت میں امریکی حملے کی تیاریاں جاری تھیں تو سعودی بادشاہت نے امریکی انتظامیہ کو پوری وضاحت کے ساتھ خبردار کیا تھا کہ اگر صدام اقتدار سے ہٹایا گیا تو اس کا سب سے بڑا فائدہ ایران اور عراق کے شیعوں کو ہوگا، کیونکہ عراق میں اکثریتی آبادی انہی کی ہے۔ آل سعود ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ مشرق وسطیٰ کے قلب میں واقع کسی اہم عرب ملک پر شیعہ حکمرانی کرے۔ 1744 کے اُس معاہدے کے مطابق جو آل سعود اور سلفی عالم ابن عبدالوہاب کے درمیان طے پایا تھا، سعودی عرب میں اعلیٰ ترین سنی مذہبی قیادت ہمیشہ عبدالوہاب کی اولاد سے ہونی چاہیے، جنہوں نے واضح طور پر اعلان کیا تھا کہ شیعہ اور صوفی گمراہ ہیں اور ان کو کسی مسلم ملک پر حکومت کرنے کا حق نہیں دیا جاسکتا۔

بحرین ایک اور عرب ملک ہے جہاں اگرچہ مقامی آبادی کا تقریباً 70 فیصد حصہ شیعہ ہے، لیکن

حکومت سنی حکمرانوں کے ہاتھ میں ہے۔ مشہور عرب بہار کی بغاوت کے دوران، جب بحرین میں حکمران خاندان کے خلاف ایک مختصر مگر شدید شیعہ احتجاجی تحریک اٹھی، تو آل سعود نے اپنی نیشنل گارڈز کو وہاں بھیجا اور اس بغاوت کو انتہائی بے رحمی سے کچل دیا۔

مارچ 2003 میں، عراق کے عظیم آیت اللہ سید علی الحسینی السیستانی نے اپنی شیعہ برادری کو ہدایت دی کہ وہ بغداد کی طرف بڑھنے والے امریکی فوجیوں کی مزاحمت نہ کریں۔ جب امریکی میرینز آدھی رات کو کربلا کے مقدس شہر میں داخل ہوئے تو وہاں کا منظر پرسکون اور تاریک تھا، سوائے امام حسینؑ کے روضے کے سنہری گنبد کے جو رات کی تاریکی میں جگمگا رہا تھا۔ یہ منظر بہت سے نوجوان امریکی فوجیوں کے لیے حیران کن تھا۔ آیت اللہ سیستانی کے اس فتویٰ سے امریکی انتظامیہ خوش تھی۔ لیکن درحقیقت، یہ فتویٰ امریکہ پر کسی احسان کے بجائے، عراق پر شیعوں کے دعوے کی راہ ہموار کرنے کا ایک موقع تھا۔ صدر بش کی انتظامیہ اس عمل کے مضممرات اور شیعہ سنی فرقوں کے درمیان موجود گہری رقابت اور نفرت سے پوری طرح ناواقف تھی۔ صدام حسین کے زوال نے عراق میں صدیوں سے قائم سنی حکمرانی کا خاتمہ کیا، اور ملک میں سنی و شیعہ سماجی توازن کو مکمل طور پر بدل دیا۔ اسلام کی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ ایک عرب ملک مسیٰں اقتدار شیعوں کے ہاتھ آیا۔ صدر بش کا وژن صرف یہ تھا کہ ایک آمر کو ہٹایا جائے، اور ایک ایسا عراق قائم کیا جائے جو جمہوری، سیکولر اور اقتصادی طور پر خوشحال ہو۔

شیعہ احیاء

عراق میں شیعہ احیاء کا آغاز سب سے پہلے ثقافتی اور مذہبی سطح پر ہوا۔ مقدس شہروں اور علمی مراکز کو دوبارہ کھولا گیا۔ کربلا اور نجف کی زیارت کے لیے لاکھوں زائرین آنے لگے، جس سے تجارتی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا اور مشرق وسطیٰ و جنوبی ایشیائی ممالک سے بین الاقوامی روابط استوار ہوئے۔ اس احیاء کی بنیاد تین اہم عوامل پر تھی: بغداد میں شیعہ غالب حکومت اور ایک شیعہ وزیر اعظم، ایران کا بطور علاقائی طاقت ابھرنا، اور لبنان، شام، بحرین، سعودی عرب، کویت، بھارت اور متحدہ عرب امارات سمیت دنیا بھر میں شیعوں کا بااختیار ہونا۔ یہ تینوں عوامل باہم

مربوط تھے اور ایک دوسرے کو تقویت دیتے تھے۔ صدر اوباما کی جانب سے ایران کے ساتھ نیوکلیر معاہدے پر دستخط، یورپی یونین کی طرف سے روحانی حکومت کو نئی عالمی عزت و وقار دینا، اور حال ہی میں عراقی افواج کی طرف سے داعش کے جنگجوؤں کو موصل اور دیگر علاقوں سے نکال باہر کرنے کی کامیابی نے عراقی زمینی افواج اور شیعہ ملیشیاؤں کو ایک نیا اعتماد عطا کیا ہے۔ حالیہ دنوں میں چار سنی عرب ممالک ’سعودی عرب، بحرین، متحدہ عرب امارات اور مصر‘ کی قطر کے ساتھ کشیدگی نے مشرق وسطیٰ میں سنی-شیعہ خلیج کو مزید گہرا کر دیا ہے۔ قطر، جو ایران کے ساتھ گیس کے ذخائر میں شراکت دار ہے، نے اپنے سنی ہمایوں کی طرف سے لگائی گئی تحب ارتی پابندیوں کے جواب میں ایران کے ساتھ خوراک اور دیگر ضروری اشیاء کی درآمد کے معاہدے کیے ہیں۔ سعودی قیادت میں قائم اتحاد قطر کے ایران سے دوستانہ تعلقات پر سخت ناراض ہے۔ اس بدلے ہوئے سیاسی منظر نامے نے خطے میں سنی-شیعہ طاقت کے توازن کو تقسیریباً چودہ صدیوں بعد ایک نئی برابری کی سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔

عراق میں بغاوت اور اسلامی ریاست

شیعہ قیادت والی مرکزی عراقی حکومت کے خلاف سنی بغاوت میں 2005 میں کئی مختلف قوتیں شامل ہو گئیں۔ ان میں سابق بعثی فوجی افسران کے ساتھ ساتھ انتہا پسند سلفی جہادی عناصر بھی شامل تھے۔ اس بغاوت کو نظریاتی رنگ دے کر امریکی قابض افواج کے انخلاء کے بعد اقتدار کی منتقلی کے عمل کو پیچیدہ بنانے کی کوشش کی گئی۔ اس بغاوت کی قیادت ابو مصعب الزرقاوی کر رہے تھے، جو اردن میں القاعدہ کی صفوں سے ابھرے تھے۔ ان کا پیغام نہایت واضح تھا: یہ معاملہ شیعوں کے ساتھ اقتدار میں شراکت، یا سیکولرازم، کثرت پسندی یا جمہوریت کا نہیں بلکہ اس امر کا تھا کہ عراق پر حکومت کس فرقے کی ہوگی۔

عراق میں القاعدہ کی قیادت نے زرقاوی کے نام سے ایک خط جاری کیا جس میں تمام سنیوں کو مخاطب کرتے ہوئے شیعوں کو ”چھپے ہوئے سانپ“، ”چالاک اور بدنیت بچھو“ اور ”جاسوس دشمن“ قرار دیا گیا، جن کا زہر نہایت مہلک اور اثر انگیز ہے۔ خط میں اعلان کیا گیا کہ ان کی جنگ

دو محاذوں پر ہے: ایک امریکہ اور برطانیہ کے خلاف، اور دوسری عراق کے شیعوں کے خلاف۔ زرقاوی کا ماننا تھا کہ شیعہ امریکہ جیسے صلیبی آقاؤں سے بھی زیادہ چالاک ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ شیعہ جلد یا بدیر عراق میں اپنی طاقت کو مستحکم کر لیں گے اور اسے ایران سے لے کر عراق، شام، لبنان اور بحرین تک پھیلا دیں گے۔ عراقی سنیوں کے لیے واحد راستہ یہ تھا کہ وہ خانہ جنگی کا آغاز کریں، سنی اکثریتی علاقوں پر قبضہ کریں اور وہاں سے شیعوں کو نکال باہر کریں۔ زرقاوی کا مقصد ایسی بغاوت کی قیادت کرنا تھا جو ملک میں اتری اور غیر یقینی صورت حال پیدا کرے۔ وہ جانتے تھے کہ خانہ جنگی کے کیا نتائج ہوں گے اور اس کا قابض اتحادی افواج پر کیا اثر پڑے گا۔ 2005 میں امریکہ نے عراق میں مزید لڑاکا افواج بھیجیں اور اس فوجی آپریشن کو 'سرج' کا نام دیا، جس کا مقصد شام اور عراق کی سرحد پر سرگرم بغاوتی گروہوں کے خلاف زبردست کارروائی کرنا تھا۔ جواباً، زرقاوی نے تین دن تک ہولناک دہشت گردی کی لہر چلائی، جس میں خودکش دھماکوں اور دیگر سفاک حملوں کے ذریعے درجنوں شیعہ اور ان کے مذہبی رہنما قتل کیے گئے اور سینکڑوں زخمی ہوئے۔ اس حملے کے بعد القاعدہ کی ویب سائٹس پر پیغامات پوسٹ کیے گئے جن میں پورے عراق میں 'مرتد شیعوں' کے خلاف ہمہ گیر جنگ کی کال دی گئی۔ یہ وہ ابتدائی دن تھے جب جہادی پیغامات پھیلانے کے لیے انٹرنیٹ کا استعمال بڑھنے لگا تھا، اور ٹیکنالوجی سے تقویت یافتہ عالمی دہشت گردی پہلی بار ایک واضح شکل میں سامنے آرہی تھی۔

اس flattening of the world نے القاعدہ کے لئے غیر معمولی ترقی کی راہ ہموار کی۔ دراصل، عالمگیریت (globalization) اس کی دوست ثابت ہوئی، کیونکہ اس نے مسلم شناخت کے احیاء کو کئی طریقوں سے مضبوط بنایا۔ اس نے ایک ملک کے مسلمانوں کو دوسرے ملک کے مسلمانوں کی حالت کو بہتر طور پر سمجھنے، ان سے ہمدردی رکھنے اور ان کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کرنے کا موقع فراہم کیا۔ یہ سب انٹرنیٹ اور مختلف سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کے ذریعے ممکن ہوا۔ یہی flattening process مسلمانوں میں مغرب کی طرف سے ان پر کی جانے والی ناانصافیوں اور امتیازی سلوک، خاص طور پر مختلف مذاہب میں حکومتوں کی تبدیلی کے نام پر کی

جانے والی مداخلتوں، کے احساس کو مزید گہرا کرتا گیا۔ مسئلہ فلسطین کا حل نہ ہونا اور مقبوضہ مغربی کنارے (West Bank) پر اسرائیل کی جانب سے کی جانے والی پے در پے جارحیت، ہمیشہ سے مسلمانوں کی کئی نسلوں کے ذہنوں پر نقش رہی ہے۔

اسی flattening of the world کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ شہروں کی طرف ہجرت میں اضافہ ہوا اور بڑی تعداد میں تعلیم یافتہ مگر بے روزگار عرب نوجوان مغربی ممالک کی طرف کوچ کرنے لگے۔ تیز رفتار انٹرنیٹ اور الیکٹرانک میلز نے نوجوان مسلمانوں کو آپس میں ایک مضبوط اور مؤثر نیٹ ورک بنانے میں مدد دی۔ یہ نئی مواصلاتی ٹیکنالوجی زیر زمین انتہا پسند تنظیموں جیسے القاعدہ اور اس کی ذیلی تنظیموں کے لیے کسی نعمت سے کم نہ تھی۔ انہوں نے پیسے کی ترسیل کے لیے حوالہ نظام (ہاتھوں ہاتھ رقم منتقل کرنے کا طریقہ) اپنایا اور ویب سائٹس کے ذریعے دیگر مذاہب کے خلاف نفرت پھیلانے کا سلسلہ شروع کیا، جس کے ذریعے نئی بھرتیاں کی گئیں۔

امریکی حملے کے بعد عراق میں جو کچھ دنیا نے دیکھا وہ خود کش حملہ آوروں کی فراہمی میں واضح اضافہ تھا۔ سینکڑوں خود کش حملہ آور وہابی اسلام کے گڑھ علاقوں جیسے چیچنیا، افغانستان، صومالیہ اور پاکستان سے بھرتی کیے گئے۔ ان کے غصے کی وجہ نہ تو مغربی کنارے پر اسرائیل کا طویل قبضہ تھا اور نہ ہی عراق پر امریکی تسلط۔ دراصل، وہ پیغام جہاد جو وہابی مساجد، اتوار کے دینی مدارس اور مختلف انتہا پسند آن لائن پلیٹ فارمز کے ذریعے پھیلا یا گیا، اسی نے ان نوجوانوں کو اس راہ پر ڈالا۔ اسلامی متون کو چن چن کر اس انداز میں پیش کیا گیا کہ نوجوان خود کو اسلام کے عظیم مقصد کے لیے قربان کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ دنیا کے ”چھپے“ ہونے نے دہشت گردوں کو ایک ”مجازی خلافت“ قائم کرنے میں مدد دی، جس کے لیے وہ ہر قسم کے مواصلاتی ذرائع استعمال کرتے تھے۔ وال اسٹریٹ جرنل کے صحافی ڈینیئل پرل کا سر قلم کرنے کی ہولناک ویڈیو، جو پاکستانی اسلام پسند شدت پسندوں نے بنائی تھی، انٹرنیٹ پر پوری دنیا میں پھیلائی گئی۔ المیہ یہ ہے کہ ایسی ویڈیوز کو بھرتی کے ایک مؤثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ آج کی دنیا میں دہشت گردوں کے لیے اپنے پر تشدد پیغامات کو عالمی سطح پر پھیلانا کہیں آسان ہو گیا ہے۔ اب

انھیں کسی میڈیا ادارے کے در پر جانے کی ضرورت نہیں رہی؛ وہ براہ راست فیس بک یا یوٹیوب جیسے پلیٹ فارمز پر اپنی ویڈیوز اپ لوڈ کر کے اپنا پیغام دنیا تک پہنچا سکتے ہیں۔ دہشت گرد تنظیمیں انٹرنیٹ کو فنڈ جمع کرنے کے لیے بھی استعمال کرتی ہیں۔ القاعدہ ہمیشہ سے عطیات پر انحصار کرتی رہی ہے اور اس نے ایک عالمی فنڈنگ نیٹ ورک بہت چالاکी سے بُنا، جس میں فاؤنڈیشنز، خیراتی ادارے، غیر سرکاری تنظیمیں اور دیگر مالیاتی ادارے شامل تھے، جو ویب سائٹس اور انٹرنیٹ چیٹ رومز کے ذریعے رابطے اور مالی لین دین کرتے ہیں۔ بھرتی کرنے والے لوگ بھی انٹرنیٹ کی جدید اور باہمی رابطے کی ٹیکنالوجی کا استعمال کرتے ہیں تاکہ نوجوان نسل میں سے ممکنہ ارکان کی شناخت کر کے انھیں اپنے گروہ میں شامل کیا جاسکے۔ دہشت گرد تنظیمیں جیسے حماس، القاعدہ اور پاکستان میں قائم کئی گروپ محض ایک روایتی کمانڈ چین کے تحت نہیں چلتے بلکہ مختلف علاقوں میں خود مختار ذیلی اکائیاں (affiliates) تشکیل دیتے ہیں، جیسے نائجر یا میں بوکو حرام اور صومالیہ میں الشباب۔ دہشت گردی کی حمایت کرنے والی درجنوں ویب سائٹس سرگرم ہیں، اور فلپائن، انڈونیشیا، بھارت، فرانس، برطانیہ، پاکستان، چیچنیا، صومالیہ اور نائجر یا میں بہت سے ڈھیلے ڈھالے مگر مربوط انتہا پسند گروہ موجود ہیں۔ یہ گروہ آپس میں خیالات اور عملی معلومات کا تبادلہ کرتے ہیں کہ ہم کیسے بنائے جائیں، دہشت گرد سیل کیسے قائم کیے جائیں اور حملے کیسے انجام دیے جائیں۔ 9/11 حملوں میں ملوث القاعدہ کے بیشتر کارکنان نے اپنی منصوبہ بندی اور ہم آہنگی کے تمام مراحل انٹرنیٹ کے ذریعے ہی انجام دیے تھے۔

2004 میں زرقاوی اور اس کے گروہ جماعت التوحید والجہاد نے اسامہ بن لادن سے بیعت کی، جس کے جواب میں بن لادن نے زرقاوی کو عراق میں اپنا نائب مقرر کیا۔ بن لادن کی اس توثیق کے بعد زرقاوی کی کارروائیاں عراق میں مزید مضبوط ہوتی گئیں۔ اس کی عسکری صلاحیتیں مزید ترقی یافتہ ہو گئیں، کیونکہ اس نے مالی وسائل کے نئے ذرائع سے فائدہ اٹھایا اور سابق سنی عراقی فوجی کمانڈروں سے رابطے قائم کیے تاکہ اپنے ہتھیاروں کا ذخیرہ بہتر بنایا جاسکے۔ زرقاوی نے دریائے فرات کی وادی کے مختلف قبضوں میں گوریل گروہوں کو منظم کیا۔ اس نے اردن اور شام

میں بھی ایک نیٹ ورک قائم کیا اور نومبر 2005 میں عمان میں ہونے والے بڑے حملوں کی ذمہ داری قبول کی۔ اس کے گروہ نے بڑی چالاکی سے عراق کے سنی حلقوں میں ایک شدید شیعہ مخالف بیانیہ تشکیل دیا، اور شیعہ احیاء کو اسلام کی تقدیر میں ایک تباہ کن سانحہ قرار دیا۔

عرب دنیا کی بڑی اکثریت اور عمومی طور پر سنی مسلمان مشرق وسطیٰ میں امریکی اقدامات پر شکوک و شبہات کا شکار تھے، کیونکہ ان کا ماننا تھا کہ یہ سب سنی اسلام کو کمزور کرنے کی ایک بڑی سازش ہے۔ اس تاثر نے امریکہ کے ساتھ محاذ آرائی کے دائرے کو وسعت دینے کی ایک نئی پکار پیدا کی، کیونکہ فرقہ وارانہ جذبات عرب دنیا کے رد عمل کا ایک اہم عنصر بن گئے تھے، جو عراق کے حالات سے کہیں آگے تک پھیل چکا تھا۔ عالمی سنی اور عرب برادریوں میں یہ پیغام پھیل چکا تھا کہ امریکہ نے عراق کو ”سچے اسلام“ کے پیروکاروں سے چھین کر ”گمراہ“ شیعوں کے حوالے کر دیا ہے۔ 2003 میں عراق پر امریکی حملے نے روایتی سنی عرب قلعوں کو کمزور کرنے کا عمل شروع کیا، اور قاہرہ، عمان اور ریاض جیسے دارالحکومتوں میں موجود حکومتوں کو مجبور کر دیا کہ وہ شیعہ ایران کے لیے زیادہ گنجائش پیدا کریں۔

صدر اوباما کا ماننا تھا کہ ایران کو جوہری طاقت حاصل کرنے سے روکنے کے لیے امریکہ کا اس کے ساتھ بات چیت کرنا ناگزیر ہے۔ ان کے مطابق یہ معاہدہ ایران کو کم از کم پندرہ سال کے لیے جوہری ہتھیار حاصل کرنے کی سطح سے پیچھے دھکیل دے گا اور ان کے تمام مہلک اسلحے موثر طور پر بند کر دے گا۔ جب ایران عالمی برادری کے ساتھ بہتر انداز میں جڑ جائے گا، تو تہران بھی زیادہ ذمہ دار رویہ اختیار کرے گا۔ اس کے برعکس، اسرائیل مسلسل ایران کی جوہری طاقت بننے کے خلاف اپنی آواز بلند کرتا رہا ہے، اور بظاہر ایسا لگتا ہے کہ وہ مشرق وسطیٰ میں سنی اور شیعہ کے درمیان پہلے سے موجود خلیج کو مزید گہرا کرنا چاہتا ہے۔

شیعہ ایران سے دشمنی

مشرق وسطیٰ میں فرقہ واریت اپنی حدود سے تجاوز کر چکی ہے۔ یہ ایک عظیم منشور (prism) کی مانند بن چکی ہے، جس کے ذریعے لوگ اپنے ہمسایوں کو دیکھتے ہیں اور حکومتیں اپنے علاقائی

حریفوں کا اندازہ لگاتی ہیں۔ شام، یمن اور عراق میں جاری تنازعات درحقیقت سعودی عرب اور ایران کے درمیان پر کسی فرقہ وارانہ جنگیں ہیں یعنی ایسے خطے میں دو بالا دست قوتوں: ایک سنی اور دوسری شیعہ کی باہمی کشمکش۔

ہر ملک کے اندر سخت گیر مذہبی علما ایک دوسرے کے عقائد کے خلاف سخت زبان استعمال کرتے ہیں۔ سعودی عرب کی جانب سے وہابی۔ سلفی عقیدے کو شدت سے آگے بڑھانے کے نتیجے میں پوری دنیا میں فرقہ وارانہ خطابات کا دائرہ وسیع ہو چکا ہے۔ اس کے رد عمل میں ایران کے اندر سنی مسلمانوں کے بارے میں ایک گہری عدم برداشت جنم لیتی ہے، جو رفتہ رفتہ دونوں فرقوں کے بیچ خلیج کو مزید گہرا کر رہی ہے۔ سعودی عرب کے حکمران خاندان کا ماننا ہے کہ یمن میں حوثیوں کی عسکری کامیابی، لبنان میں حزب اللہ کی قوت، اور شام میں بشار الاسد کی حکومت ان سب کے پیچھے ایران کا ہاتھ ہے۔ اسلامک اسٹیٹ (داعش)، جو سب سے زیادہ عدم برداشت رکھنے والے جہادی گروہوں میں سے ایک ہے، شیعہ مسلمانوں اور صوفی سنی اسلام کے پیروکاروں سے شدید نفرت رکھتی ہے، جس کی وجہ اس پر غالب وہابی اثر ہے۔ شام اور عراق میں داعش کی خلافت کے خاتمے کے بعد، اسی نظریے پر یقین رکھنے والے کئی خفیہ نیٹ ورک (سلیپر سیلز) شام، یمن، افغانستان، لیبیا اور شمالی عراق کے کچھ علاقوں میں دوبارہ فعال ہو گئے ہیں۔

امریکہ کے اسٹریٹیجک مفادات کے لیے ایران کی اہمیت

جارج ٹاؤن یونیورسٹی، واشنگٹن ڈی سی کے ایرانی نژاد امریکی پروفیسر سید حسین نصر باقاعدگی سے امریکی انتظامیہ کے اعلیٰ حکام کو ایران کی جغرافیائی و تزویراتی اہمیت اور سنی عرب دنیا سے اس کے تعلقات کی باریکیوں کے بارے میں آگاہ کرتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ 2013 میں، امریکہ کے سابق نائب وزیر خارجہ ولیم برنز نے ایرانی ہم منصبوں کے ساتھ خفیہ طور پر عبوری نیوکلیئر معاہدے کے خدوخال تیار کیے، جو بعد ازاں مذاکرات کی راہ ہموار کرنے کا باعث بنے۔ اسی کوشش کا تسلسل آگے چل کر 2015 میں ایران کے ساتھ تاریخی جوہری معاہدے پر دستخط کی صورت میں سامنے آیا۔ یقیناً اس معاہدے پر کئی تنقیدیں بھی ہوئیں، جن میں امریکی کانگریس

کے اسپیکر جان بوزجسی نمایاں شخصیات بھی شامل تھیں، جنہوں نے اس معاہدے کو ”نافیابل قبول“ قرار دیا۔ اس کے باوجود، صدر اوباما اپنے موقف پر قائم رہے اور اپنی تقریر میں واضح کیا کہ یہ معاہدہ اعتماد پر نہیں بلکہ تصدیق پر مبنی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ یہ امریکہ، اس کے اتحادیوں اور دنیا کے لیے ایران کو باقی دنیا کے ساتھ مربوط کرنے کا بہترین راستہ ہے۔

مارچ 2004 میں بغداد اور کربلا میں یکے بعد دیگرے بم دھماکوں میں عاشورا کے موقع پر عزاداری میں مصروف کم از کم 143 شیعہ جاں بحق ہو گئے۔ یہ حملہ اُس وقت عراق میں ہونے والے مہلک ترین حملوں میں سے ایک تھا، جب صدر بش نے یکم مئی 2003 کو عراق میں بڑے پیمانے پر جنگی کارروائیوں کے خاتمے کا اعلان کیا تھا۔ سعودی عرب کے ایک وہابی عالم دین، جو فقہ حنبلی کے پیروکار تھے اور جنہیں عمومی طور پر وہابی کہا جاتا ہے، نے اپنی ویب سائٹ پر اس اندوہناک عمل کو جواز فراہم کرتے ہوئے عاشورہ کی عزاداری کو ”سب سے بڑی شرک کی نمائش“ قرار دیا اور شیعہ فرقے کے حوالے سے کہا: ”وہ ہمارے بھائی نہیں ہیں“۔ اُس نے شیعوں پر الزام عائد کیا کہ وہ ایک ”برائی کے مجوز“ کا حصہ ہیں، جو واشنگٹن، تل ابیب اور نجف شیعوں کا مقدس شہر، کوآپس میں جوڑتا ہے، اور یہ کہ وہ سنیوں کو کمزور کرنے کی سازش کر رہے ہیں۔ سعودی عرب کا ماننا ہے کہ امریکہ، جو اس کا قریبی اتحادی ہے، شیعہ احیاء کو ممکن بنانے میں شریک جرم ہے۔ دوسری طرف، امریکہ اور مغربی جمہوریتیں اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ سعودی حکومت عالمی سطح پر سلفی ازم کے پھیلاؤ میں مرکزی کردار ادا کر رہی ہے، جو اسلام کی ایک شدت پسند تشریح ہے۔ اس کے نتائج میں القاعدہ، داعش اور دیگر جہادی گروہوں کا ظہور شامل ہے۔

سعودی عرب کی قیادت میں سنی کیمپ کو ”شیعہ ہلال“ کے پھیلاؤ سے شدید خوف لاحق ہے، جو بیروت سے تہران تک پھیلتا جا رہا ہے۔ 2003 میں عراق پر امریکی حملے کے بعد جو عبوری انتظامیہ وہاں قائم کی گئی تھی، اس کے سربراہ پال بریمر نے کہا کہ یہ حملے سنی اور شیعہ مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ فساد کو ہوا دینے کے لیے کیے گئے تھے۔ یہ حملے اُس وقت ہوئے جب اتحادی افواج کو ایک ایسا خط موصول ہوا، جو زرقاوی نے القاعدہ کی قیادت کو جو پاکستان یا افغانستان میں

تھی لکھا تھا۔ اُس خط میں زور دیا گیا تھا کہ شیعوں کے خلاف بغاوت کو زندہ رکھا جائے اور خط میں دیگر حملوں کی ذمہ داری بھی قبول کی جائے تاکہ شدت پسند بیانیے کو تقویت دی جاسکے۔

سعودی قیادت میں وہابی۔ سلفی صرف شیعوں کو نشانہ نہیں بنارہے، بلکہ دنیا بھر میں حنفی، سنی اور صوفی اسلام کے مرکزی دھارے پر بھی قبضہ جمانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سعودی عرب اس مقصد کے لیے ایک ملک سے دوسرے ملک میں لاکھوں پیڑ وڈال خرچ کر رہا ہے۔ اس کا نتیجہ اسلامی دنیا میں فرقہ وارانہ کشیدگی کے پھیلاؤ کی صورت میں سامنے آ رہا ہے۔ شیعہ مسلمانوں کو سعودی عرب سے لے کر پاکستان اور تیونس سے لے کر انڈونیشیا تک غیر معمولی شدت اور سفاکی سے نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ یہ فرقہ وارانہ تشدد صرف شام یا پاکستان کے دیہی علاقوں تک محدود نہیں رہا، بلکہ ہر اسلامی معاشرے میں مختلف مکاتب فکر کے درمیان تعلقات کو زہر آلود کر رہا ہے۔

قطر اور سعودی عرب کے درمیان تنازع کی ایک اہم وجہ، ایران کے ساتھ قطر کے تعلقات ہیں۔ حالانکہ قطری عوام کی اکثریت اور اس کی حکمران آل ثانی خاندان وہابیت کے پیروکار ہیں، مگر جغرافیائی و سیاسی مجبوریوں کے باعث قطر کو ایران کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ قطر کی شیعہ آبادی تقریباً 145 ہزار قبیلوں پر مشتمل ہے، جنہیں تین بڑے گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا گروہ اُن افراد پر مشتمل ہے جو اصلاً بحرین سے تعلق رکھتے ہیں، دوسرا گروہ سعودی عرب کے الاحساء علاقے سے آیا ہے، جبکہ تیسرا گروہ غیر عرب ایرانی النسل ہے۔ قطر میں شیعہ مسلمان کئی دہائیوں سے عبادت کی آزادی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ اُن کے پاس اپنی مساجد ہیں، مذہبی رسومات کے لیے امام بارگاہیں (حسینیات) اور حتیٰ کہ شیعہ مذہبی عدالتیں بھی قائم ہیں۔ قطر میں شیعہ اور سنی صدیوں سے ہم آہنگی کے ساتھ رہتے آئے ہیں۔ خلیج فارس میں ایک انگوٹھے کی مانند نمایاں یہ چھوٹا سا جزیرہ نما ملک ایران کے ساتھ گیس کا میدان شیئر کرتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ قطر نے خود کو سنی عرب دنیا کے ایک اہم رہنما کے طور پر منوالیا ہے۔

نائن الیون کے بعد، ایش انتظامیہ نے یہ فیصلہ کیا کہ ہر سال ”یو ایس اسلامک ورلڈ فورم“

(US-Islamic World Forum) کے عنوان سے ایک اجلاس دوحہ، قطر میں منعقد کیا جائے گا، تاکہ سنی عرب ممالک کو سیاست، میڈیا، تعلیم اور رسول سوسائٹی جیسے میدانوں میں شامل کیا جاسکے۔ اس فورم کا مقصد کوئی علمی مکالمہ نہیں بلکہ حکومتوں اور رسول سوسائٹی کے لیے قابل عمل ایجنڈا تیار کرنا تھا۔ یہ سالانہ اجلاس ہمیشہ دوحہ، قطر میں منعقد ہوتا رہا، سوائے اپریل 2011 کے، جب یہ واشنگٹن ڈی سی میں ہوا۔ اس اہم فورم کو منعقد کرنے کی ذمہ داری بروکنگز انسٹی ٹیوشن (Brookings Institution) کو سونپی گئی۔ عرب قوم پرستی (pan-Arabism) کو ادارہ جاتی شکل دینے کی کوششوں کے تحت ایرانی ماہرین تسلیم یا سرکاری اہلکاروں کو کبھی بھی ان اجلاسوں میں مدعو نہیں کیا گیا۔ سعودی شاہی خاندان اس بات پر ناراض تھا کہ اتنا اہم سالانہ اجلاس ریاض، سعودی عرب کے بجائے دوحہ، قطر میں منعقد کیا جا رہا ہے۔

فورم کا پہلا اجلاس جنوری 2004 میں منعقد ہوا، جس میں امریکہ اور 37 مسلم ممالک سے 150 سے زائد رہنماؤں اور ماہرین نے شرکت کی۔ قطر کے امیر، شیخ حمد بن خلیفہ آل ثانی، نے اس اجلاس میں کلیدی خطاب کیا۔ تب سے یہ سالانہ تقریب قطر کی وزارت خارجہ اور امریکہ کے ”سینٹر فار مل ایسٹ پالیسی“ کے اشتراک سے منعقد کی جاتی رہی ہے۔ اس طرح کا ایک اہم سالانہ اجلاس دوحہ میں منعقد کر کے، قطری امیر سنی عرب دنیا کے ایک اہم رہنما کے طور پر ابھرے۔ مشرق وسطیٰ میں قطر کی امداد پسند آواز کے طور پر ظہور ولی عہد محمد بن سلمان (MBS) کے لیے، جو خود کو سنی قیادت کا مرکز تصور کرتے ہیں، قابل قبول نہیں۔

دوحہ، انقرہ اور تہران کے درمیان بڑھتے ہوئے تعلقات نے تل ابیب کو قاہرہ اور ریاض کے اور قریب کر دیا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں فرقہ وارانہ بیانیے کو ایک حد تک ترکی، ایران اور قطر کے درمیان بڑھتے ہوئے خوشگوار تعلقات متوازن کر رہے ہیں۔ ریاض، ایران کو اپنے وجود کے لیے خطرہ سمجھتا ہے، لیکن قطر، ترکی کی طرح، ایران کے ساتھ اپنے کثیر سطحی تعلقات کو مضبوط کر رہا ہے۔ لیبیا میں اگرچہ شیعہ موجود نہیں، لیکن اسے شدت پسند سنی گروہوں کی طرف سے سخت بغاوت کا سامنا ہے، جو اسلامی ریاست (داعش) کی نظریاتی تحریک سے متاثر ہو کر سنی غالب

حکومت ”گورنمنٹ آف نیشنل یونٹی“ کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ کبھی بھی خالص نسلی یا فرقہ وارانہ خطوط پر منقسم نہیں تھا اور نہ ہی ایسا ہو سکتا ہے۔ شہروں اور صوبوں میں مخلوط آبادی اور فرقوں کے مابین شادیاں، اس تقسیم کے بیانیے کو مزید پیچیدہ بنا دیتی ہیں۔ 1990 کی دہائی کے اواخر اور 2000 کی دہائی کے اوائل میں سعودی عرب نے دونوں طرح کے فرقہ وارانہ عناصر کو معتدل بنانے کی کوششیں شروع کیں۔ حکومت نے ایران کے ساتھ مفاہمت کی راہ اپنائی اور شاہی خاندان کے اندر اصلاح پسند دھڑے، جس کی قیادت اُس وقت کے ولی عہد عبداللہ کر رہے تھے، نے 9/11 حملوں کے بعد سعودی عرب میں وہابی انتہا پسندی کے اثرات کو کم کرنے کی کوشش کی۔ وہابی عسکریت پسندی نے وقتاً فوقتاً کئی چہرے بدلے، لیکن اس کی اندرونی نظریاتی ساخت وہی رہی، چاہے وہ طالبان ہوں، القاعدہ کی مختلف شاخیں، داعش جیسی خونخوار تنظیم ہو یا شام میں القاعدہ کی شامی شاخ ”جَبہۃ النصرہ“ (النصرہ فرنٹ)۔ سعودی پٹرول ڈالر سے تقویت پانے والی النصرہ فرنٹ آج بھی لاکھوں معصوم شامی شہریوں کی زندگیوں کو تباہ کر رہی ہے۔ ان شدت پسندوں نے سعودی سرمائے کی مدد سے صرف عیسائیوں، یہودیوں، یزیدیوں، شیعہ اور دیگر اسلامی فرقوں کو نہیں بلکہ اپنے ہم مسلک اہل سنت کو بھی، صرف اس بنا پر نشانہ بنایا کہ وہ ان سے مختلف ہیں۔ درحقیقت، وہابی نظریات پر مبنی اس برآمد کردہ نفرت کا سب سے زیادہ شکار خود سنی مسلمان ہی ہوئے ہیں۔

ادھر ولی عہد محمد بن سلمان (MBS) پروہابیت میں سنجیدہ اصلاحات کے لیے دباؤ مسلسل بڑھتا جا رہا ہے۔ ریاض نے دنیا بھر میں ہزاروں مساجد، مدارس، اسلامی مراکز اور اتوار کی دینی کلاسوں کے ذریعے اسلام کی انتہائی قدامت پسند تعبیر کو پھیلانے کے لیے اربوں امریکی ڈالر خرچ کیے ہیں۔ ایشیا سے افریقہ تک، یورپ سے امریکہ تک، اس فکری بگاڑ نے عالمی مسلم برادری کو شرمندگی میں مبتلا کر دیا ہے۔ کئی سابق جہادیوں کا ماننا ہے کہ سعودی عرب نے پیسے کے زور پر اسلام کو ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔ وہابی سلفی ازم کے اثرات نہایت تباہ کن رہے ہیں۔ عملاً ہر ایسا دہشت گرد یا جہادی گروہ جو اسلام کے نام کا غلط استعمال کرتا ہے، چاہے وہ شام میں القاعدہ

کی شاخیں ہوں یا نانبجیر یا کابوکو حرام، اسی نظریاتی موت کے کلٹ سے متاثر ہے۔ 2013 میں ایران کے صدر حسن روحانی نے ایک عالمی پیشکش کی تھی جس کا عنوان تھا: ”تشدد اور انتہا پسندی کے خلاف دنیا (WAVE)“۔ اقوام متحدہ کو چاہیے کہ وہ اس منصوبے کو ایک بنیاد بنا کر مختلف مذاہب اور فرقوں کے درمیان مکالمے کو فروغ دے، تاکہ اس قرون وسطیٰ کی فرقہ وارانہ شدت پسندی کا راستہ روکا جاسکے۔

درحقیقت، مشرق وسطیٰ کے ممالک میں جاری تنازعہ محض ایک فرقہ وارانہ جنگ نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور تہہ دار نوعیت کا ہے۔ سعودی عرب کا بیانیہ، جو گہری سطح پر وہابیت میں جڑیں رکھتا ہے، دولت اسلامیہ (ISIS) کے اُس طرزِ عمل سے مختلف ہے، جس میں وہ شیعہ مخالف جذبات کو بشار الاسد کی حکومت اور عراق کے شیعہ وزیراعظم کے خلاف اپنے سیاسی و معاشی مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مسلم دنیا میں فرقہ واریت کی کئی اقسام ایک ساتھ متحرک ہیں۔ کچھ سنی گروہوں اور ریاستوں نے فرقہ وارانہ بیانیے کو اپنے سیاسی، ثقافتی اور تعلیمی نظام کا حصہ بنا لیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، ان خطوں میں فرقہ واریت کو ادارہ جاتی شکل دے دی گئی ہے۔ سب سے نمایاں مثال سعودی عرب ہے، جہاں صدیوں پر محیط شیعہ دشمنی حبابی ہے۔ وہابیت کے بانی محمد بن عبدالوہاب نے شیعہ مخالف جذبات کو اپنے نظریے کا بنیادی ستون بنایا۔ سعودی عرب میں اسلامی تعلیم کی سرکاری تعبیر نہ صرف فرقہ وارانہ ہے بلکہ اسلام کے دیگر مکاتب فکر کی سخت مذمت پر مبنی ہے۔ ریاست اور اس کے حامی گروہ ہر سال لاکھوں امریکی ڈالر دعوتی سرگرمیوں پر خرچ کرتے ہیں، جن میں مساجد و مدارس کا قیام، میڈیا اداروں کی مالی معاونت شامل ہے، تاکہ اپنے مسلک کی تشہیر کی جاسکے۔ فرقہ وارانہ پالیسیوں اور بیانیوں کا مسلسل اور شعوری استعمال مشرق وسطیٰ کی سیاست کا مستقل حصہ بن چکا ہے، کیونکہ مختلف گروہ اپنے اپنے فرقہ وارانہ ایجنڈے کو آگے بڑھانے کے لیے پرعزم ہیں۔ بظاہر، ایسے تنازعات کے پیچھے کا فرما عنانہ صرخصوص گروہوں کو نشانہ بنانے کے لیے سرگرم ہیں۔ اس وقت شام اور عراق فرقہ وارانہ کشمکش کے دہکتے ہوئے مراکز ہیں، نہ اس لیے کہ شیعہ اور سنی یا دیگر گروہ پر امن بقائے

باہمی پریقین نہیں رکھتے، بلکہ اس لیے کہ کچھ بیرونی طاقتیں انہیں اس بات پر اکسار ہی ہیں کہ وہ اپنے اختلافات کا حل تشدد میں تلاش کریں۔ مختصر یہ کہ مشرق وسطیٰ میں سنی-شیعہ تنازعے کے کئی اسباب ہیں، اور ان میں بیرونی مداخلت بھی ایک نمایاں محرک ہے۔

سینیوں کو درپیش ذلت اور وہابیت کے مہلک اثرات نے عراق میں القاعدہ کو خاطر خواہ حمایت دلوائی، جس کے نتیجے میں 2003 کی امریکی یلغار کے بعد شیعہ اہداف اور مزارات پر بم دھماکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ خودکش حملوں اور کار بم دھماکوں میں بڑی تعداد میں شیعہ حباں بحق ہوئے۔ تاہم اگلے برسوں میں شیعوں نے بھی بڑی سطح پر سنیوں کو نشانہ بنایا۔ دونوں طرف سے فرقہ وارانہ قتل و غارت میں شدید اضافہ ہوا، یہاں تک کہ 2007 میں امریکی صدر لبش کے آپریشن ”سرج“ کے ذریعے صورت حال پر کچھ قابو پایا گیا، جس کے تحت اضافی 20000 امریکی فوجی عراق بھیجے گئے۔ امریکہ نے سنی قبائلی قیادت کو القاعدہ کے خلاف کھڑا کرنے کی ترغیب دی، مگر اس کے باوجود وہ نوری المالکی کی شیعہ اکثریتی حکومت سے خائف رہے۔ اس مخالفت نے عراق میں وہابی بیانیے کو مزید تقویت دی، جو بالآخر ”اسلامی ریاست عراق“ (Islamic State of Iraq ISI) کے ظہور کا سبب بنی۔ ایران کو بالواسطہ سزا دینے کے لیے سعودی عرب نے خطے سے اسلامی ریاست کی صفوں میں سب سے زیادہ جہادی بھیجے۔ دوسری جانب، شام اور عراق میں ایران نے حزب اللہ جیسے اپنے حامی گروہوں کو سعودی حمایت یافتہ سنی گروپوں کے مقابل کھڑا کرنے کے لیے مالی معاونت اور عملی مدد فراہم کی۔

اہم ترین سنی یا شیعہ انتہا پسند گروہوں جیسے القاعدہ، داعش یا حزب اللہ نے اپنی تحریکوں کو کبھی کھلے لفظوں میں فرقہ وارانہ بنیادوں پر متعین نہیں کیا۔ یہ گروہ عموماً اپنے جہادی اقدامات کو سامراج مخالف، صیہونیت مخالف اور امریکہ مخالف بیانیے کے تحت جواز فراہم کرتے ہیں۔ لبنان میں حزب اللہ نے ایک سیاسی ونگ قائم کر کے اب بیروت کی حکومت میں شراکت داری حاصل کر لی ہے۔ انہوں نے شام میں ایرانی ملیشیاؤں کے ساتھ مل کر جنگ لڑی اور یمن میں سعودی حمایت یافتہ سنی افواج کے خلاف جوہیوں کے ساتھ اتحاد کیا۔ سابق بعث پارٹی کے باقی ماندہ عناصر اور دنیا بھر سے آئے جہادی

جنگجو شام اور عراق میں اکٹھے ہوئے اور وہاں ”اسلامی ریاست“ کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے خطے میں شیعہ طاقت کے ابھار کے خلاف مزاحمت کے لیے سنی وہابی بیانیے کو بطور ہتھیار استعمال کیا۔

ابومصعب الزرقاوی، جس نے عراق میں القاعدہ کی شاخ قائم کی اور بعد ازاں ”اسلامی ریاست“ کی بنیاد رکھی، نے قدیم زمانے کے شیعہ مخالف فتاویٰ کو زندہ کر کے ایک فرقہ وارانہ خانہ جنگی بھڑکانے کی کوشش کی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ شیعہ اکثریت بالآخر سنی جہادی قوتوں کے سامنے ہتھیار ڈال دے۔ عراق میں جاری اس فرقہ وارانہ جنگ کے دوران تقریباً دو لاکھ پچاس ہزار افراد قتل ہوئے یا بے گھر کر دیے گئے۔

یہ ایک صدیوں پرانی روایت ہے کہ فرقہ وارانہ بیانیہ دوسرے فرقے کو انسانیت سے گرا ہوا تصور کرتا ہے۔ وہابی سنی شدت پسند شیعہ مسلمانوں کے لیے سخت اور توہین آمیز الفاظ استعمال کرتے ہیں، جیسے ”رافضی“ (یعنی دین کے منکر)، ”پوشیدہ ایرانی“ اور ”بدعتی“۔ اس کے برعکس، شیعہ اپنے سنی مخالفین کو ”تکفیری“ کہتے ہیں، یعنی وہ لوگ جو دوسرے مسلمانوں کو کافر قرار دیتے ہیں۔ حالیہ برسوں میں اسلامی دنیا میں اس قسم کی باہمی نفرت انگیزی کا یہ چکر شدت سے بڑھا ہے اور اس نے مسلم معاشروں میں مزید انتشار پیدا کیا ہے۔

اسلامی جمہوریہ ایران کی سیاسی قیادت نے بڑی دانائی سے مشرق وسطیٰ کی صورتحال کو سنی۔ شیعہ تنازع کے طور پر پیش کرنے سے گریز کیا ہے۔ ایران کے نرم گواہ اور باوقار وزیر خارجہ، جواد ظریف، ہمیشہ یہ موقف اختیار کرتے رہے کہ یمن، شام اور عراق کے تنازعات میں ایران درست سمت میں کھڑا ہے۔ انہوں نے یہ انتباہ بھی دیا کہ شدت پسند اور تکفیری گروہ نہ صرف شیعوں بلکہ سنیوں کے لیے بھی خطرہ ہیں۔ اسلامی جمہوریہ ایران نے مغربی جمہوری طاقتوں کو متنبہ کیا ہے کہ اگر وہ مشرق وسطیٰ میں طاقت کے توازن کو بگاڑ کر سلفی انتہا پسندوں کی حمایت کرتے رہے، تو اس کے سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔ یہ حقیقت ہے کہ اسلام کی تاریخ میں سنی اور شیعہ مسلمانوں نے ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگی کے ساتھ کہیں زیادہ وقت گزارا ہے بہ نسبت ان ادوار کے جب وہ آپس میں برسر پیکار رہے۔ بہت سے ممالک میں دونوں فرقوں کے افراد کے

درمیان باہمی شادیاں عام رہی ہیں، اور کئی مواقع پر وہ ایک ہی مسجد میں نماز بھی ادا کرتے ہیں۔ ان کا ایمان قرآن اور احادیث نبوی پر مشترک ہے اور وہ عبادات میں بھی یکسانیت رکھتے ہیں، اگرچہ ان کے فقہی آراء اور رسومات میں بعض اختلافات موجود ہیں۔

دونوں مسلک کی اپنی اپنی ذیلی شاخیں بھی ہیں۔ سنی مسلک چار روایتی فقہی مکاتب پر مشتمل ہے: حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی۔ ان میں سے آخری مکتب یعنی حنبلی فقہ نے سعودی عرب میں وہابی اور سلفی تحریکوں کو جنم دیا۔ ”سنی“ ایک وسیع اصطلاح ہے جو غیر شیعہ اسلام کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ سنی قرآن و سنت کی اہمیت پر متفق ہیں، تاہم فقہی آراء میں اختلاف کو تسلیم کرتے ہیں۔

شیعہ مسلک کی درج ذیل شاخیں ہیں:

* اثنا عشری: جو بارہ اماموں پر ایمان رکھتے ہیں۔

* اسماعیلی: جو سات اماموں کو مانتے ہیں۔

* زیدی: یمن میں رائج شیعہ فرقہ۔

* علوی: شام میں پایا جانے والا شیعہ مسلک۔

ایرانی حمایت یافتہ شیعہ گروہوں نے حالیہ برسوں میں شام، یمن، لبنان اور عراق میں سیاسی اور فرقہ وارانہ سطح پر فیصلہ کن کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ صدر بشار الاسد کی حکومت، جو 1970 سے برسرِ اقتدار ہے، بنیادی طور پر علوی فرقے کی حمایت پر قائم ہے۔ علوی، جو کہ شیعہ اسلام کی ایک غیر روایتی شاخ ہے، شام کی کل آبادی کا تقریباً 13 فیصد ہیں۔ علوی فرقے کے افراد ملک کی فوج اور سکیورٹی اداروں پر غالب ہیں اور شام کی خانہ جنگی میں اسد حکومت کی حمایت میں لڑنے والی افواج کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

عراق کے حیران و پریشان عرب ہمسایے، جن میں سعودی عرب اور اردن شامل ہیں، یہ بات سمجھنے سے قاصر رہے کہ امریکی انتظامیہ نے ایک اہم عرب ملک میں شیعوں کو اقتدار میں آنے کی اجازت کیسے دے دی۔ دوسری طرف، امریکہ کی نیت صرف عراق میں حکومت کی تبدیلی تھی، بغیر اس کے کہ اسے اس کے اثرات یا اسلام کی تاریخی فرقہ وارانہ دراڑوں کے پیچیدہ پہلوؤں کا

ادراک ہو۔ اردن کے بادشاہ عبداللہ دوم نے دی واشنگٹن پوسٹ کو ایک انٹرویو میں خبردار کیا تھا کہ عراق میں ایران کے بڑھتے ہوئے اثرات پورے مشرق وسطیٰ میں گونج سکتے ہیں اور تہران سے بغداد، اور لبنان سے دمشق اور صغتا تک ایک 'ہلال' نقاط پر شیعہ تحریک کا قیام ممکن ہو سکتا ہے۔ بعد میں بادشاہ عبداللہ نے اپنے بیان میں ترمیم کرتے ہوئے کہا کہ ان کا مطلب مذہب کے طور پر شیعہ نہیں تھا، بلکہ ایک ایسے فرقے سے تھا جسے سیاسی طور پر ایران کی حمایت حاصل ہے۔ مصر کے مطلق العنان حکمران حسنی مبارک نے اس بات کو ایک دوسرے انداز میں بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ عرب ممالک میں رہنے والے زیادہ تر شیعہ اپنے ملکوں کے بجائے ایران کے وفادار ہیں، بد قسمتی سے، اس نوعیت کے انتباہات میں ایک طرح کی حبذ باتیت اور مبالغہ کارنگ بھی جھلکتا ہے۔

عراقی شیعوں کی جانب سے 2020 میں نجف میں ایرانی قونصل خانے پر حملہ کر کے اسے نقصان پہنچانا اس بات کا ثبوت ہے کہ عرب ممالک کے شیعہ ایران کے نہیں بلکہ اپنے اپنے وطن کے وفادار ہیں۔ بظاہر شیعہ عرب، سنی عربوں کی طرح اپنے وطن سے وفادار ہیں، لیکن ان کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ انہیں اپنے عقیدے کے مطابق مذہبی آزادی حاصل ہو، جیسا کہ قطر، لبنان اور عمان جیسے ممالک میں دی جاتی ہے۔

فرقہ واریت کا جن بوتل سے نکل چکا ہے، لیکن شواہد اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ نسلی و قومی قوم پرستی (ethno-nationalism) فرقہ وارانہ جذبات کو معتدل اور کمزور کرنے لگی ہے، جیسا کہ عراق میں دیکھنے کو مل رہا ہے۔ عراق کے عام شیعوں میں ایران کے لیے ہمدردی کم ہوتی جا رہی ہے، بالخصوص اُس کے طرز حکومت کے حوالے سے۔ جولائی 2006 میں لبنان اور اسرائیل کے درمیان ہونے والی جنگ میں ایران نے اپنی شیعہ بھتیجی کی بنیاد پر شدت پسند تنظیم حزب اللہ کی مکمل حمایت کی۔ اب یہ واضح ہو چکا ہے کہ مشرق وسطیٰ کو دوبارہ ترتیب دینے کے امریکی-اسرائیلی منصوبے کے خلاف ایران اور حزب اللہ کے درمیان مکمل ہم آہنگی موجود ہے۔ ایران، فلسطینی تنظیم حماس کی بھی حمایت کرتا ہے، جو ایک واضح طور پر وہابی-سلفی تحریک ہے اور

اخوان المسلمون کی شاخ سمجھی جاتی ہے۔ فلسطینی مقصد کے ساتھ ایران کی کج بھتی کو عرب دارالحکومتوں میں سراہا ضرور جاتا ہے، لیکن ایران کو بطور ایک علاقائی طاقت تسلیم کرنا شاید عرب دنیا میں زیادہ پذیرائی حاصل نہ کر سکے۔

اس وقت یہ پیش گوئی کرنا آسان نہیں کہ مشرق وسطیٰ میں فرقہ وارانہ کشمکش کس کروٹ بیٹھے گی، اور اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان اگلی بڑی لڑائی کہاں اور کب برپا ہوگی۔ البتہ جو بات واضح ہے وہ یہ ہے کہ جب تک فرقہ واریت کے سائے اس خطے پر منڈلاتے رہیں گے، مشرق وسطیٰ کا مستقبل خطرے میں رہے گا۔ یہ ایک ایسا تنازع ہے جو جلد ختم ہوتا دکھائی نہیں دیتا، بلکہ عین ممکن ہے کہ یہ آئندہ برسوں میں دنیا بھر کے ایک ارب ساٹھ کروڑ مسلمانوں کے مستقبل کو شکل دے۔

باب سوم

مشرق وسطیٰ میں شیعہ ہلال کا عروج

لفظ ”شیعہ ہلال“ سب سے پہلے اردن کے بادشاہ عبداللہ نے اُس وقت استعمال کیا تھا جب 2005 کے پارلیمانی انتخابات سے قبل ایران پر عراق میں مداخلت کا الزام لگایا جا رہا تھا۔ ان کا اشارہ مشرق وسطیٰ کے ایک ایسے فرضی علاقے کی طرف تھا، جو ہلال (half-moon) کی شکل میں واقع ہے اور جہاں کی اکثریتی آبادی شیعہ اسلام کی پیروکار ہے، یا جہاں شیعوں کی ایک مضبوط اقلیت موجود ہے۔ بادشاہ دراصل اس بات کی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ اس پورے خطے میں شیعہ طاقت کا ابھرنا ممکن ہے۔ نتیجتاً، تمام سنی عراقیوں نے ان انتخابات کا بائیکاٹ کیا، جس کے نتیجے میں ایک شیعہ اکثریتی حکومت برسرِ اقتدار آ گئی۔ عمومی تاثر یہ تھا کہ شیعہ غالب عراق لازماً شیعہ ایران کے اثر میں آئے گا۔ وہ مذہبی رسوم و روایات، جو مختلف شیعہ برادریاں مشترک طور پر ادا کرتی ہیں، اُن ممالک کے مابین تعاون کی بنیاد فراہم کرتی ہیں جن میں شیعہ آبادی قابل ذکر حد تک موجود ہے، جیسا کہ علوی اکثریتی شام، عراق، اور بحرین۔ اگر اس اتحاد میں لبنان میں موجود حزب اللہ اور یمن میں زیدی فرقے کے با اثر شیعہ حوثیوں کو بھی شامل کر لیا جائے، تو وہ شیعہ ہلال مکمل ہو جاتا ہے جس کا ذکر بادشاہ عبداللہ نے مشرق وسطیٰ کے تناظر میں کیا تھا۔

27 دسمبر 2015 کو تہران میں منعقدہ عالمی اسلامی وحدت کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے

ایران کے صدر حسن روحانی نے تمام مسلم ممالک کو اتحاد کی دعوت دی اور اسلام کی عالمی شبیہ بہتر بنانے کی ضرورت پر زور دیا۔ انہوں نے کہا کہ ”ہمارے پاس نہ کوئی شیعہ ہلال ہے اور نہ سنی ہلال، بلکہ ایک اسلامی چاند ہے۔“ جنوری 2016 میں سعودی عرب کے ولی عہد محمد بن سلمان (MBS) نے اس کے برعکس کہا کہ عرب دنیا کو اب محض ایک شیعہ ہلال نہیں بلکہ ایک مکمل شیعہ چاند کا سامنا ہے جو یمن، لبنان، عراق اور شام میں ایران کے حامی گروہوں کی سرگرمیوں کے پھیلاؤ کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ ایرانی رہنما ہمیشہ اسلامی اتحاد پر زور دیتے آئے ہیں اور خارجہ پالیسی کے امور میں اسلامی جمہوریہ ایران کی شیعہ شناخت کو کم کر کے دکھاتے ہیں، لیکن ایران کی حکمت عملی واضح طور پر 2003 کے بعد سے مشرق وسطیٰ میں شیعہ مسلح گروہوں کی حمایت پر مرکوز رہی ہے۔ ایران نے ریاست سے باہر موجود عناصر کے ساتھ کام کر کے خطے میں اپنے اثر و رسوخ کو نمایاں طور پر بڑھایا ہے، اور ”شیعہ ہلال“ کے اُس مبینہ خفیہ تصور کو استحکام دیا ہے جو عراق، شام، لبنان اور یمن جیسے ممالک سے گزرتا ہے۔

شاہ عبداللہ کا کہنا تھا کہ شیعہ طاقت کا مرکز دراصل ایران ہے۔ تاہم، 2003 میں عراق پر امریکی حملے کے بعد سے عرب شیعہ برادریوں کے ساتھ ایران کا اثر و رسوخ مسلسل بڑھتا جا رہا ہے۔ ایران مشرق وسطیٰ میں ایک جارحانہ خارجہ پالیسی پر عمل پیرا ہے، چاہے وہ شام میں اپنے حمایتی گروہوں کے ذریعے جنگ ہو، یا عراق، شام اور لبنان کی سیاست پر کنٹرول حاصل کرنے کی کوشش ہو۔ ایران اور P5+1 ممالک (اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے پانچ مستقل ارکان اور جرمنی) کے درمیان جو ہری معاہدے پر دستخط کے بعد، ایران پر عائد بین الاقوامی اقتصادی پابندیاں عارضی طور پر ختم ہو گئی تھیں، مگر 2017 میں ٹرمپ انتظامیہ نے ان پابندیوں کو پہلے سے زیادہ سختی کے ساتھ دوبارہ نافذ کر دیا۔ سعودی عرب کو، بجا طور پر یہ خدشہ تھا کہ ان پابندیوں کے خاتمے کے بعد خطے میں ایران کی طاقت مزید بڑھے گی، خاص طور پر ان ممالک میں جہاں فرقہ واریت عروج پر ہے۔ دونوں فریقین کے درمیان دشمنی حقیقی ہے، تاہم بعض اوقات عرب قوم پرستی اس دشمنی پر غالب آجاتی ہے، جیسا کہ 2020 کے اوائل میں عراق میں ایران مخالف

مظاہروں کے دوران دیکھا گیا۔

خطے میں گروہی اتحادوں کے ضمن میں ایک اہم موڑ 1979 میں آیا، جب مصر نے اسرائیل کے ساتھ امن معاہدے پر دستخط کیے۔ اس معاہدے کے بعد خود کو تنہا محسوس کرتے ہوئے، شام کے صدر حافظ الاسد کو احساس ہوا کہ شام کو نئے اتحادیوں کی ضرورت ہے۔ ایران نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور شام کو لبنان میں اپنی اسٹریٹجک موجودگی برقرار رکھنے میں مدد فراہم کرنے کا اہم کردار ادا کیا۔ ایران نے شام کو حزب اللہ کے ذریعے عسکری اور اقتصادی امداد پہنچائی۔ اگرچہ دونوں ممالک کے درمیان تعلقات ہمیشہ سے نارسا اور ناپائیدار رہے ہیں، کیونکہ دونوں کے درمیان نظریاتی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ شام کی قیادت حافظ الاسد کے ہاتھ میں تھی، جو علوی فرقے سے تعلق رکھتے تھے، جو کہ شیعہ اسلام کا ایک ذیلی گروہ ہے، مگر مزاج میں سیکولر تھے اور صوفی سنی اسلام کے زیادہ قریب سمجھے جاتے تھے۔ اس کے برعکس، ایران ایک شیعہ اکثریتی ملک ہے جو 1979 سے علما کی حکمرانی میں اسلامی جمہوریہ کے طور پر کام کر رہا ہے۔ شام نے ایران کی پالیسیوں پر کبھی بھی واضح یا پختہ حمایت نہیں کی، بلکہ دونوں کے تعلقات مفادات کی بنیاد پر سودے بازی والے رہے۔ ایک موقع پر بشار الاسد نے اسرائیل کے ساتھ گولان ہائٹس پر مذاکرات کیے اور امریکہ کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کی خواہش ظاہر کی، اور اس کے بدلے میں ایران کے ساتھ تعلقات ترک کرنے کی پیش کش کی تھی۔

شام میں عرب بہار

شام میں شروع ہونے والی بغاوت، جو پہلے پہل پڑھ لکھے متوسط طبقے کی جانب سے تھی، مکمل خانہ جنگی میں تبدیل ہو گئی، جو صدر بشار الاسد کی حکومت اور ملک کی اکثریتی سنی آبادی کے درمیان چھڑ گئی۔ ابتداء ہی سے ایران نے بشار الاسد کا ساتھ دیا، اور لبنانی جنگجوؤں تک رسائی ممکن بنا کر شام کو عسکری مدد فراہم کی۔ ایران نے یہ بھی یقینی بنایا کہ سعودی عرب کو شام و لبنان (Levant) کے خطے میں اثر و رسوخ قائم نہ کرنے دیا جائے۔ تاہم، شام کی فوجی اور سیاسی اشرافیہ کا ایک بڑا حصہ، بشمول صدر بشار الاسد خود، اس بات سے فکر مند تھا کہ ایران پر حد سے

زیادہ انحصار، جنگ کے بعد کے تعمیر نو، اقتصادی ترقی اور مغربی دنیا سے سفارتی تعلقات کے امکانات کو محدود کر دے گا۔

ٹرمپ انتظامیہ بظاہر شام کو روس کے حوالے کرنے پر آمادہ نظر آئی۔ لیکن واشنگٹن کو یہ سمجھنا چاہیے تھا کہ درحقیقت وہ روس نہیں بلکہ ایران کے سامنے پسپا ہو رہا تھا۔ روس کا مقصد صرف شام میں اپنے فضائی اڈے برقرار رکھنا اور امریکہ کی خالی کردہ جگہ پر قبضہ جمانا تھا۔ اسرائیل کسی بھی صورت میں شام میں ایران کی بالادستی نہیں چاہتا تھا۔ تاہم، تہران برسوں سے شام سے متعلق سیاسی عزائم رکھتا تھا اور شام کو شیعہ اثر و رسوخ کے حامل ملک میں بدلنے کے لیے بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کر چکا تھا۔ یہ عمل حافظ الاسد کے دور میں ہی شروع ہوا تھا، جب شام بھر میں ایرانی تعلیمی اور ثقافتی اداروں کا جال بچھا یا گیا۔ اس کا مقصد شام کے تمام علاقوں میں تشیع (شیعیت) کو فروغ دینا تھا۔ شامی حکومت نے ایرانی مبلغین کو دمشق، علوی اکثریتی ساحلی علاقوں اور دیگر علاقوں میں آزادانہ سرگرمیوں کی اجازت دی۔ شام کے شہری و دیہی علاقوں میں جو سنی افسراد شیعہ مذہب اختیار کرتے، انہیں امداد کی تقسیم میں خصوصی مراعات دی جاتیں۔ رقبہ، جو بعد میں داعش نے قبضہ کر کے اپنی خلافت کا دار الحکومت قرار دیا، فرات کے کنارے واقع وہ شہر تھا جہاں ایران نے سب سے زیادہ سرمایہ کاری کی تھی۔ ایرانی فلاحی اداروں نے وہاں مساجد، امام بارگاہیں (حسینیات) اور دیگر عوامی عمارتیں تعمیر کی تھیں۔ لیکن اسلامک اسٹیٹ (داعش) کے وہابی۔ سلفی جنگجوؤں نے ان تمام عمارتوں اور شیعہ مذہب کی علامتوں کو تباہ کیا اور لوٹ لیا۔ 2009 تک، شام میں 500 سے زائد حسینیات موجود تھیں اور دمشق میں شیعہ مقدس مقامات کی بھرپور تزئین و آرائش کی جا چکی تھی۔

بشار الاسد کی وفادار افواج اور سنی بغاوتی گروپوں کے درمیان خونریز لڑائیاں ہوئیں، جن کی قیادت اسلامک اسٹیٹ (داعش) اور سعودی عرب کر رہے تھے۔ شامی حکومت کی افواج کو لبنان سے آنے والے سنی کٹروں رضا کاروں کی حمایت حاصل تھی، جو خود کو ابو الفضل العباس بریگیڈ کہلاتے تھے۔ یہ بریگیڈ امام حسین کے سوتیلے بھائی کے نام پر رکھی گئی تھی۔ حزب اللہ کے جنگجو بھی

لبنان۔ شام سرحد کے دیہی علاقوں میں متحرک تھے، خاص طور پر حمص کی جانب جانے والے راستوں پر۔ ان علاقوں میں ان کی موجودگی کا مقصد ایرانی اثر و رسوخ کے تحت علوی کنٹرول کے لیے علاقائی تسلسل (territorial continuity) قائم کرنا تھا۔ یہ تسلسل ایران کے لیے انتہائی اہم ہے، کیونکہ یہ لبنان اور دمشق کو علوی ساحل سے جوڑتا ہے۔ ایران کی یہ کوشش ہے کہ شام میں ایک ایسا ملیشیاؤں کا نیٹ ورک قائم کیا جائے جو اس سے وابستہ ہو، خواہ بشار الاسد کی حکومت قائم رہے یا نہ رہے۔ شام میں جنگ کی رفتار سست ضرور ہے، مگر بشار الاسد کے حامی دستے، امریکی مدد سے، داعش کے جنگجوؤں کی جگہیں اور ان کا علاقائی قبضہ کم کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ حزب اللہ ایک لبنانی قومی تحریک نہیں، بلکہ ایران کی تخلیق کردہ تنظیم ہے جو تہران کے مکمل اختیار میں ہے۔ حزب اللہ کے سربراہ حسن نصر اللہ، ایران اور اس کی مذہبی قیادت کے قریبی حلیف ہیں، اور یہ تنظیم ایرانی پٹرول ڈالر سے مالی اعانت حاصل کرتی ہے۔

تہران شام میں جنگ کے لیے عراق، متحدہ عرب امارات اور پاکستان سے رضا کار جنگجو بھرتی کرنے کی کوششیں کر رہا ہے۔ ایران کے لیے شام کی جنگ انتہائی اہم ہے، کیونکہ یہ ایک ایسے شدت پسند سنی بغاوتی دھڑے کے خلاف ہے جو شیعوں کو کافر سمجھتا ہے اور ان کے صفایا کو جائز مانتا ہے۔ ایرانی اسٹیبلشمنٹ اس جنگ کو اسلام کے اندرونی تنازع کے طور پر دیکھتی ہے۔ اگر شام میں وہابی۔ سلفی شدت پسند اور القاعدہ سے وابستہ گروہ کو شکست نہ دی گئی، تو ایران کے نزدیک یہ عناصر عراق میں بھی زور پکڑیں گے اور پھر خلیج فارس پر قبضے کی کوشش کریں گے، جو ایران کے علاقائی اثر و رسوخ کے لیے بڑا خطرہ بن جائے گا۔ اس پس منظر میں، قطر اور سنی عرب ممالک کے درمیان جاری کشیدگی نے ایران کے لیے ایک نادر موقع فراہم کیا ہے کہ وہ قطر کے ساتھ تعلقات مضبوط کرے، جو کہ خطے کی ایک اہم سنی عرب بادشاہت ہے۔

”قوس القوة“ یا ”شیعہ ہلال“ ایک استعارہ ہے جو ایران کے شیعہ نظام حکومت کے علاقائی غلبے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ایرانی اثر و رسوخ کا دائرہ اب عراق تک پھیل چکا ہے، جہاں ایران نے داعش کے خلاف شیعہ حکومت کے ساتھ مل کر لڑائی میں حصہ لیا۔ اس کے علاوہ یہ اثر

شام تک جاتا ہے، جہاں ایران نے علوی صدر بشار الاسد کی حکومت کو خانہ جنگی کے دوران بچائے رکھا۔ یہ دائرہ لبنان تک بھی پھیلا ہوا ہے، جہاں ایرانی حمایت یافتہ حزب اللہ ایک اہم قوت بن چکی ہے اور سیاسی جواز حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اسی طرح یمن میں، جہاں حوثی باغیوں نے حالیہ برسوں میں حکومت پر قبضہ کر لیا ہے اور سعودی فضائی حملوں کا سامنہ کر رہے ہیں، وہاں بھی ایران کا اثر دیکھا جاسکتا ہے۔ درحقیقت، 2003 میں عراق پر امریکی حملہ اور اس کے بعد آنے والی عرب بہار (Arab Spring) نے ایران کو عراق، یمن، بحرین اور شام میں اپنے اثرات بڑھانے کا موقع دیا، اور یوں ایران نے مشرق وسطیٰ کا نقشہ بدلنا شروع کیا۔ ایران کے اثر و رسوخ کے لیے ایک اہم سنگ میل 2005 کے عام انتخابات تھے، جن کے نتیجے میں شیعہ قیادت پر مبنی مخلوط حکومت عراق میں قائم ہوئی۔ اسی حکومت نے عراق کا پہلا آئین بھی مرتب کیا۔ 2014 میں جب داعش نے موصل اور دیگر سنی اکثریتی علاقوں پر قبضہ کیا اور بغداد کو خطرہ لاحق ہوا، تو صدر اوباما نے اعلان کیا کہ امریکہ فضائی مدد فراہم کرے گا۔ اس نازک وقت پر ایران مدد کے لیے آگے بڑھا اور فوجی مشیر اور ہتھیار روانہ کیے، جس کی مدد سے عراق نے بغداد کو بچایا۔ جب تکریت جو کہ صدام حسین کا گڑھ تھا، پر حملہ ہوا، تو تقریباً 20000 شیعہ ملیشیاؤں کو متحرک کیا گیا تاکہ وہ امریکی تربیت یافتہ عراقی فوجیوں کے ساتھ مل کر لڑیں۔

1991 میں عراق میں بغاوتوں کا ایک سلسلہ سامنے آیا، جو خلیجی جنگ کے دوران فائر بندی کے وقت جنوبی اور شمالی عراق میں عوامی بغاوتوں کی صورت میں پھوٹا۔ شیعہ گروہوں اور کردوں نے صدر صدام حسین کے خلاف ہتھیار اٹھالیے۔ عراقی عوام ایران-عراق جنگ اور خلیجی جنگ سے تھک چکے تھے، جنہوں نے ایک ہی دہائی میں ملک کی معیشت اور ترقی کو مکمل طور پر تباہ کر دیا تھا۔ صدر جارج ایچ ڈبلیو بش نے عراقی شیعوں اور دیگر باغی گروہوں کو صدام حسین کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے اور اسے اقتدار سے ہٹانے کی ترغیب دی تھی۔ لیکن کویت کی آزادی کے بعد امریکہ نے عراق کو تنہا چھوڑ دیا اور صدام حسین کی حکومت نے انتہائی ظالمانہ حربے استعمال کرتے ہوئے شیعہ اور کرد بغاوتوں کو کچل دیا۔ امریکی حکومت خاموشی سے متناشائی بنی رہی جب صدام

نے ہزاروں شیعہ اور کرد باشندوں کو قتل اور کیمیکل گیس سے ہلاک کیا۔ اس خون کی کارروائی کے نتیجے میں تمام نمایاں شیعہ علما اور تاجران بھاگ گئے جبکہ عام ایرانی عوام نے عراقی عوام کے ساتھ شدید ہمدردی محسوس کی۔ دوسری جانب، شام کئی دہائیوں تک ایران کا قریبی حلیف رہا۔ لیکن جب شام میں عوامی بغاوت شروع ہوئی، تو صدر بشار الاسد نے بے دردی سے اپنے ہی لوگوں کو قتل کیا، جو انتخابات اور قیادت میں تبدیلی کا مطالبہ کر رہے تھے۔

سعودی عرب نے صدر ابامام پر شام میں مداخلت کے لیے دباؤ میں اضافہ کیا، اور امریکی کانگریس کی آرڈسروسز کمیٹی کے رپبلیکن اراکین صدر اور وائٹ ہاؤس کو مشورہ دے رہے تھے کہ شام کے سنی اکثریتی شہروں کو نوفلائی زون قرار دیا جائے۔ تاہم، چیف آف اسٹاف جنرل مارٹن ڈیمپسی امریکی فوج کو شام بھیجنے اور نوفلائی زون قائم کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ 2012 میں جنرل پیٹریاس اور سیکریٹری بلیری کنٹنن نے شام کے باغیوں کو اسلحہ دینے کی تجویز دی، لیکن صدر ابامام نے اس کو مسترد کر دیا۔ بعد میں دیکھا جائے تو یہ فیصلہ درست ثابت ہوا، کیونکہ بعد میں تمام باغی گروہ ایک ہو کر داعش کا حصہ بن گئے اور یہ خدشہ درست نکلا کہ اسلحہ بالآخر داعش کے ہاتھوں میں چلا جاتا۔ اس کے باوجود، صدر ابامام نے بشار الاسد حکومت کے خلاف ریڈلائنز کھینچنے کی بات کی۔ انہوں نے واضح طور پر کہا تھا کہ اگر شامی حکومت نے کیمیائی ہتھیار استعمال کیے تو امریکہ براہ راست مداخلت کرے گا اور حکومت کو تبدیل کر دے گا۔ مگر 2013 میں، بشار الاسد کی حکومت نے متعدد بارز ہریلی گیس استعمال کی، جس کے نتیجے میں سینکڑوں عورتیں اور بچے ہلاک ہوئے۔ دنیا بھر میں ان کی ہولناک تصاویر پر شدید غم و غصہ پھیل گیا۔ حیران کن طور پر، وائٹ ہاؤس نے روسی چینل استعمال کرتے ہوئے، صدر پیوٹن کی ناشی میں امریکہ سے ایک معاہدہ کیا، جس کے تحت شام نے اپنے تمام کیمیائی ہتھیاروں کے حوالے کرنے اور متعلقہ کارخانے بند کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔

صدر اسد نے اس معاہدے پر رضامندی ظاہر کی کیونکہ پوری کارروائی روسیوں کی نگرانی میں انجام دی گئی تھی۔ بظاہر، صرف ایک حصہ کیمیائی ہتھیاروں کا شام سے باہر منتقل کیا گیا، جب کہ

باقی ہتھیار حکومت کے پاس ہی چھوڑ دیے گئے، جنہیں اسد حکومت نے سنی مزاحمت کے خلاف چن چن کر استعمال کیا۔ امریکہ کی جانب سے اسد حکومت کے خلاف مؤثر کارروائی نہ کر پانے نے القاعدہ اور داعش کے لیے شام میں جگہ بنانے کے دروازے کھول دیے، اور انہوں نے وہاں خلافت کے قیام کے ساتھ اپنا امارت قائم کر لی۔ ان شدت پسند گروہوں کی نمایاں اور جارحانہ موجودگی نے شام کو مزید ایران اور حزب اللہ کے قریب دھکیل دیا، تاکہ وہ سنی مزاحمتی گروہوں کے خلاف مؤثر جنگ لڑ سکیں۔ اب شام ایران کا اتحادی نہیں رہا بلکہ اس کا پراکسی (آلہ کار) بن چکا ہے۔

یمن میں عرب بہار

یمن میں عرب بہار کا آغاز 2011 میں اُس وقت ہوا جب ملک کے تعلیم یافتہ متوسط طبقے اور نوجوانوں نے آمر علی عبداللہ صالح کی جابرانہ اور بدعنوان حکومت کے خلاف تحریک چلائی۔ صالح نے مظاہرین پر بے رحمی سے گولیاں چلائیں اور ملک کی آبادی کا نصف سے زیادہ حصہ بنانے والے زیدی شیعہ حوثیوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ ایران نے حوثیوں کی بھرپور حمایت کی۔ بعد ازاں، علی عبداللہ صالح نے اپنے نائب صدر کے ساتھ ایک معاہدہ کرتے ہوئے استعفیٰ دے دیا اور خود کو قانونی کارروائی سے استثنیٰ دلوا لیا۔ لیکن بعد میں، اپنے جانشین سے انتقام لینے کی نیت سے صالح نے حوثی باغیوں کے ساتھ ساز باز کی اور ستمبر 2014 میں دارالحکومت صنعاء پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے صالح کے جانشین کو ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا، جو بعد میں ہمایہ ملک سعودی عرب میں پناہ گزین ہوا۔ جلد ہی، ایران اور اس کی حلیف ملیشیوں کی مدد سے حوثیوں کو اقتدار میں بٹھادیا گیا۔ جب یہ واقعات رونما ہو رہے تھے، امریکہ نے خود کو اس دلدل سے الگ رکھا، اور اس دوران ایران مکمل طور پر ایک بڑی علاقائی طاقت کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔

علی عبداللہ صالح نے عرب بہار کے دوران یمن کی صدارت سے دستبرداری کے بعد مسلسل آگ سے کھیلنے کا عمل جاری رکھا۔ سب سے پہلے، انہوں نے حوثیوں سے اتحاد کیا، ان دشمنوں سے جن سے وہ ایک دہائی تک لڑتے رہے تھے۔ بعد میں انہوں نے سعودی عرب سے اتحاد کیا، مگر

انہیں دھوکہ دیا۔ اُن کی 2017 میں موت متوقع تھی۔ حوثیوں نے صالح کو قتل کیا اور سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض کے ہوائی اڈے پر ایران سے حاصل شدہ ہیلکوپٹر میزائل داغے۔ یہ اُن کی بڑھتی ہوئی طاقت کی علامت تھی، جو کہ ایران کے علاقائی غلبے کی عکاسی بھی کرتی ہے۔ حوثی دارالحکومت صنعاء میں عوام اور جنرل پیپلز کانگریس، یعنی صالح کی سیاسی جماعت، کے ارکان کو سزا دینے کے درپے تھے۔ صالح کی ہلاکت کے بعد یہ بات واضح ہو گئی کہ یمن میں اب صرف حوثی ہی سب سے بڑی طاقت کے طور پر باقی رہ گئے ہیں۔ انہوں نے بارہا اپنی عسکری صلاحیتوں کو ثابت کیا اور صالح کے بچ جانے والے تمام عسکری دستے آخر کار ان کے ہاتھوں بے اثر کر دیے گئے۔ ایران اور حزب اللہ کی حمایت کے باعث حوثیوں نے یمن کے بڑے حصے پر قبضہ جمارکھا ہے۔ تاہم، ان کے زیر قبضہ وسیع علاقے میں بجلی کی شدید قلت ہے، جس کی وجہ سے یہ خطہ دنیا کی بدترین میضے کی وبا کا شکار ہو چکا ہے۔ اپنے خلاف سازشیں کرنے والوں پر قابو پانے کے لیے، حوثی انتظامیہ نے اپنے زیر انتظام علاقوں میں انٹرنیٹ تک رسائی کو بھی منقطع کر دیا ہے۔

سعودی ولی عہد محمد بن سلمان (ایم بی ایس) نے مایوسی کے عالم میں یمن میں اخوان المسلمون کی ہم منصب جماعت ”الاصلاح“ کے ساتھ مذاکرات کا آغاز کیا، جس کی قیادت اس وقت ریاض میں موجود تھی۔ حوثیوں نے جواباً اپنا اگلا ہیلکوپٹر میزائل داغا، اور اس مرتبہ ہدف ریاض میں ہونے والی اس ملاقات کا مقام تھا۔ اس حملے کے رد عمل میں، سعودی عرب نے صنعاء کے مختلف علاقوں پر فضائی حملے کیے، جن میں متعدد معصوم خواتین اور بچے جاں بحق ہو گئے اور کئی تاریخی و ثقافتی عمارات بھی تباہ ہو گئیں۔

یمن ایران کے لیے اسٹریٹیجک اعتبار سے اس لیے اہم ہے کہ یہ باب المندب کے اہم آبی راستے پر واقع ہے اور اس کی طویل سرحدیں سعودی عرب کے ساتھ ملتی ہیں، جو ایران کا علاقائی اور مسلکی دشمن ہے۔ اسی لیے ایران کا یمن میں مفادات تباہی اہم ہے جتنا شام، عراق اور لبنان میں ہے۔ ایران یمن کی دلدل میں سعودی عرب کو مزید گھسیٹنا چاہتا ہے تاکہ شام اور عراق میں مکمل کنٹرول حاصل کیا جاسکے۔ حوثیوں کی ایرانی پشت پناہی اور مداخلت سعودی قومی سلامتی کے لیے خطرہ بن چکی ہے۔ یمن کو بہانہ بنا کر ایران سعودی عرب پر دیگر علاقائی معاملات میں دباؤ

ڈال سکتا ہے، اور یوں خطے میں اس کی دلچسپی دراصل سیاسی نوعیت کی ہے۔ یمن کی خانہ جنگی میں سعودی عرب کے سامنے دو ہی راستے ہیں: پہلا یہ کہ جنگ جاری رکھے، لیکن انسانی بحران کی شدت بڑھنے کے باعث یہ راستہ زیادہ دیر تک قابل عمل نہیں رہ سکتا۔ اب تک سنی اتحاد افواج برسوں میں کوئی فیصلہ کن نتیجہ حاصل نہیں کر سکیں کیونکہ میدان جنگ میں سعودی فوجی موجود ہی نہیں۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ سعودی عرب حوثیوں سے براہ راست مذاکرات کرے تاکہ ایک پائیدار اور طویل مدتی حل نکالا جاسکے۔

ایران کے لیے ایک فیصلہ کن موڑ

2003 میں امریکہ کی عراق پر چڑھائی کے بعد مشرق وسطیٰ میں جغرافیائی سیاسی توازن میں بڑی تبدیلی واقع ہوئی۔ اس کے بعد کے برسوں میں عراق مسلکی تشدد کی لپیٹ میں آ گیا، جس سے خطے میں امریکی اثر و رسوخ کو شدید دھچکا پہنچا۔ ایران کی عراق میں دلچسپی دو چند ہو گئی، خاص طور پر کر بلا کے باعث بی ایک ایسا خطہ جو قرون وسطیٰ میں عظیم فارس کا حصہ رہا تھا۔ آج ایران ایک وسیع علاقے پر اثر و رسوخ رکھتا ہے جو بحیرہ روم سے لے کر وسطی ایشیا کی سرحدوں تک پھیلا ہوا ہے۔ لبنان میں موجود شدت پسند تنظیم حزب اللہ اور یمن کے حوثی قبائل اس کے مضبوط اتحادی ہیں۔ ایران نے جوہری ٹیکنالوجی میں بھی بڑی پیش رفت کی ہے، اور اب وہ بم سازی کے دہانے پر کھڑا ہے۔

تہران کی سیاسی قیادت نے بالغ نظری اور بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے امریکہ اور پانچ یورپی ممالک کے ساتھ ایک پُر امن معاہدے کی راہ اپنائی تاکہ جوہری اسلحہ سازی کے پروگرام کو معطل کیا جاسکے۔ اس معاہدے کے تحت ایران کو بنیادی سطح پر جوہری پروگرام جاری رکھنے کی اجازت دی گئی ہے اور امریکہ و یورپی اتحادیوں کی جانب سے عائد اقتصادی پابندیاں ختم کر دی گئی ہیں۔ شاید اس معاہدے کا سب سے بڑا اثر یہ ہو کہ یہ امریکہ اور ایران کے درمیان مشرق وسطیٰ میں تعاون کے لیے ایک بہتر تناظر فراہم کرتا ہے، جہاں دونوں کے مفادات سب سے زیادہ باہم مربوط ہیں۔ امریکہ اور ایران دونوں داعش کو ختم کرنا چاہتے ہیں، اور دونوں ہی مشرق

وسطی اور افغانستان میں القاعدہ کو کمزور دیکھنا چاہتے ہیں۔ شام میں ایران روس کے ساتھ مل کر اسلامی ریاست کے جنگجوؤں کو فرات کے کنارے کے تمام علاقوں سے باہر نکالنے میں مصروف ہے۔ امریکہ بشار الاسد کو اقتدار سے ہٹانا چاہتا ہے، جبکہ ایران اور روس کا موقف ہے کہ اسد کی معزولی سے سنی جہادی دوبارہ شام میں مضبوط ہوں گے، جو امریکہ کے لیے بھی ناقابل قبول منظر نامہ ہے۔ امریکی انتظامیہ کے لیے سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ وہ ان بڑے سنی ممالک کے ساتھ تیز و ترقیاتی تعلقات استوار کرے جو دنیا بھر میں وہابی نظریات پھیلانے اور عرب و غیر عرب مسلم نوجوانوں کو شدت پسند جہاد کی راہ پر ڈالنے کے ذمہ دار ہیں۔ نوجوان اور تعلیم یافتہ مسلم نسل سوشل میڈیا کے خفیہ نیٹ ورکس سے متاثر ہو رہی ہے، جو داعش کے رضا کاروں کی میزبانی میں چل رہے ہیں اور انہیں مختلف انداز کی پُر تشدد کارروائیوں پر اکساتے ہیں، جن میں خود کش بم دھماکوں جیسے مہلک اقدامات بھی شامل ہیں۔

بین الاقوامی ایٹمی توانائی ایجنسی (IAEA) کے ڈائریکٹر جنرل، یوکیا آمانو نے بارہا یہ وضاحت کی ہے کہ ویانا میں قائم یہ ادارہ تکنیکی نوعیت کا ہے، نہ کہ سیاسی، اور اس کی کارکردگی کو محض حقائق کی بنیاد پر جانچا جانا چاہیے۔ ستمبر 2017 میں IAEA نے اپنی رپورٹ میں واضح کیا کہ ایران نے مشترکہ جامع عملی منصوبے (JCPOA) کے تحت 2015 میں ایران، P5+1، ممالک اور یورپی یونین کے درمیان طے پانے والے معاہدے پر مکمل طور پر عمل درآمد کیا ہے۔ یہ آٹھویں مرتبہ تھا کہ ایجنسی نے اپنی باقاعدہ رپورٹس میں، جنہیں JCPOA کے تحت پیش کرنا لازمی قرار دیا گیا ہے، اس بات کی تصدیق کی کہ جوہری معاہدہ مؤثر طور پر کام کر رہا ہے، اور ان رپورٹس میں ایک بار بھی یہ نہیں پایا گیا کہ ایران نے اس معاہدے کی خلاف ورزی کی ہو۔

ایک عجیب و غریب اقدام کے تحت، صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے تمام ماہرین کی آراء کو نظر انداز کرتے ہوئے ایران کو مشترکہ جامع عملی منصوبے (JCPOA) کی خلاف ورزی کا مرتکب قرار دے دیا، حالانکہ کوئی ثبوت موجود نہ تھا۔ 8 مئی 2018 کو ٹرمپ نے JCPOA سے امریکہ کی دستبرداری کا اعلان کر دیا۔ نومبر 2018 میں، امریکہ کی طرف سے ایران پر دوبارہ پابندیاں عائد کردی گئیں، جن

کے نتیجے میں ایران کو اپنی پالیسیوں میں بڑی تبدیلیاں لانا پڑیں، جن میں خطے میں ملیشیاؤں کی حمایت اور ہیلٹک میزائلوں کی تیاری شامل تھی۔ واشنگٹن ڈی سی اور یورپی ممالک کے تمام سکیورٹی ماہرین کی متفقہ رائے تھی کہ ٹرمپ انتظامیہ کا ایران سے متعلق یہ رویہ خطرناک اور نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔

امریکی خارجہ پالیسی کو ”متبادل حقائق“ کی بنیاد پر نہیں بنایا جاسکتا۔ حیرت انگیز طور پر، اس وقت اقوام متحدہ میں امریکی سفیر کی ہیلی نے اس معاہدے سے دستبرداری کا جواز پیش کرنے کی کوشش میں خلاف ورزیوں کا حوالہ دیا، جو درحقیقت سرے سے ہوئی ہی نہیں تھیں۔ اُن کا دعویٰ تھا کہ ایران میں سینکڑوں مشتبہ مقامات کی تفتیش نہیں کی گئی، جو کہ حقیقت کے منافی تھا اور یورپی اتحادیوں کی رائے کے بھی برخلاف تھا۔ بین الاقوامی ایٹمی توانائی ایجنسی (IAEA) ایران کے جوہری پروگرام کی مکمل معلومات رکھتی ہے اور کسی بھی دوسرے ادارے کے مقابلے میں بہتر طور پر جانتی ہے۔ لہذا جب IAEA نے اپنی رپورٹ میں یہ واضح کیا کہ ایران اپنے وعدوں پر عمل پیرا ہے، تو اس رپورٹ کو ہر سطح پر تسلیم کیا گیا، سوائے شاید صدر ٹرمپ کے، جو اپنے مزاج میں غیر متوازن دکھائی دیتے تھے۔ 5 جنوری 2020 کو بغداد ایئر پورٹ پر امریکی حملے میں ایرانی جہاز قاسم سلیمانی کی ہلاکت کے بعد ایران نے اعلان کیا کہ وہ اب اس معاہدے کی پابندی کا پابند نہیں رہے گا، لیکن وہ اب بھی IAEA کے ساتھ تعاون جاری رکھے گا، جس سے اس بات کا امکان باقی رہا کہ ایران مستقبل میں دوبارہ معاہدے کی شرائط پر عملدرآمد کر سکتا ہے۔

ایران کی عسکری صلاحیتیں

گزشتہ دہائی کے دوران ایران کی عسکری ترقی اس کے اہم ترین اثاثوں میں شمار ہوتی ہے۔ ایرانی ساختہ فوجی ساز و سامان اب عراق، شام اور لبنان کی علاقائی اسلحہ مارکیٹ میں ایک اہم عنصر بن چکا ہے، جہاں ایران نہ صرف حکومتوں بلکہ ملیشیا گروہوں کے ساتھ بھی تجارت کرتا ہے۔ جون 2017 میں، ایران نے پہلی بار شام میں دولت اسلامیہ کے اہداف پر درمیانے فاصلے تک مار کرنے والے میزائل داغے۔ اس نے کامیابی سے طویل فاصلے تک مار کرنے والے ہیلٹک میزائل، مرکزی جنگی ٹینک، بغیر پائلٹ کے فضائی جہاز (ڈرونز)، اور مقامی طور پر

تیار کردہ آبدوزیں اور حملہ آور کشتیاں تیار کیں اور ان کا تجربہ کیا۔ ایران کی حکمت عملی یہ ہے کہ وہ سرحد پار شیعہ یکجہتی کے فروغ کے ذریعے اپنی طاقت میں اضافہ کرے تاکہ پابندیاں ہٹنے کے بعد معیشت کو تقویت دی جاسکے۔

صدر پوتن کی شام میں 2015 میں براہ راست فوجی مداخلت نے ایران اور روس کو ایک اسٹریٹجک صفحے پر لا کھڑا کیا، جو سعودی-امریکی اتحاد کے مقابلے میں ایک طاقتور مخالف قوت کے طور پر ابھرا۔ مشرق وسطیٰ میں فی الوقت شاید سب سے منظم اور جارح اتحاد اسلامی جمہوریہ ایران کے گرد جمع ریاستوں کا بلاک ہے۔ یہ اتحاد واضح اسٹریٹجک اہداف، مضبوط نظریاتی پشت پناہی، اور مشرق وسطیٰ میں مزاحمتی قوتوں کی طویل عرصے سے حمایت کا تجربہ لے کر پُر عزم انداز میں آگے بڑھ رہا ہے۔ روس کی مداخلت اور امریکہ کی پسپائی نے ایران اور اس کے اتحادیوں کو علاقائی سیاق میں زیادہ طاقتور بنادیا ہے۔ ایران اس وقت خطے کے کئی تنازعہ زدہ علاقوں میں اپنے حمایتی گروہوں کی سرگرمی سے مدد کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ، کویت، سعودی عرب اور بحرین میں شیعہ آبادیوں کے درمیان کئی ایرانی فلاحی ادارے بھی متحرک ہیں۔

ایران کا اسٹریٹجک ہدف مشرق وسطیٰ میں، اور بالآخر پوری اسلامی دنیا میں، ایک غالب طاقت کے طور پر ابھرنا ہے۔ وہ خطے میں امریکہ کے اثر و رسوخ کا خاتمہ چاہتا ہے۔ صدر ڈوملڈ ٹرمپ کی ایران مخالف بیان بازی، جس میں انہوں نے جوہری معاہدے کی دوبارہ توثیق سے انکار کیا، اُس وقت بھی جاری رہی جب کہ بین الاقوامی جوہری توانائی ایجنسی (IAEA) نے باقاعدہ ریکارڈ پر رکھا کہ ایران معاہدے کی تمام شرائط کی مکمل پاسداری کر رہا ہے۔ درحقیقت، یورپی اتحادیوں اور معاہدے کے دیگر فریقوں نے واضح کر دیا تھا کہ اگر امریکہ اس معاہدے سے علیحدہ بھی ہو جائے، تب بھی وہ اس معاہدے کو امریکہ کی حمایت کے بغیر آگے بڑھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ایران اپنی سرگرمیوں سے ایک متصل جغرافیائی زنجیر قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو ایران-عراق سرحد سے بحیرہ روم تک پھیلی ہو، اور خلیج فارس کے عرب علاقوں تک پہنچے، تاکہ

سعودی عرب کے اٹرو سوخ کو اس خطے میں کم کیا جاسکے۔ اس پیش قدمی سے ایران ایک زمینی راستہ حاصل کرنے کے قریب ہے جو تہران سے بغداد کے راستے بحیرہ روم تک جائے گا۔ یہ راستہ ایران کو اس قابل بنائے گا کہ وہ حزب اللہ کو عراق، افغانستان اور پاکستان سے اسلحہ اور جنگجو فراہم کر سکے۔ ایسا زمینی رابطہ سعودی عرب اور اسرائیل کے لیے ناقابل برداشت ہے۔ صدر ٹرمپ نے ریکارڈ پر کہا تھا کہ امریکہ شام میں حکومت کی تبدیلی میں دلچسپی نہیں رکھتا، بلکہ صرف داعش کو شکست دینا چاہتا ہے۔ تاہم 9 ستمبر کو امریکی افواج نے کرد اور عرب جنگجوؤں کو دیرالزور کے شمال میں دھکیل دیا۔ زمینی امریکی کمانڈرز کا کہنا تھا کہ وہ اپنے اتحادیوں، جنہیں ”شامی جمہوری فورسز“ (SDF) کہا جاتا ہے، کو دریائے فرات کی وادی کے ساتھ جنوب کی طرف بڑھانا چاہتے ہیں تاکہ وہ عراقی سرحد کے قریب واقع علاقوں جیسے البوکمال پر قبضہ کر لیں، قبل اس کے کہ شامی حکومت اور اس کے اتحادی وہاں پہنچیں۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ بڑی طاقتیں آپس میں براہ راست نہ ٹکرائیں، امریکہ نے روس سے رابطہ کیا اور کہا کہ وہ شامی افواج کو دریائے فرات عبور کرنے سے باز رکھے۔

یہ روس کے مفاد میں ہے کہ وہ شامی افواج کو دریائے فرات کے پار دھکیلے، رقبہ پر حملہ کرے اور عراقی سرحد کی جانب پیش قدمی کرے۔ ادھر، عراق میں موجود تجربہ کار اور مکمل طور پر مسلح شیعہ ملیشیاں بھی سرحد پار کرنے کے ارادے سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ ان کا مقصد عراقی سرحد پر قبضہ کرنا اور واپس آ کر اس شاہراہ کو کنٹرول کرنا ہے جو مغرب کی طرف اردن اور شام تک جاتی ہے۔ امریکہ، اسرائیل کے دباؤ میں، روس پر زور دے رہا ہے کہ وہ گولان کی پہاڑیوں سے اسد فورسز اور ان کے اتحادیوں کو ہٹائے، تاکہ بغاوت کرنے والی افواج کے ساتھ جنگ بندی کو توسیع دی جاسکے اور جنوبی شام میں جنگ کا خاتمہ ہو۔ اسد حکومت کا مقصد اردن کے ساتھ سرحدی گزرگاہ پر کنٹرول حاصل کرنا ہے، جو امریکی اسپیشل فورسز کے اڈے المتف کے قریب واقع ہے اور بغداد سے دمشق تک کی شاہراہ پر موجود ہے۔

مغربی سفارت کار بشارا الاسد کے ممکنہ زوال کے حوالے سے خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔ وہ ایک

آمر ہے جس نے لاکھوں اپنے ہی ہم وطنوں کو قتل کیا ہے، اور مزید لاکھوں کو لڑنے والے گروہوں کے ہاتھوں مرنے کے لیے چھوڑ دیا ہے، جس کے نتیجے میں تاریخی اور تہذیبی شہروں کو مبلے کا ڈھیر بنا دیا گیا۔ شام کے وہ باصلاحیت افراد جو ملک کی تعمیر نو کر سکتے تھے، یورپ اور ہمسایہ ممالک کی طرف ہجرت کر چکے ہیں۔ جو باقی بچ گئے ہیں، وہ ایک ناکارہ ریاست میں غربت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ صدر ٹرمپ کی انتظامیہ اور اسرائیلی وزیراعظم ٹینن یا ہودو نوں کو جس بات کا خوف لاحق ہے، وہ دمشق میں ایران کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کا ہے، جو آنے والے وقت میں مزید مضبوط ہو سکتا ہے، کیونکہ ایران اس بکھرتی ہوئی ریاست کو سہارا دے رہا ہے اور اس کی تعمیر نو میں مدد کر رہا ہے۔

اسرائیلی انٹیلی جنس کا دعویٰ ہے کہ ایران جلد ہی شام میں فضائی اور بحری اڈے قائم کرے گا، اور اس کے ساتھ ساتھ ملک میں معدنیات کی کان کنی کے حقوق بھی حاصل کرے گا۔ ایرانی کمپنیوں نے پہلے ہی تیل، گیس اور زراعت کے شعبوں میں منافع بخش ٹھیکے حاصل کر لیے ہیں۔ 12 ستمبر 2017 کو ایران نے تباہ حال شہر حلب کے لیے بجلی گھر درآمد کرنے کا معاہدہ کیا۔ حال ہی میں ایک ایرانی کمپنی نے شام کے تیسرے سب سے بڑے موبائل فون نیٹ ورک کو چلانے کے لیے بھی معاہدہ کیا ہے۔ دوسری طرف، اسرائیل اعلیٰ ترین سطح پر کوششیں کر رہا ہے۔ حتیٰ کہ صدر پوٹن سے بھی بات چیت کر رہا ہے تاکہ ایرانی اثر و رسوخ کو روکا جاسکے اور خطے میں اس کی طاقت کو محدود کیا جاسکے۔ روس کا تزویراتی مفاد یہ ہے کہ بشار الاسد اقتدار میں برقرار رہے، اور یہ صرف حزب اللہ اور ایران کی حمایت سے ممکن ہے۔ اسرائیل کو یقیناً اپنی سرحد کے قریب حزب اللہ کے جنگجوؤں کی موجودگی پر تشویش ہے۔ 2006 میں اس نے اسرائیل کو نقصان پہنچایا تھا اور لبنان کے ساتھ سرحدی جنگ کا نتیجہ برابری پر ختم ہوا تھا۔ شامی خانہ جنگی نے حزب اللہ کو ایک ملیشیا سے ترقی دے کر ایک ایسی پیشہ و فوج بنا دیا ہے جو بریگیڈ سطح کی جنگیں لڑنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ بظاہر یہی نظر آ رہا ہے کہ آنے والے برسوں میں ایران کا اثر و رسوخ عراق سے لے کر بحیرہ روم تک مضبوطی سے قائم رہے گا۔

ایران نے شام کی فرقہ وارانہ جنگ میں ہزاروں شیعہ افغانوں کو تربیت دے کر shock troop کے طور پر تعینات کیا۔ ان افغان جنگجوؤں کی یونٹ، ”فاطمیون ڈویژن“ کہلاتی ہے، جن کے یونیفارم پر ایران کے سپریم لیڈر کی مدح پر مبنی ایک نشان کندہ ہوتا ہے جو ان کے لیے باعثِ فخر ہے۔ اب یہ خدشہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ افغانستان ایران اور سعودی عرب کے درمیان اگلا فرقہ وارانہ میدانِ جنگ بن سکتا ہے، ایران جو شیعوں کا خود ساختہ محافظ ہے، اور سعودی عرب جو قدامت پسند سنی عقائد کا دیرینہ حامی رہا ہے۔ بہت سے افغان شیعہ جنگجوؤں کو اس وقت ایرانی پاسپورٹ دیے گئے جب انہیں شام بھیجا گیا تا کہ وہ لبنانی حزب اللہ کے ساتھ مل کر اس دنواز حکومت کی حمایت میں لڑیں۔ یہ جنگجو اب واپس بامیان صوبے کے اپنے دیہاتوں کو لوٹ آئے ہیں، وہی بامیان جہاں 2001 میں طالبان کی قیادت نے 300 سے زائد شیعوں کا قتل عام کیا تھا۔ عراق میں ایک شیعہ ملیشیا ”حرکت حزب اللہ النجباء“ نے، جو مذہبی رہنما اکرم الکعبی کی قیادت میں سرگرم ہے، داعش سے قصبہ ”قیروان“ واپس حاصل کیا جو دمشق کے ساتھ زمینی راستے کی حکمتِ عملی کے لحاظ سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ النجباء گروہ، جس کے جنگجوؤں کی تعداد دس ہزار سے تجاوز کر چکی ہے، اس وقت عراق کی سب سے طاقتور ملیشیاؤں میں شمار ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ گروہ مکمل طور پر عراقی عرب شیعوں پر مشتمل ہے، مگر اس کی وفاداری تہران کے ساتھ ہے، اور یہ ایران کو دمشق تک ایک محفوظ رسد گاہ قائم کرنے میں مدد دے رہا ہے۔ یہ رسد گاہ ایک سلسلہ وار قصبوں سے گزرے گی، جن میں قیروان بھی شامل ہے۔ اس راستے کو کھولنے کے لیے، ایران کی حمایت یافتہ ملیشیاؤں جنوب مشرقی شام کی جانب پیش قدمی کر رہی ہیں یعنی اُس علاقے میں جہاں امریکی افواج کی بھی کچھ تنصیبات موجود ہیں۔

نجباء ملیشیا ایران کے اُس وسیع تر منصوبے کی ایک مثال ہے جس کے ذریعے وہ عراق اور پورے خطے میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانا چاہتا ہے۔ اکرم الکعبی بارہا کہہ چکے ہیں کہ نجباء کا جھکاؤ ایران کی جانب ہے۔ انہوں نے وضاحت کی کہ یہ گروہ ”ولایتِ فقیہ“ کے نظریے پر کاربند ہے، جو کہ ایران کے مذہبی نظامِ حکومت کی نظریاتی بنیاد ہے۔ اگر ایران اس زمینی راستے کو

کھولنے میں کامیاب ہوتا ہے، تو وہ عراق اور شام کے ذریعے لبنان میں موجود حزب اللہ تک براہ راست رسائی حاصل کر لے گا۔ ایران، جو شام میں اسد حکومت کا حامی ہے، واضح کر چکا ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ اس کا اثر و رسوخ عراق سے لے کر دمشق اور وہاں سے آگے حزب اللہ تک پھیلے۔

ایران جو زمینی راستہ عراق کے ذریعے کھولنے کی کوشش کر رہا ہے، وہ دراصل اُس کی پہلی ترجیح نہیں تھا۔ جب ایران نے 2011 میں شام کی جنگ میں مداخلت کی، تو اس نے شمالی عراق کے کرد علاقے سے ایک لاجسٹک سپلائی لائن کھولنے کی کوشش کی، لیکن کرد قیادت نے اس پر سخت ناراضی ظاہر کی۔ بہر حال، موجودہ نیا راستہ کرد علاقوں کو نظر انداز کرتے ہوئے متبادل کے طور پر تجویز کیا گیا۔ اگر ایران اس راستے کو فعال بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے، تو سنی آبادی بے دخل ہوگی، کردستان کے خطے کو خطرہ لاحق ہوگا اور مسیحی برادری بھی زدیں آئے گی۔ عالم دین اکرم الکعبی، جنہوں نے ایک متلون مزاج جنگجو کے طور پر اپنا کیریئر شروع کیا، نجباء ملیشیا کی قیادت کر رہے ہیں۔ شام کے تنازعے کے دوران نجباء نے اتحادیوں کے ساتھ مل کر ایک سخت گیر جنگی قوت کے طور پر خود کو منوایا۔ گروہ نے تیزی سے ترقی کی: اسلحہ بڑھا، افراد میں اضافہ ہوا، وسائل بڑھے اور ان سب کے لیے سرمایہ ایران سے فراہم کیا گیا۔

ایرانی قوم پرستی

سپاہ پاسداران انقلاب اسلامی (Islamic Revolutionary Guard) کی وردی پہنے نوجوان ایرانی، جنہوں نے شام، یمن اور عراق میں اپنی جانیں قربان کیں، آج اسلامی جمہوریہ کے نئے قومی ہیرو قرار دیے جا رہے ہیں۔ ان کے عکس بڑے شہروں اور قصبوں کے ہر چوراہے پر بل بورڈز کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ برسوں کی بددلی، طنز و تحقیر اور مایوسی کے بعد، ایران کی متوسط طبقے کی آبادی ایک نئی قومی ولولہ انگیزی کی لہر میں ڈوب گئی ہے۔

یہ رویے میں تبدیلی جو کئی برسوں سے تشکیل پا رہی تھی، دو باہم مربوط عوامل کی دین ہے: ٹرمپ حکومت کی جانب سے ایران مخالف بیانیے کا شدت اختیار کرنا، اور سعودی عرب جیسے فرقہ وارانہ حریف ملک کے ساتھ بڑھتی ہوئی علاقائی برتری کی کشمکش۔ ایران کا متوسط طبقہ اس وقت خوفزدہ

ہو گیا جب امریکی صدر نے ایران کے جوہری معاہدے کو تاریخ کا بدترین معاہدہ قرار دیا اور اسے ختم کرنے کی دھمکی دی، جبکہ یہ معاہدہ امریکہ سمیت تمام بڑے یورپی اتحادیوں کی شمولیت سے طے پایا تھا۔ یورپی یونین نے واضح کر دیا کہ جب تک ایران IAEA کے ضوابط پر عمل کر رہا ہے اور معاہدہ موثر ہے، وہ امریکہ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ ایرانی عوام اُس وقت اور زیادہ دل شکستہ ہوئے جب صدر ٹرمپ نے مئی 2017 میں سعودی عرب کے دورے کے دوران سعودی بادشاہ سلمان اور دیگر رہنماؤں کے ساتھ روایتی 'جنگی رقص' میں شرکت کی۔ اپنے امریکی مہمانوں کو خوش کرنے کے لیے، سعودی حکومت نے امریکہ کے فوجی-صنعتی ادارے سے اربوں ڈالر کے فوجی ساز و سامان خریدنے پر بھی رضامندی ظاہر کر دی۔

1979 کے اسلامی انقلاب کے بعد پہلی بار ایرانی عوام کو کچھ ایسا میسر آیا ہے جس پر وہ فخر کر سکتے ہیں اور جشن منانے کا جواز رکھتے ہیں۔ ایران کی قیادت میں کام کرنے والے ملیشیاؤں نے شام اور عراق میں داعش کو شکست دینے میں مرکزی کردار ادا کیا ہے، اور یمن میں سعودی قیادت میں کام کرنے والی اتحادی افواج کے مقابلے میں برتری حاصل کی ہے، جس سے خطے میں ایران کا اثر و رسوخ نمایاں طور پر بڑھا ہے۔ آج ایران، جو فلم اور موسیقی جیسے تخلیقی شعبوں میں سرگرم ملک ہے، وہاں دوسب سے مقبول قومی ہیرو نہ فنکار ہیں، نہ گلوکار، بلکہ سیاسی اور انتظامی دائرے کی دو نمایاں شخصیات ہیں: جنرل قاسم سلیمانی، جو ایران کے علاقائی فوجی مہم کے قائد تھے اور حال ہی میں قتل کیے گئے، اور محمد جواد ظریف، جو ایران کی معتدل اور متوازن آواز کے طور پر جانے جاتے ہیں۔

اس نئے قومی رجحان کی بنیاد اس وقت پڑی جب 2013 میں اعتدال پسند رہنما حسن روحانی کو ملک کا صدر منتخب کیا گیا۔ یہ 2009 کے صدارتی انتخابات کے بعد بی جنہیں بڑے پیمانے پر دھاندلی زدہ سمجھا گیا تھا، سڑکوں پر کیے جانے والے شدید احتجاج کو کچلنے کے بعد، شہری متوسط طبقے کے لیے پہلی کرن امید تھی۔ ریاست کی تھیو کریٹک (مذہبی) نظریاتی ساخت طویل عرصے سے ایک مصنوعی قوم پرستی پر مبنی رہی ہے، جس میں شیعہ اسلام سے متعلق ہر شے کو عظیم و مترا دیا

جاتا تھا، اور ایران کی قبل از اسلام تاریخ کو مکمل طور پر نظر انداز یا رد کر دیا جاتا تھا۔ تاہم، اکتوبر 2017 میں ایرانی حکومت نے ایک اہم علامتی قدم اٹھایا۔ اس نے ایران کے سابق بادشاہ، شاہ ایران کے ایک عظیم الشان محل کو ایک بڑے ملٹی میڈیا ثقافتی مظاہرے کے لیے استعمال کرنے کی اجازت دی، جس میں فنکاروں نے ایران کی قبل از اسلام تاریخ پر مبنی مشہور رزمیہ نظم شاہنامہ (کتاب الملوک) کے کچھ حصے دوبارہ پیش کیے۔ اس تقریب کے دوران، داریوش کبیر کے عظیم قدیم محل پر سیپولس کی تصویری جھلکیاں محل کی عمارت پر دکھائی گئیں۔ اس روح پرور ثقافتی محفل میں 5000 سے زائد خاندانوں نے شرکت کی، جن میں مرد حضرات عمدہ سوٹ پہنے ہوئے تھے اور خواتین ڈیزائنر لباس میں ملبوس تھیں۔ یہ منظر، جو کبھی ریاستی سنسرشپ اور مذہبی سخت گیری کا مرکز رہا، اب ایک نئی قومی شناخت اور تہذیبی روایت کی طرف واپسی کا پیغام دے رہا تھا۔

قطر اور مشرق وسطیٰ کی نئی مساوات

خلیجی تعاون کونسل (GCC) سے قطر کی بے دخلی نے ایران کو ایک اہم سفارتی موقع فراہم کیا، جس کے ذریعے اُس نے قطر کے ساتھ، روس اور ترکی کے ساتھ مل کر، ایک نیا سفارتی اتحاد قائم کر لیا ہے۔ ایران کے پاس اپنی سرحدوں سے باہر عسکری طاقت کے مظاہرے کے لیے زمینی اور فضائی افواج کی کمی ہے۔ اس کمی پر قابو پانے کے لیے وہ بیلجک میزائل پروگرام کو ترقی دے رہا ہے اور علاقائی غیر متوازن تنازعات کو اپنے فائدے میں استعمال کر رہا ہے۔ ایران جزوی طور پر اس کوشش میں کامیاب رہا ہے کہ وہ سعودی عرب کو دیگر سنی عرب ممالک جیسے قطر اور ترکی سے چالاکی سے علیحدہ کر دے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی انقلاب کے بعد پہلی بار مشرق وسطیٰ میں قطر (ایک عرب سنی ریاست)، ترکی (سنی قوت) اور ایران (شیعہ ریاست) ایک ہی صف میں نظر آ رہے ہیں۔ ترکی نے قطر میں ایک فوجی اڈہ قائم کر لیا ہے، اور اس کی منصوبہ بندی ہے کہ وہ مستقبل میں اس اڈے پر مزید فوجی تعینات کرے گا۔ یہ بدلتی ہوئی سفارتی مساوات مشرق وسطیٰ کے روایتی طاقت کے توازن کو نئی شکل دے رہی ہے۔

سعودی شاہی خاندان نے صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے ”امریکہ فرسٹ“ ایجنڈے کو اپنے مفاد میں

استعمال کرتے ہوئے امریکہ میں ایک ارب امریکی ڈالر سے زائد کی سرمایہ کاری کا وعدہ کیا، جس میں مملکت کے لیے دفاعی ساز و سامان کی خریداری بھی شامل تھی۔ اس سے صدر ٹرمپ کو امریکہ میں روزگار کے مواقع پیدا ہونے کے حوالے سے گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ بظاہر یوں لگا کہ سعودی فنڈز صدر کی بیٹی ایوانکا ٹرمپ کے زیر سرپرستی خواتین کے لیے شروع کیے گئے نئے اقدام میں بھی استعمال ہوں گے۔ تاریخی طور پر، سعودی شاہی خاندان نے ہمیشہ پیٹر وڈالرز کو اپنے خاندانی تحفظ کو یقینی بنانے اور امریکہ و یورپی جمہوری قوتوں کی توجہ اسلامی دہشت گردی کے مسئلے سے ہٹانے کے لیے استعمال کیا، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی دہشت گردی کی جڑیں وہابیت اور سلفیت میں پیوست ہیں، جسے سعودی عرب نے 1979 سے منظم طور پر فروغ دیا۔

مئی 2017 میں سعودی عرب نے ریاض میں اسلامی دنیا کے سربراہان مملکت کا ایک اجلاس منعقد کیا، جس میں ایران اور اس کے اتحادیوں کو مدعو نہیں کیا گیا۔ اپنے استقبالیہ کلمات میں سعودی فرماں روا شاہ سلمان نے کہا کہ تہران کی حکومت ”دہشت گردی کی برجھی کا سرا“ ہے۔ صدر ٹرمپ نے اپنی تقریر میں غیر سفارتی زبان استعمال کرتے ہوئے کہا: ”تمام باضمیر اقوام کو ایران کو تنہا کرنے کے لیے مل کر کام کرنا چاہیے۔“ انہوں نے یمن کے اس المناک تنازعے کو یکسر نظر انداز کیا، جہاں امریکی جنگی طیاروں کی مدد سے معصوم شہریوں پر بمباری کی گئی، اور جہاں لاکھوں لوگ خوراک کی شدید قلت کی وجہ سے فاقہ کشی کا شکار ہیں۔ ترک صحافی مصطفیٰ آقیول نے نیویارک ٹائمز میں اپنے کالم میں لکھا: ”یہ سارا اجلاس ایک ”سنی عالمی اتحاد“ جیسا محسوس ہوا، جس میں مسلم دنیا کی سب سے بڑی غیر سنی طاقت، ایران، کو امریکی صدر اور ان کے سنی میزبانوں نے نشانہ بنایا۔“ یہ سمجھنے کے لیے راکٹ سائنس کی ضرورت نہیں کہ تمام انتہا پسند اسلامی دہشت گرد گروہوں کی فکری بنیاد وہابیت ہے، جو سخت قدامت پسند اخلاقیات اور عدم برداشت پر زور دیتی ہے، اور یہی سعودی عرب کا سرکاری مذہبی نظریہ ہے۔

ایران کے وزیر خارجہ، جواد ظریف نے لندن میں قائم عربی نیوز نیٹ ورک العربیہ الجدید کی ویب سائٹ پر شائع ایک مضمون میں لکھا کہ ریاستی سرپرستی میں پروان چڑھنے والا قدامت پسند

مذہبی نظریہ و ہابیت، سنی مسلمانوں میں انتہا پسندی کے فروغ کا اصل سبب ہے، اور صدر ٹرمپ کو سعودی شاہی خاندان پر دباؤ ڈالنا چاہیے کہ وہ شدت پسندی کو ہوا دینا بند کرے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اپنے دورہ سعودی عرب کے دوران صدر ٹرمپ نے اس بارے میں کچھ بھی نہیں کہا۔ اس کے برعکس، وہ سعودی حکومت کے زیر انتظام ”انتہا پسند نظریات سے نمٹنے کے لیے قائم عالمی مرکز“ کے افتتاحی اجلاس میں شریک ہوئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک ایسی ریاست، جو خود اپنی سرکاری آئیڈیالوجی کے ذریعے نفرت، عدم برداشت اور شدت پسندی کو دنیا بھر میں پھیلا رہی ہے، وہ انتہا پسندی سے کیسے نمٹ سکتی ہے؟

اکثریتی شیعہ آبادی والے عراق اور سنی قیادت میں چلنے والے سعودی عرب کے تعلقات 1990 میں عراق کی جانب سے کویت پر حملے کے بعد کئی دہائیوں تک کشیدہ رہے۔ لیکن صدر ڈونلڈ ٹرمپ اور ان کی قومی سلامتی کی ٹیم نے ایران کو تنہا کرنے کی کوششوں میں حد سے بڑھ کر سعودی عرب پر زور دیا کہ وہ عراق کے ساتھ اپنے اختلافات ختم کرے اور اس کے قریب آئے۔ تاہم، دونوں ممالک کے تعلقات اب بھی تنگ و تنگ اور بد اعتمادی کا شکار ہیں۔ حالیہ برسوں میں سعودی عرب نے بغداد میں اپنا سفارت خانہ دوبارہ کھولا اور پچیس سال کے وقفے کے بعد سعودی ایئر لائن کی پروازیں بھی بحال کی گئیں۔ لیکن جب ایران، جو سعودی عرب کا دیرینہ حریف ہے، عراق میں ایک طاقتور کھلاڑی کے طور پر ابھرا، تو یہ پیش رفت ریاض اور واشنگٹن دونوں کے لیے حیران کن تھی۔ بد قسمتی سے موجودہ امریکی انتظامیہ نے اپنی مشرق وسطیٰ کی سلامتی پالیسی کو مکمل طور پر ایران کو تنہا کرنے کے ارد گرد گھمایا ہے، کیونکہ وہ ایران کو ایک ایسا مفسد عنصر سمجھتے ہیں جو اسرائیل اور خطے میں دیگر امریکی اتحادیوں کے لیے وجودی خطرہ بن چکا ہے۔

ولی عہد محمد بن سلمان (ایم بی ایس) کو حالیہ عرصے میں عراق کے شیعہ دھڑوں سے تعلقات استوار کرنے کی کوششوں سے حوصلہ ملا، خاص طور پر رہنماؤں جیسے کہ مقتدی الصدر اور ایران کے قریب سمجھے جانے والے عراقی وزیر داخلہ قاسم الاعرجی کے ساتھ روابط سے۔ ان دونوں رہنماؤں کو جولائی 2017 میں سعودی عرب اس امید کے ساتھ مدعو کیا گیا کہ وہ مقتدی الصدر اور دیگر شیعہ رہنماؤں کو

ایران کے اثر و رسوخ کے مقابلے میں ایک توازن قائم کرنے والے کردار کے طور پر تیار کر سکیں۔

عراق مشرق وسطیٰ کا واحد عرب ملک ہے جہاں عرب شیعہ آبادی کی اکثریت ہے۔ ایران نے اس حقیقت سے فائدہ اٹھا کر فرقہ واریت کو ہوادی اور عراقی شیعوں کی وفاداری حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس کے برعکس، سعودی عرب کی حکمت عملی یہ ہے کہ عرب قوم پرستی کو پھر سے زندہ کر کے عراقیوں کو فارسی ایران کے خلاف کھڑا کیا جائے۔ عرب قوم پرستی اس وقت زوال پذیر ہوئی جب امریکہ نے عراق پر حملے کے بعد بعث پارٹی پر پابندی لگا دی۔ ایران نواز کئی دھڑے عراق اور سعودی عرب کے درمیان بڑھتے تعلقات کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے رہنما اس بات کو اجاگر کرتے ہیں کہ داعش میں شامل ہونے والے 3000 سے زائد سعودی شہری تھے، جو سعودی عرب پر انگری اٹھانے کا جواز فراہم کرتا ہے۔ نجف جیسے مقدس شیعہ شہر میں سعودی قونصل خانہ کھولنے کی بھی مخالفت کی جا رہی ہے۔ اس کے باوجود سعودی عرب کی ”دل جیتنے کی مہم“ عراق میں رفتہ رفتہ کامیاب ہو رہی ہے۔ مقتدی الصدر جیسے کئی حلقے ایران کی گہری مداخلت کو فارسی سلطنت کی نوآبادیاتی کوشش کے طور پر دیکھتے ہیں۔ تاہم محمد بن سلمان کی عراق سے متعلق سفارتی کوششیں جاری ہیں، کیونکہ خطے میں ان کی مجموعی حکمت عملی ایران کو تنہا کرنا ہے۔

سعودی عرب کو لبنان میں حزب اللہ کا کوئی متبادل فراہم کرنے والا کوئی مقتدی الصدر نہ مل سکا۔ 1990 میں لبنانی خانہ جنگی کے خاتمے کے بعد سے، حزب اللہ شیعہ اکثریتی جنوبی لبنان اور جنوبی بیروت میں مضبوطی سے قدم جمائے ہوئے ہے۔ ایرانی حمایت سے حزب اللہ نے وہاں اسکول اور اسپتال قائم کیے ہیں، کاروباری قرضے فراہم کیے ہیں، اور حالیہ پارلیمانی انتخابات میں امیدوار بھی کھڑے کیے ہیں۔ وہ سعد الحریری کی قیادت والی موجودہ قومی اتحاد حکومت میں بھی ایک اہم فریق ہے۔ اس کی عسکری صلاحیتیں اور جنگی مہارتیں شام اور یمن میں نمایاں طور پر نظر آئی ہیں۔ حزب اللہ نے اسرائیلی سرحد کے قریب ہزاروں ہیلٹک میزائل تعینات کیے ہیں۔ اس کے علاوہ، اس کے پاس زیر زمین فائبر آپٹک مواصلاتی نیٹ ورک، کئی بنکرز اور رسد کے لیے خفیہ سرنگوں کا نظام بھی موجود ہے۔ گزشتہ تین دہائیوں میں حزب اللہ کا مرکزی مقصد اسرائیل کو دور رکھنا رہا ہے۔

لبنان میں حزب اللہ

حزب اللہ لبنان میں ایک ایسی طاقت بن چکی ہے جسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ اس کے جنگجو وقت یمن اور شام میں براہ راست لڑائیوں میں مصروف ہیں۔ اس نے افغانستان اور پاکستان سے تعلق رکھنے والے شیعہ جنگجوؤں کی ایک بٹالین بھی تیار کی ہے، جو ان تمام محاذوں پر سرگرم ہے جو ایران کے لیے اہم ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ حزب اللہ نے عراق، شام اور یمن میں نئے عسکری گروہوں کو بھرتی کرنے، تربیت دینے اور اسلحہ فراہم کرنے میں بھی مدد کی ہے، تاکہ ایرانی ایجنڈے کو آگے بڑھایا جاسکے۔ یہ جماعت 1980 کی دہائی میں ایران کی مالی مدد سے اس مقصد کے تحت قائم کی گئی تھی کہ جنوبی لبنان سے اسرائیلی قبضہ ختم کرایا جاسکے۔ وقت کے ساتھ ساتھ حزب اللہ ایران کی پاسدارانہ انقلاب کی ایک عملی شاخ بن چکی ہے، جو پورے خطے میں سرگرم شیعہ ملیشیاؤں کے جال کو باہم جوڑنے والا رابطہ فراہم کرتی ہے۔ ایران اور حزب اللہ ایک دوسرے کی تکمیل ہیں۔ یہ دونوں ایسی شیعہ قوتیں ہیں جو ایک ایسے خطے میں واقع ہیں جہاں سنی اکثریت ہے۔ ایران کے لیے، جو ایک فارسی ملک ہے اور عرب بولنے والے ہمسایہ ممالک سے گھرا ہوا ہے، حزب اللہ محض ایک عسکری قوت نہیں بلکہ عربی بولنے والے جنگجوؤں اور ایجنٹوں کی ایسی فورس ہے جو عرب عوام کے ساتھ آسانی سے گھل مل سکتی ہے۔ یہی وہ اسٹریٹجک اور عسکری اثاثہ ہے جس نے مشرق وسطیٰ کے تنازعات کی سمت پر گہرا اثر ڈالا ہے۔

ایران کی قیادت میں سرگرم شیعہ ملیشیاؤں کے پارٹیکلر دوسرے کے ساتھ تعاون کر رہی ہیں۔ حزب اللہ کے جنگجو خبہ (ایلیٹ) کمانڈوز کے طور پر جانے جاتے ہیں، جو افغان، پاکستانی اور عراقی جنگجوؤں کو تربیت دیتے ہیں اور سنی جنگجوؤں کے ساتھ مل کر لڑتے ہیں، یہ سب ایران کی مجموعی قیادت کے تحت انجام پاتا ہے۔ عربی زبان میں ”حزب اللہ“ کا مطلب ہے ”اللہ کی جماعت“، اور یہ لبنان کی ایک شیعہ سیاسی جماعت ہے جس کے ایران کے ساتھ گہرے نظریاتی تعلقات ہیں۔ ان میں سے اکثر ”ولایت فقیہ“ کے عقیدے کو ماننے ہیں، یعنی ایران کا سپریم لیڈر نہ صرف سیاسی اختیارات کا سب سے بڑا مالک ہے بلکہ اعلیٰ ترین مذہبی اہتارٹی بھی

ہے۔ ان کے پاس سنی جہادی گروہوں جیسے القاعدہ اور داعش کے خلاف لڑنے کے لیے ٹھوس وجوہات موجود ہیں، علاوہ ازیں ان کا مقابلہ امریکہ اور اسرائیل جیسے دشمنوں سے بھی ہے۔ تہران کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کی وجہ سے ایران اور اس کے اتحادی، سعودی عرب، اسرائیل اور امریکہ جیسے ممالک کے عسکری اور سفارتی اقدامات کا ہدف بن چکے ہیں، جو حزب اللہ کو ایک دہشت گرد تنظیم تصور کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حزب اللہ اتنے محاذوں پر فعال ہو چکی ہے اور اتنے دشمنوں کے خلاف برسرِ پیکار ہے کہ بعض مخالفین نے اسے ایران کی بلیک واٹر بھی کہا ہے، وہی بدنام زمانہ نئی کرائے کی فوج جو مختلف جنگی تنازعات میں استعمال کی جاتی رہی ہے۔

شام میں حزب اللہ نے اپنی سب سے بڑی غیر ملکی سرمایہ کاری کی ہے اور افرادی قوت کے لحاظ سے سب سے زیادہ قربانیاں دی ہیں۔ اس کے رہنما اس جنگ کو اسرائیل، امریکہ اور سعودی عرب کی ایک سازش قرار دیتے ہیں، جس کا مقصد داعش اور القاعدہ جیسے سنی انتہا پسند گروہوں کو استعمال کر کے شام کو تباہ کرنا اور خطے میں ایران نواز محور کو کمزور کرنا ہے۔ ان کے نزدیک، اس صورتحال میں براہِ راست مداخلت کرنا اور ’محور شر‘ کے خلاف مزاحمت فراہم کرنا ایک دینی فریضہ ہے، جسے وہ ایمان اور وفاداری کی علامت سمجھتے ہیں۔

ایران کی مشرق وسطیٰ سے متعلق پالیسی

ایران کی مشرق وسطیٰ کی پالیسی کا رہنما اصول شیعہ قوت کا فروغ ہے۔ اسی لیے تہران کی حکومت نے مشرق وسطیٰ میں شیعہ جماعتوں اور ملیشیاؤں کی سرپرستی کی ہے، جس انداز میں ماضی میں سرد جنگ کے دوران ماسکو نے تیسری دنیا کی کمیونسٹ تحریکوں کی پشت پناہی کی تھی۔ تہران نے مختلف پر کسی افواج کے ذریعے سعودی اثر و رسوخ کو پیچھے دھکیلنے اور اپنا دائرہ اثر بڑھانے کی کوشش کی۔ تاہم یہ فیصلہ ہونا بھی باقی ہے کہ کیا ایران کی خارجہ پالیسی میں فرقہ واریت کو شامل کرنا ایک مہنگی غلطی ثابت ہوگا یا نہیں۔ ایک طرف تو یہ پالیسی مؤثر ثابت ہوئی ہے اور اس نے خطے میں ایران کی طاقت میں اضافہ کیا ہے۔

سنی عرب ممالک، جو امریکہ کے اسرائیل کے ساتھ تعاون کے دباؤ کی وجہ سے سعودی یکم

سے دور ہو رہے ہیں، اب ایران کے قریب آگئے ہیں۔ حال ہی میں، قطر اور ترکی جیسے ممالک نے ایک نیا گروپ تشکیل دیا ہے جس کی سرپرستی روس کر رہا ہے۔ روس اور چین کے ساتھ قریبی اور ترقیاتی تعلقات ایران کی طاقت میں اضافہ کرتے ہیں کیونکہ یہ امریکہ کی جانب سے تہران کو تنہا کرنے کی کوششوں کا توازن قائم کرتے ہیں۔ روس اور چین کی جانب سے ایران کے خلاف سخت اقدامات کی مخالفت نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں اس کے خلاف پابندیوں کی قراردادوں کو مستقل طور پر روک رکھا ہے۔ روس ایران کو اسلحہ اور جوہری مواد فروخت کرتا ہے، جب کہ چین ایران سے تیل خریدتا ہے اور اسے صارفین کی اشیاء فراہم کرتا ہے۔

ایران کے پاس ایک جدید اور خوشحال ریاست کے تمام بنیادی ڈھانچے موجود ہیں، تیل اور گیس کے ذخائر (بالتربیب دنیا میں چوتھے اور دوسرے بڑے)، 35 سال سے کم عمر کی نوجوان آبادی، ترقی یافتہ انفراسٹرکچر اور اچھی مواصلاتی سہولیات۔ 2012 تک، اس جمہوریہ میں فی کس ایک سے زیادہ موبائل فون تھے، اور انٹرنیٹ صارفین کی تعداد 5 کروڑ سے زیادہ تھی، جو سعودی عرب اور مصر کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ یہاں ڈیجیٹل ٹیلنٹ کی بڑی تعداد ہے، اور ایران سالانہ تقریباً 5 کروڑ امریکی ڈالر مالیت کا سافٹ ویئر برآمد کرتا ہے۔ ایرانی خواتین فی کس میک اپ پر دنیا بھر میں سب سے زیادہ خرچ کرتی ہیں؛ نوجوان نسل خاص طور پر فیشن کے حوالے سے حساس ہے اور اکثر نوجوان خواتین سیاہ عباؤں کے نیچے چھوٹے اسکرٹس اور جدید کپڑے پہنتی ہیں۔ ایرانی کھانے، خرچ کرنے اور خریداری کے دلدادہ ہیں، اور بین الاقوامی برانڈز کی سرپرستی جاری رکھے ہوئے ہیں۔

ایران اور سعودی عرب جنہیں جغرافیائی طور پر خلیج فارس جدا کرتی ہے، کے درمیان علاقائی محاذ آرائی فرقہ وارانہ، سیاسی اور معاشی رقابتوں کی جڑیں بہت گہری ہے۔ یہ دونوں ممالک اسلام کے دو متحارب ممالک کی پیروی کرتے ہیں، جن کے درمیان تشدد کی طویل تاریخ ہے، اور وہ مختلف ممالک میں اکثر تشدد پر کسی جنگیں لڑ رہے ہیں۔ سعودی عرب کے اندرونی مسائل کی ایک وجہ اس کی خارجہ پالیسیوں میں مسلسل ناکامی بھی ہو سکتی ہے۔ 2015 میں ایران نواز حوثی باغیوں کے خلاف شروع کی گئی سعودی فوجی مداخلت جس کا آغاز بڑے طعمرق سے کیا گیا تھا اب ایک سیاسی دلدل

بن چکی ہے۔ ولی عہد اور de facto حکمران محمد بن سلمان (MBS) اس مسئلے کو مسلسل ٹالتے جا رہے ہیں، جس کے نتیجے میں یہ ایک بہت بڑے انسانی المیے کی شکل اختیار کر گیا ہے۔

سعودی عرب کا قطر اور اردن کے ساتھ تنازعہ چھوٹے عرب ممالک کو ایران کے قریب لے آیا ہے۔ ترکی مشرق وسطیٰ میں ایک اہم طاقت کے طور پر ابھر رہا ہے، جس کے قطر اور ایران کے ساتھ قریبی تعلقات ہیں۔ اس اتحاد نے امریکہ کے اثر و رسوخ کا مقابلہ کرنے کے لیے روس کو بھی اس معادلے میں شامل کر لیا۔ شام میں، سعودی حمایت یافتہ سنی جہادی گروہ بشار الاسد کی حکومت کو گرانے میں ناکام رہے۔ پوتن کی جارحانہ پالیسیوں کے تحت شامی صدر بشار الاسد کو مکمل بحری، فضائی اور عسکری مدد فراہم کی گئی۔ زمینی سطح پر شیعہ ملیشیاؤں اور ایران کے حمایت یافتہ پر کسی گروہوں نے اس جنگ میں غلبہ حاصل کیا اور داعش کے جنگجوؤں کو وہاں سے اکھاڑ پھینکا۔

ریاض نے لبنان میں انتشار پیدا کرنے کی ناکام کوشش کی جب اس نے سعد حریری کو، ان کے ریاض کے نجی دورے کے دوران، استعفیٰ دینے پر مجبور کیا۔ سعودی حکومت کا منصوبہ تھا کہ وہ اس اتحادی حکومت کو گرا دے جس میں حزب اللہ ایک اہم شراکت دار ہے۔ لبنان میں سنی مسلمانوں اور عیسائیوں کے ساتھ اختیارات کی شراکت داری کے معاہدے کے تحت، حزب اللہ سے تعلق رکھنے والے شیعہ ارکان پارلیمان اسپیکر کی کرسی پر فائز ہیں۔

سعودی عرب اور اس کے اتحادی ایران کی خارجہ پالیسی کو فرقہ وارانہ اور توسیع پسندانہ تصور کرتے ہیں۔ ان کا موقف ہے کہ ایران سیاسی بے چینی سے فائدہ اٹھا کر اپنے شیعہ عسکری حلیفوں کی مدد کرتا ہے اور خطے میں سنی اکثریتی نظام کو کمزور کر رہا ہے۔ ان کے نزدیک ایران کا حتمی مقصد ایک بین الاقوامی، ایران نواز شیعہ سیاسی نظام قائم کرنا ہے جو ایران سے لبنان اور عراق سے شام تک پھیلا ہو جو کسی حد تک از سر نو زندہ ہونے والی فارسی سلطنت کے مترادف ہے۔ بلاشبہ، اسلامی جمہوریہ ایران کی خارجہ پالیسی کا مقصد اس کے تزویراتی مفادات کا حصول ہے اور ان پالیسیوں میں فرقہ واریت کا اہم کردار ہے۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایران نے اپنی بیشتر تاریخ میں غیر فرقہ وارانہ راستہ اپنایا ہے۔ یہاں تک کہ آج بھی وہ سنی اکثریتی قطر

اور ترکی کا حلیف ہے۔

ایران کی خارجہ پالیسی میں فرقہ وارانہ عناصر امریکی حملہ عراق اور 2011 کی عرب بہار کے بعد نمایاں طور پر بڑھ گئے۔ سلفیت سے متاثر سنی جہادیت کے عروج اور دولت اسلامیہ (اسلامک اسٹیٹ) کے ذریعے پھیلائے گئے شدت پسند مخالف شیعہ بیانیے نے عراق، شام، بحرین اور یمن میں جاری تنازعات کو مزید بھڑکا دیا۔ ایک دوسرے کے ارادوں سے خائف ایران اور سعودی عرب کے رویے واضح طور پر فرقہ وارانہ رخ اختیار کر گئے۔ ایران نے جب یہ محسوس کیا کہ اس کے اتحادی عراق، شام اور یمن میں خطرے میں ہیں تو اس نے اپنے حامی شیعہ بیانیے کو دوگنا کر دیا تاکہ اپنے علاقائی مفادات اور سرمایہ کاری کا تحفظ کر سکے۔ ایران کی سپاہ پاسداران انقلاب (IRGC) اس کی اولین عسکری تنظیم ہے اور مشرق وسطیٰ میں جاری نیابتی جنگوں سمیت تمام تہذیبیاتی سرگرمیوں میں مرکزی کردار ادا کر رہی ہے۔

ایران کی خارجہ پالیسی دو سطحوں پر مشتمل ہے، جن کی نگرانی اس کا سپریم لیڈر کرتا ہے۔ یہ دونوں سطحیں اس کی اتھارٹی کے تابع ہوتی ہیں، لیکن مواد اور طرز عمل میں مختلف ہوتی ہیں۔ پہلی سطح ریاست در ریاست (State-to-State) پالیسی ہے، جس کا انتظام زیادہ تر تہران میں قائم منتخب حکومت سنبھالتی ہے۔ دوسری سطح غیر ریاستی عناصر (Non-State Actors) کے ساتھ ایران کے تعلقات پر مبنی ہے، جس کی نگرانی سپاہ پاسداران انقلاب (IRGC) کرتی ہے اور جس کا بیشتر حصہ ایرانی پارلیمان سے باہر طے کیا جاتا ہے۔ ایران امریکہ دشمنی اور صیہونیت مخالف بیانیے کا سب سے بلند آواز ملک ہے۔ اس کے سب سے پرجوش اتحادی غیر ریاستی عناصر ہیں، جو زیادہ تر شیعہ اسلام پسند گروہ ہیں۔ ایران کا اپنے مسلم ہمسایہ پاکستان کی نسبت بھارت سے تعلق مشہور طور پر زیادہ قریب ہے۔ حال ہی میں ایران نے بھارت کے تعاون سے چاہار بندرگاہ تیار کی ہے تاکہ بھارت کو افغانستان اور وسطی ایشیا کے ساتھ تجارت کے لیے آسان رسائی فراہم کی جاسکے۔

دفاعی بجٹ کے لحاظ سے ایران ہر سال تقریباً 6.3 ارب امریکی ڈالر اپنی دفاع پر خرچ کرتا

ہے، جبکہ سعودی عرب کا دفاعی بجٹ 56 ارب امریکی ڈالر ہے۔ بظاہر یہ فرق بہت بڑا نظر آتا ہے، لیکن جب یہ بات ذہن میں رکھی جائے کہ سعودی عرب امریکہ سے مہنگے داموں اسلحہ خریدتا ہے، تو یہ فرق اتنا حیران کن نہیں رہتا۔ ظاہر ہے کہ اسلحے کی خریداری میں شاہی خاندان کے شہزادوں کو کلک بیکس (رشوت یا کمیشن) بھی دی جاتی ہے۔ ایران، جو اپنی زیادہ تر دفاعی ضروریات اندرون ملک تیار شدہ ہتھیاروں سے پوری کرتا ہے، راکٹ ٹیکنالوجی میں قابل ذکر کامیابی حاصل کر چکا ہے۔ ٹھوس عسکری ساز و سامان کے اعتبار سے سعودی عرب ایران سے آگے ہے، خاص طور پر لڑاکا طیاروں اور حملہ آور ہوائی جہازوں کی تعداد میں۔ ایران کے زیادہ تر طیارے پرانے امریکی ماڈلز ہیں جو شاہ ایران کے دور سے باقی ہیں۔ تاہم، ایران اب روس اور چین سے جدید طیارے حاصل کر رہا ہے جو ایرانی فضائیہ میں استعمال ہو رہے ہیں۔ جہاں تک بحری طاقت کا تعلق ہے، ایران کے پاس خاطر خواہ بحری جہاز اور آبدوزیں ہیں، جن میں سے کئی روس سے حاصل کی گئی ہیں اور کچھ ایران میں ہی تیار کی گئی ہیں۔ اگرچہ ایران اور سعودی عرب دونوں خام تیل کے بڑے پیدا کنندہ ممالک ہیں، ان کے درمیان براہ راست جنگ کا امکان کم ہے۔ لیکن اگر، خدا نہ کرے، ایسا کوئی تصادم ہو جائے، تو اس کا نتیجہ تیل کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافے کی صورت میں نکلے گا، کیونکہ عالمی تیل تجارت کا بڑا حصہ خلیج فارس کے راستے ہوتا ہے۔

بی بی سی کی ایک رپورٹ کے مطابق، جو 2015 میں شائع ہوئی، صدر حسن روحانی نے پاسداران انقلاب اسلامی (IRGC) کو سالانہ سائبر سیکیورٹی بجٹ کے طور پر 19.8 ملین امریکی ڈالر دیے۔ IRGC کی افواج مشرق وسطیٰ بھر میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کر رہی ہیں، اور وہ عراق، یمن اور شام کی حکومتوں کے ساتھ ساتھ مختلف ملیشیاؤں کو بھی فوجی مشیر، رضا کار اور تربیت یافتہ ماہرین فراہم کر رہی ہیں۔ تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ تہران نے کامیابی سے طویل فاصلے تک مار کرنے والے ہیلٹک میزائل، جدید جنگی ٹینک اور بغیر پائلٹ کے فضا ئی جہاز (ڈرون) تیار اور آزمائے ہیں، اس کے علاوہ ایران میں تیار شدہ آبدوزیں اور جنگی کشتیاں بھی اس فہرست میں شامل ہیں۔ نومبر اور دسمبر 2017 میں یمن میں حوثی باغیوں نے ریاض پر طویل

فاصلے تک مار کرنے والے ہیلٹک میزائل داغے، جنہیں ایران میں تیار کیا گیا تھا۔

اسلامی ریاست (داعش) اور القاعدہ جیسے مختلف سنی جہادی گروہوں کے عروج نے مشرق وسطیٰ میں ایران کے کردار کو وسیع تر تناظر میں شیعہ مسلمانوں کے محافظ کے طور پر متعارف کرایا۔ 2015 میں روس کی شام میں براہ راست فوجی مداخلت نے ایران اور روس کو ایک اسٹریٹجک صفحے پر لا کھڑا کیا، جو امریکہ-سعودی اتحاد کے خلاف ایک طاقتور محاذ بن گیا۔ سعودیہ اور قطر کے درمیان جاری سفارتی کشیدگی میں قطر کا ساتھ دے کر ایران کو سیاسی اور معاشی دونوں سطحوں پر فائدہ ہوا۔ ایران نے قطر کو خوراک کی فراہمی میں اضافہ کیا اور دونوں ملکوں کے درمیان مشترکہ گیس فیلڈز میں تلاش اور پیداوار کے لیے معاہدے بھی طے پائے۔ ایران نے روس، ترکی اور قطر کے ساتھ مل کر سعودی عرب کے خلاف ایک مؤثر سیاسی، معاشی اور عسکری اتحاد تشکیل دیا۔

صدر بشار الاسد نے ایران کے بارے میں ایک مشتبہ دعویٰ کیا کہ ”ایران کو شام میں کسی قسم کے اثر و رسوخ کی خواہش نہیں ہے۔ ہم کسی بھی ملک کو اپنی خود مختاری پر اثر انداز ہونے کی اجازت نہیں دیں گے، نہ ہی ہم اسے قبول کریں گے، اور نہ ہی ایرانی اس کا ارادہ رکھتے ہیں۔“ لیکن زمینی حقائق اس سے بالکل مختلف ہیں۔ ایران شام میں مکمل طور پر مملوث ہے اور شام اب تہران کے مکمل اثر و رسوخ کے زیر نگین آچکا ہے۔ ایرانی مشیر اور حزب اللہ کے جنگجو شام میں داعش کے بعد کے نظام کو چلا رہے ہیں۔ بشار الاسد کے پاس اب اور کوئی چارہ نہیں رہا، سوائے اس کے کہ وہ مالی امداد اور نیم فوجی جنگجوؤں کے لیے ایران کے حلیف گروہوں پر انحصار کریں۔

شام ایران کے لیے تین اہم طریقوں سے خدمات انجام دیتا ہے۔ اولاً، یہ ایران کے مجوزہ ”شیعہ ہلال“ (Shia Crescent) کو برقرار رکھنے میں مدد دیتا ہے، کیونکہ اسد حکومت کی بقا اس ہلال کی تسلسل کے لیے ضروری ہے۔ ثانیاً، شام ایران کو لبنان تک براہ راست رسائی فراہم کرتا ہے، جو ایران کی علاقائی حکمت عملی میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ ثالثاً، شام کے راستے ایران اپنے ہتھیار حزب اللہ تک منتقل کرتا ہے۔ شام کی خانہ جنگی کے دوران ایران نے بنیادی کردار ادا کیا تا کہ شام دشمن اسلامک اسٹیٹ (داعش) کے ہاتھوں نہ چلا جائے۔ ایران نے

شام میں اپنی موجودگی کو صرف اپنے حلیف گروہوں (proxies) کے سپرد نہیں کیا بلکہ براہ راست شمولیت اختیار کی۔ حالیہ دنوں میں پاسداران انقلاب اسلامی کے ایئر واپسیں ونگ کے سربراہ جنرل امیر علی حاجی زادہ نے جرمن میگزین Der Spiegel کو انٹرویو دیتے ہوئے انکشاف کیا کہ ایران شام میں میزائل بنانے کے کارخانے تعمیر کرتا ہے اور ان کا انتظام خود سنبھالتا ہے۔ گولان کی پہاڑیوں میں ہونے والی کارروائیوں کے دوران حزب اللہ کے کئی سینئر کمانڈر مارے گئے۔ شام کی جنگ میں ایران کی شراکت داری کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں اعلیٰ سطح کے پاسداران انقلاب اور حزب اللہ کے کمانڈرز شامل رہے۔ اسرائیل اس بات سے سخت نالاں ہے کہ حزب اللہ کے کمانڈر گولان کی پہاڑیوں میں سرگرم ہو گئے ہیں۔ اسرائیلی قیادت کو خدشہ ہے کہ جنوبی لبنان اور گولان کے جنگی محاذ آپس میں جڑ کر اسرائیل کے لیے ایک سنگین خطرہ بن جائیں گے۔

ایران اور عرب دنیا کے درمیان جو فرق پایا جاتا ہے، وہ محض جغرافیائی یا ثقافتی نہیں بلکہ ایک حقیقی اور گہرا نظریاتی اختلاف بھی ہے۔ اسلام کے تناظر میں ایرانیوں کا شیعہ مکتب فکر اکثریتی سنی عربوں کے عقائد سے واضح طور پر مختلف ہے۔ پچاس اور ساٹھ کی دہائیوں میں عربوں کے درمیان غالب نظریہ عرب قوم پرستی کا تھا، جس کی قیادت مصر کے صدر جمال عبدالناصر اور شام کے حافظ الاسد نے کی۔ علامتی طور پر بھی عرب قوم پرست ”خلیج فارس“ کی اصطلاح کو مسترد کرتے ہوئے اسے ”خلیج عرب“ کہتے ہیں، حالانکہ یہ وہی آبی گزرگاہ ہے جو دنیا کے سب سے بڑے تیل کے ذخائر کو آپس میں جوڑتی ہے۔ تاہم، 1979 کے ایرانی انقلاب کے بعد، سعودی عرب نے اپنی بے پناہ دولت کے بل بوتے پر عرب قوم پرستی کو کمزور کر کے اس کی جگہ ایک خاص قسم کے سلفی جہادی اسلام کو فروغ دیا۔ یہ نظریہ نہایت قدامت پسند، سخت گیر اور عدم رواداری پر مبنی ہے، جو کسی بھی صورت میں شیعہ عقائد کو برداشت نہیں کرتا۔ یہ اسلام کی ایک ایسی تعبیر ہے جو نہ صرف شیعیت سے متصادم ہے بلکہ دیگر مسالک اور تہذیبوں کے لیے بھی ناقابل قبول شدت پسندی کی نمائندگی کرتی ہے۔

ایرانی قیادت ہمیشہ امت مسلمہ کے اتحاد، یعنی وحدتِ اسلامی (Pan-Islamic Unity) کی بات کرتی ہے۔ تاہم، ایران کے اس نظریے کے پس پشت اصل محرکات سیاسی ہوتے ہیں۔ ایرانی حکومت کا یہ وحدتِ اسلامی کا بیانیہ دراصل ایران کے جغرافیائی اور سیاسی اثر و رسوخ کو بڑھانے کی ایک منظم کوشش ہے۔ یہ نظریہ محض مذہبی ہم آہنگی یا اخوت کے جذبے سے نہیں، بلکہ اس خواہش سے جڑا ہوا ہے کہ ایران اسلامی دنیا کی قیادت سنبھالے۔ اس مقصد کے لیے ایران نہ صرف شیعہ ممالک و گروہوں کو ساتھ جوڑنے کی کوشش کرتا ہے، بلکہ سنی مسلم ممالک میں بھی اپنے اثر و رسوخ کو بڑھانا چاہتا ہے، تاکہ اسے پوری امت مسلمہ کا قائد تسلیم کیا جائے۔ اس بیانیے میں ”وحدت“ ایک عملی اتحاد سے زیادہ ایک اسٹریٹجک ہتھیار بن جاتی ہے، جس کا مقصد ایران کی علاقائی اور نظریاتی بالادستی کو ممکن بنانا ہوتا ہے۔

یہ ایک ایسا ہدف ہے جس میں ایران کی فارسی اور شیعہ شناخت رکاوٹ بنتی ہے۔ اسلامی جمہوریہ ایران کے وہابی ازم اور سلفی جہادیت سے نفرت کی وجہ بھی غیر متوقع نہیں۔ وہابیت اور سلفی نظریات شیعہ مکتبہ فکر کو دین اسلام سے منحرف اور گمراہ قرار دیتے ہیں، اور ان کے ماننے والوں کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔ سعودی عرب کے اعلیٰ ترین مذہبی پیشوا، مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز آل الشیخ نے ستمبر 2016 میں ایک سعودی صحافی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا:

”آپ کو سمجھنا چاہیے کہ ایرانی مسلمان نہیں ہیں۔ وہ دراصل زرتشتیوں کی اولاد

ہیں۔ ان کی مسلمانوں سے، خصوصاً اہل سنت سے دشمنی صدیوں پرانی ہے۔“

یہ بیان نہ صرف ایرانیوں کے خلاف تعصب کا اظہار ہے بلکہ اس سے اس گہری حسد کی بھی عکاسی ہوتی ہے جو فرقہ وارانہ نفرت کی بنیاد پر مسلم دنیا میں قائم ہو چکی ہے۔

باب چہارم

سعودی عرب اور ایران دو حریف ریاستوں کی داستان

عرب و عجم کا شناختی تصادم ایک ہزار سال سے زائد پرانا ہے، کیونکہ دونوں اقوام نسلی طور پر مختلف ہیں۔ سعودی عرب اور ایران کے مابین کشمکش مشرق وسطیٰ کی جغرافیائی سیاست کا ایک مستقل اور نمایاں پہلو رہی ہے، جو خاص طور پر 1979ء کے ایرانی اسلامی انقلاب کے بعد شدت اختیار کر گئی۔ اس کے بعد رونما ہونے والے کئی واقعات 1980ء میں ایران-عراق جنگ، 1990ء میں عراق کا کویت پر حملہ، 2003ء میں عراق پر امریکی قیادت میں چڑھائی اور 2011ء کی عرب بہار نے اس کشیدگی کو وقتاً فوقتاً بھڑکایا، جو کبھی مکمل طور پر ٹھنڈی نہ ہو سکی۔ اس رقابت کی جڑیں ہمیشہ فرقہ وارانہ اور علاقائی پہلوؤں میں پیوست رہی ہیں۔ دونوں ممالک کو خطے میں ایک منفرد مقام حاصل ہے: ایران کے پاس ایک بڑی، نوجوان اور تعلیم یافتہ آبادی، وافر تیل کے ذخائر اور ایک طویل تاریخی پس منظر ہے، جب کہ سعودی عرب نہ صرف تیل کے وسیع ذخائر کا مالک ہے بلکہ اسلام کے دو مقدس ترین شہروں، مکہ اور مدینہ، کا نگہبان بھی ہے۔ عرب و عجم کا شناختی تصادم ایک ہزار سال سے زائد پرانا ہے، کیونکہ دونوں اقوام نسلی طور پر مختلف ہیں۔ سعودی عرب اور ایران کے مابین کشمکش مشرق وسطیٰ کی جغرافیائی سیاست کا ایک مستقل اور نمایاں پہلو رہی ہے، جو خاص طور پر 1979ء کے ایرانی اسلامی انقلاب کے بعد شدت اختیار کر گئی۔ اس کے بعد رونما ہونے والے کئی واقعات 1980ء میں

ایران-عراق جنگ، 1990ء میں عراق کا کویت پر حملہ، 2003ء میں عراق پر امریکی قیادت میں چڑھائی اور 2011ء کی عرب بہار نے اس کشیدگی کو وقتاً فوقتاً بھڑکایا، جو کبھی مکمل طور پر ٹھنڈی نہ ہو سکی۔ اس رقابت کی جڑیں ہمیشہ فرقہ وارانہ اور علاقائی پہلوؤں میں پیوست رہی ہیں۔ دونوں ممالک کو خطے میں ایک منفرد مقام حاصل ہے: ایران کے پاس ایک بڑی، نوجوان اور تعلیم یافتہ آبادی، وافر تیل کے ذخائر اور ایک طویل تاریخی پس منظر ہے، جب کہ سعودی عرب نہ صرف تیل کے وسیع ذخائر کا مالک ہے بلکہ اسلام کے دو مقدس ترین شہروں، مکہ اور مدینہ، کا نگہبان بھی ہے۔

1925 میں ایران کے شاہ نے عراق کی سرحد پر واقع عرب اکثریتی علاقے خوزستان کو فارس میں ضم کر لیا، جس پر سعودی فرمانروا عبدالعزیز نے شدید تشویش کا اظہار کیا۔ اس کے رد عمل میں، سعودی عرب نے 1927 میں برطانیہ کے ساتھ ایک دو طرفہ معاہدہ کیا تاکہ خلیج میں حفاظتی ریاستیں قائم کی جائیں۔ اس مقصد کے لیے سعودی عرب نے بحرین، کویت اور عمان کو تسلیم کیا۔ بعد ازاں سعودی عرب نے بحرین پر ایرانی دعوے کو ناکام بنانے کے لیے برطانیہ سے ایک اور معاہدہ بھی کیا۔ ایران نے اس فیصلے کے خلاف اقوام لیگ سے شکایت کی اور بحرین کو واپس ایران میں شامل کرنے کا مطالبہ کیا۔ اگرچہ ایران اور سعودی عرب کے درمیان سفارتی تعلقات قائم رہے، لیکن جب ایران نے بغداد پیکٹ پر دستخط کیے تو تعلقات میں تناؤ آگیا۔ تاہم، 1971 میں برطانیہ کے مشرق وسطیٰ سے انخلا کے بعد، دونوں ممالک کے تعلقات اسلامی انقلاب 1979 تک عمومی طور پر بہتر رہے۔

امریکہ اور یون پلر پالیسی

صدر رچرڈ نکسن نے مشرق وسطیٰ میں ایران اور سعودی عرب، جو اُس وقت کے دو بڑے اور با اثر ممالک تھے، کو خطے میں کمیونزم اور عراق کی بعثی حکومت کے اثرات سے بچانے کے لیے ایک طرح سے 'خلیج کے محافظ' بننے کی ترغیب دی۔ 1971 میں امریکہ کی مشہور 'جڑواں ستونوں کی پالیسی' کے تحت ایران اور سعودی عرب کو امریکی مفادات کے نگہبان کے طور پر ساتھ مل کر کام کرنا تھا۔ دونوں ممالک نے اس شراکت داری کے دوران شناختی سیاست سے گریز کیا، حالانکہ ان

کے درمیان مذہب اور قومیت کے حوالے سے گہرے اختلافات موجود تھے۔ ایران نے رضا شاہ پہلوی کی قیادت میں اس کردار کو بھرپور جوش و خروش سے اپنایا، جبکہ سعودی عرب نے بھی عرب دنیا میں امریکہ کا اہم اتحادی ہونے کا کردار نبھایا۔ اس پالیسی کے تحت دونوں ممالک نے شمالی یمن، زائر، صومالیہ اور عمان میں کمیونسٹ حکومتوں کو شکست دینے کے لیے مشترکہ کاروائیاں کیں۔ تاہم 1975 میں سعودی فرمانروا شاہ فیصل کے قتل کے بعد سعودی عرب نے تیل، جو اس کی معیشت کا بنیادی ذریعہ تھا، کے حوالے سے ایک نیا موقف اختیار کرنا شروع کیا۔

شاہ ایران نے عوامی سطح پر اعلان کیا کہ تیل کو کئی برسوں سے کم قیمت پر فروخت کیا جا رہا ہے، اور یہ کہ اوپیک (تیل پیدا کرنے والے ممالک کی تنظیم) کو فوری طور پر قیمتوں میں اضافہ کرنا چاہیے۔ تاہم، سعودی عرب، جو اوپیک کا عملی طور پر قائد تھا، نے شاہ ایران کی اس تجویز کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور یوں صنعتی ترقی یافتہ مغربی ممالک کی نظروں میں اپنی مقبولیت بڑھالی۔ ایران کی معیشت بڑی حد تک تیل کی آمدنی پر منحصر تھی، تاکہ ایک بڑی تعلیم یافتہ آبادی کی ضروریات پوری کی جاسکیں اور دفاعی اخراجات کو سہارا دیا جاسکے۔ مگر شاہ کی اقتصادی پالیسیوں کے خلاف اندرون ملک ایک مضبوط لہر اٹھی، جو بالآخر پہلوی خاندان کی حکومت کے خاتمے پر منتج ہوئی۔

یہ انقلاب فرانس سے آیت اللہ خمینی کی قیادت اور تحریک سے برپا ہوا۔ جب وہ تہران پہنچے تو عوام نے ان کا پر تپاک استقبال کیا۔ خمینی نے اس انقلاب کے لیے وسیع اسلامی حمایت کا دعویٰ کیا اور جلد ہی سعودی عرب کی وہابی بادشاہت کی زوال پذیر طرز حکمرانی کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ ان کا یہ دعویٰ کہ ایران میں ایک شیعہ اسلامی حکومت اسلام کی نمائندہ آواز ہوگی، سعودی عرب کے اُس مذہبی جواز سے متصادم تھا جو وہ بطور خادمِ حرمین شریفین، یعنی مکہ اور مدینہ کے نگہبان، تسلیم کروا تھا۔ ایران نے اس وقت سعودی عرب کو مزید ناراض کیا جب اُس نے سعودی عرب کے مشرقی، تیل سے مالا مال علاقوں میں آباد شیعہ برادری کے ساتھ ہمدردی اور یکجہتی کا اظہار کیا۔ اسی دوران، سعودی فرمانروا شاہ خالد کی ایما پر، عراقی آمر صدام حسین نے ایران پر حملہ کر دیا۔ سعودی عرب نے صدام حسین کی اس مہم میں اربوں امریکی ڈالر کی مالی امداد فراہم کی۔ ایران

نے جوابی کارروائی میں سعودی ٹینکروں کو نشانہ بنایا، جس کے ردِ عمل میں سعودی عرب نے دو ایرانی جنگی طیارے مار گرائے۔ اس جنگ کے اختتام تک تقریباً 750000 ایرانی اور 500000 عراقی ہلاک ہو چکے تھے۔ ایران-عراق جنگ کے بعد، 1990 میں صدام حسین نے کویت پر حملہ کیا، اور اس واقعے نے ایران اور سعودی عرب کو مجبور کیا کہ وہ دوست تو نہ بنیں، لیکن خطے میں تعاون کے لیے ایک ساتھ کام کریں۔

تاہم 2003 میں امریکہ-برطانیہ کی عراق پر چڑھائی کے بعد پورے خطے کی جغرافیائی و سیاسی صورتِ حال یکسر بدل گئی۔ صدام حسین کی موجودگی میں، سعودی عرب ایران کی علاقائی عزائم کا مؤثر توڑ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اس حملے کے بعد عراق میں جوئی شیعہ اکثریتی حکومت قائم ہوئی، اسے ایران کی بھرپور حمایت حاصل تھی، اور یہی بات سعودی عرب کے لیے باعثِ تشویش بن گئی۔ سعودی عرب نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اُس کے پڑوس میں ایک طاقتور شیعہ عرب ریاست اُبھر کر سامنے آئے گی۔ اسے بجا طور پر اندیشہ ہوا کہ ایران اب پہلی بار براہِ راست خطے میں اس کی برتری کو چیلنج کر رہا ہے اور مختلف ممالک میں اپنے اثر و رسوخ میں اضافہ کرے گا۔

سعودی عرب شام میں صدر بشار الاسد کی حکومت کو گرانے میں سرگرم تھا، جس کا بنیادی مقصد شام اور ایران کے درمیان قائم اتحاد کو توڑنا تھا۔ 2003 میں امریکہ کی عراق پر چڑھائی، 2006 کی لبنان جنگ، اور ایران-عراق-شام گیس پائپ لائن منصوبہ، ان تمام عوامل نے ایران اور شام کے تعلقات کو مزید مضبوط کیا، جس سے شام اور سعودی عرب کے درمیان تعلقات مسیں کشیدگی بڑھتی گئی۔ شام میں علوی شیعہ حکومت کو ایران اور مقامی علوی آبادی کی حمایت حاصل رہی، جبکہ سعودی عرب کو اپنے مشرقی صوبوں میں موجود شیعہ آبادی کی ممکنہ بغاوت کا بھی خوف لاحق رہا، خاص طور پر عرب بہار کے بعد۔ چونکہ شام کی تقریباً 74 فیصد آبادی سنی مسلمانوں پر مشتمل ہے، سعودی عرب کو یہ امید تھی کہ اگر بشار الاسد کا اقتدار ختم ہو جائے تو وہاں اس کا اثر و رسوخ قائم ہو سکتا ہے۔ اسی امید پر سعودی عرب نے بڑی تعداد میں نوجوان جہادیوں کو شام بھیجا تاکہ وہ علوی حکومت کے خلاف جنگ میں حصہ لیں۔

روایتی طور پر شام کے سنی مسلمان صوفی سلسلوں سے وابستہ رہے ہیں اور سعودی عرب کی سخت گیر دہائی-سلفی سوچ کو رد کرتے آئے ہیں۔ تاہم، جب فری سیرین آرمی (FSA) اور جبهة النصرة جیسے جہادی گروہ، جو القاعدہ سے منسلک تھے، منظر عام پر آئے، تو سعودی عرب نے ان کی مالی اور عملی حمایت کی۔ بعد ازاں جب داعش نے مدائن خلت کی، تو شامی خانہ جنگی محض ایک جمہوری جدوجہد نہ رہ کر مکمل طور پر فرقہ وارانہ جنگ میں بدل گئی۔

سعودی-ایرانی مسابقت

سعودی-ایرانی مسابقت کی تاریخ گہری ہے اور اس کی جڑیں ساتویں صدی تک پھیلی ہوئی ہیں۔ سعودی عرب کا قیام 1927 میں مملکت نجد و حجاز کے طور پر عمل میں آیا، اور 1929 میں ایران اور سعودی عرب کے درمیان دوستی کا معاہدہ ہوا۔ ایران بنیادی طور پر ایک شیعہ اکثریتی ملک ہے، جبکہ سعودی عرب پروہابی-سلفی مسلک کا غلبہ ہے جو شیعہ مسلمانوں سے شدید نفرت رکھتا ہے۔ محمد رضا پہلوی، جو 1941 سے 1979 تک ایران پر حکمران رہے، ایک سیکولر بادشاہ تھے۔ اُن کے دور حکومت میں ایران نے اسرائیل اور سعودی عرب کے ساتھ بہترین تعلقات قائم رکھے۔ مشرق وسطیٰ کی سیاست کے ماہر گریگوری آفٹائڈیلیان نے ”دی عرب ویکی“ میں لکھا ہے کہ سرد جنگ کے دوران ایران اور سعودی عرب عالمی سطح پر ایک ہی کیمپ میں تھے۔ تاہم، سعودی عرب کو یہ خدشہ لاحق تھا کہ شاہ ایران، امریکہ کی مدد سے پرانے فارسی سلطنت کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

تمام تر فوجی تربیت اور اسلحہ فروشی کے باوجود، جو امریکہ نے 1970 کی دہائی میں سعودی عرب کو فراہم کی، ہر باشعور مبصر کے لیے یہ واضح تھا کہ امریکہ نے ایران کو ایک برابر اور قابل اعتماد شراکت دار سمجھا تھا۔ 1971 میں ایران کی جانب سے متحدہ عرب امارات کے ساحل کے قریب تین جزیروں پر قبضہ ایک غیر متوقع اقدام تھا، جس نے عرب ممالک کو ناراض کر دیا۔ ایران، سعودی عرب کے مقابلے میں، خلیج فارس میں پولیس مین کا کردار زیادہ شدت سے ادا کر رہا تھا۔ 1970 کی دہائی کے وسط میں ایرانی افواج نے برطانوی اسپیشل فورسز کے ساتھ مل کر عمان کے جنوب مغربی علاقے میں ایک مارکسی بغاوت کو کچلنے کے لیے کارروائی کی۔ امریکہ نے بھی عراق

اور شام میں سوشلسٹ بعث پارٹی کے ابھار کے مقابلے کے لیے اسٹریٹجک اتحاد قائم کیے۔ تاہم 1979ء کے شیعہ اسلامی انقلاب نے فرقہ وارانہ توازن کو یکسر بدل کر رکھ دیا، اور اس کے بعد سعودی عرب نے ایران کو ایک علاقائی خطرے کے طور پر دیکھنا شروع کیا۔ انقلاب کے بعد ایران اور امریکہ کے درمیان تعلقات بھی بگڑ گئے۔ آیت اللہ خمینی کے اقتدار میں آنے کے بعد فرقہ وارانہ رقابت میں شدت آئی کیونکہ ایران نے اسرائیل کے ساتھ دوستی کو منسوخ کیا، صدام حسین کی بعثی حکومت کے خلاف اعلان جنگ کیا، اور سعودی بادشاہت کو ایک غیرت انونی مملکت قرار دیا۔

ایران اور سعودی عرب کے درمیان تعلقات 2003 میں عراق پر امریکی حملے کے بعد مشرق وسطیٰ میں آنے والی بڑی سیاسی تبدیلیوں کے مرکز میں رہے ہیں۔ خطے میں بالادستی کی جنگ مختلف انداز اور شکلوں میں سامنے آتی رہی ہے۔ یہ ٹکراؤ نظریاتی، فرقہ وارانہ اور عسکری سطح پر جاری رہا۔ شام میں علوی شیعہ صدر بشار الاسد، جنہیں ایران کی حمایت حاصل تھی، رفتہ رفتہ سعودی حمایت یافتہ سنی باغیوں پر غالب آ گئے، جبکہ یمن میں ایران کی حمایت یافتہ شیعہ حوثی جنگجوؤں کے خلاف سعودی قیادت میں قائم اتحاد حملے کرتا رہا۔

دونوں ممالک مشرق وسطیٰ بھر میں بالواسطہ جنگوں میں مصروف ہیں اور ان کے تعلقات قدیم مذہبی اختلافات کی بنیاد پر متعین ہوتے ہیں۔ دونوں اسلامی قیادت کے خواہاں ہیں اور اسلام کی مختلف تعبیرات کو اپناتے ہیں۔ لیکن یہاں ایک اور پیچیدگی شامل ہو جاتی ہے: سیاسی کھیل اب صرف 'سعودی بمقابلہ ایران' تک محدود نہیں رہا، بلکہ 'امریکہ بمقابلہ ایران' کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ صدر ٹرمپ اور ان کے اہل خانہ کی جانب سے ریاض کو تہران کے مقابلے میں غیر مشروط حمایت حاصل رہی، جو سعودی ولی عہد محمد بن سلمان کے لیے کھلی چھوٹ بن گئی جس نے بادشاہت میں اپنی طاقت مضبوط بنانے کے لیے اعلیٰ شہزادوں، فوجی افسران اور مذہبی رہنماؤں کے خلاف سخت اقدامات کیے۔ مگر یہاں گتھیاں مزید الجھتی ہیں: ایک طرف امریکہ سعودی عرب کا حامی ہے، تو دوسری طرف وہ لبنان کو بھی عسکری امداد دے رہا ہے۔

امریکہ، اسرائیل اور ریاض نے ایران کو مشرق وسطیٰ میں عدم استحکام پیدا کرنے والا عنصر قرار دے کر اسے خطے میں تنہا کرنے کی پالیسی ترتیب دی۔ ولی عہد محمد بن سلمان کی بے رحم خواہش اقتدار اندرون ملک واضح طور پر نظر آتی ہے، جہاں وہ بڑے تاجروں اور شاہی خاندان کے سینئر ارکان کے خلاف کریک ڈاؤن کر رہے ہیں۔ مشرق وسطیٰ بھر میں یہ بات معروف ہے کہ ان کی یہ شدید سرگرمی ایران کے اثر و رسوخ کو روکنے کی فوری خواہش سے جنم لیتی ہے۔ چاہے وہ پسند کریں یا نہیں، ایران عراق سے لے کر لبنان تک خطے کی غالب طاقت بننے کے لیے پوری طرح تیار ہے۔ تہران کے پالیسی ساز بخوبی جانتے ہیں کہ وہ بغداد، دمشق اور بیروت پر مکمل کنٹرول نہ بھی رکھتے ہوں، تو بھی اپنے حلیفوں اور نمائندہ گروہوں کے ذریعے وہ ان کے میدانِ جنگ اور سیاسی سمت کا فیصلہ کن تعین کر سکتے ہیں۔ کبھی محتاط اور غیر فعال علاقائی طاقت کے طور پر پہچانے جانے والا سعودی عرب حالیہ برسوں میں اپنی خارجہ و سلامتی پالیسیوں میں ایک نیا مفہوم اور نیا مقصد لے کر آیا ہے۔ تاہم، ایران کو پیچھے دھکیلنے اور اس مقصد کے لیے عالمی حمایت حاصل کرنے کے بجائے، سعودی عرب کا انداز اکثر غیر مربوط، غیر مستحکم اور الٹا نقصان دہ ثابت ہوا ہے۔

یمن میں سعودی قیادت میں چلائی گئی مہم

سعودی قیادت میں یمن میں چلائی گئی مہم، جسے Operation Decisive Storm کا نام دیا گیا، مارچ 2015 میں اس مقصد کے تحت شروع کی گئی کہ حوثی باغیوں کو یمن کے دارالحکومت صنعاء سے نکالا جائے اور وہاں بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ حکومت کو بحال کیا جائے۔ سعودی عرب نے اس مہم میں 150000 فوجی، 100 لڑاکا طیارے اور بحریہ کی یونٹس تعینات کیں۔ تاہم، بیس مہینے کی مسلسل فضائی بمباری اور صرف سعودی عرب کی جانب سے لگ بھگ 5 ارب امریکی ڈالر خرچ کرنے کے باوجود، یہ جنگ اب تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچی ہے۔ حوثیوں نے شمال مغربی یمن پر کنٹرول برقرار رکھا ہوا ہے، اور معزول صدر صالح کے ساتھ ان کے اتحاد نے اس علاقے پر ان کا تسلط مزید مضبوط کیا ہے۔ حوثیوں کو ملک کے مختلف قبائل اور فرقوں کی وسیع حمایت حاصل رہی ہے۔ ان کی بطور ایک مسلح بغاوتی تحریک کامیابی کی کئی

وجوہات تھیں، لیکن سب سے اہم وجہ ان کا اُن پُر پیچ اور دشوار گزار پہاڑوں اور وادیوں سے گہرا واقف ہونا تھا، جن میں وہ اپنی کارروائیاں انجام دیتے ہیں۔

حوثیوں اور ان کے ساتھ شامل قبائلی افراد، جو ان کی کم تربیت یافتہ فوج کا بڑا حصہ ہیں، یمن کے پہاڑوں سے گہری واقفیت رکھتے ہیں، اور یہی پہاڑ ان کے لیے ایک مؤثر قوتِ کار ثابت ہوتے ہیں۔ پہاڑی خطے ہمیشہ دفاعی جنگ کو فائدہ دیتے ہیں۔ ماضی میں جن طاقتوں نے یمن پر حملہ کیا، جیسا کہ عثمانیوں نے دمرتہ اور بعد میں مصریوں نے انہیں جلد ہی یہ احساس ہو گیا کہ شمال مغربی یمن، بالکل افغانستان کی طرح، جارح قوتوں کے لیے ایک قبرستان ہے۔ دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ حوثی قیادت نے قبائلی گروہوں کے ساتھ، جو زیادہ تر زیدی شیعہ ہیں، ذاتی اور تنظیمی تعلقات قائم کر لیے ہیں۔

زیدی شیعہ تنظیم ہونے کے ناطے، حوثیوں کے اقتدار میں آنے نے سعودی عرب میں خطرے کی گھنٹیاں بجادیں، جو انہیں ایران کا آلہ کار سمجھتا ہے۔ حوثیوں سے زمینی جنگ لڑنے کے لیے سعودی عرب نے ان ملیشیاؤں اور داعش کے ان جنگجوؤں کو میدان میں اتارا جو شام سے فرار ہوئے تھے۔ یہ فورسز، جن میں جنوبی علیحدگی پسند، حکومت کے وفادار فوجی، اور شدت پسند سلفی قبائل شامل تھے، سعودی قیادت والے اتحاد کے پراسکسی کے طور پر استعمال ہوئیں۔

حوثی، کافی کی پیداوار کے لیے مشہور، سعدہ صوبے سے تعلق رکھتے ہیں جو یمن کے شمالی علاقے میں واقع ہے، اپنے مرحوم رہنما حسین بدرالدین حوثی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ اب ان کی قیادت ان کے بھائی عبدالملک حوثی کے ہاتھ میں ہے، جو ایک پُرکشش شخصیت کے حامل ہیں اور اکثر حزب اللہ کے حسن نصر اللہ سے ان کا موازنہ کیا جاتا ہے۔ حوثی 2004 سے یمنی مرکزی حکومت کے خلاف برسرِ پیکار ہیں، جب یہ تحریک زیدی فرقے کے حقوق کو مضبوط بنانے کے لیے قائم کی گئی تھی، جو یمنی آبادی کا تقریباً 30 سے 40 فیصد حصہ ہے۔ حوثی تحریک بنیادی طور پر سابق صدر صالح کے دورِ حکومت میں شمالی قبائل کے ساتھ امتیازی سلوک کے خلاف ابھری۔ یمن میں ماضی میں فرقہ وارانہ مسائل نہیں تھے اور شیعہ و سنی مسالک کے درمیان کوئی دشمنی نہیں

پائی جاتی تھی۔ مگر عرب بہار کے بعد جب حوثیوں کی بغاوت نے زور پکڑا، تو سعودی عرب نے مظاہرین پر فضائی حملے شروع کر دیے، جس کے بعد ایران اس منظر نامے میں داخل ہوا، اور بالآخر اس تنازعے کی صورت گری حوثی جنگجوؤں کے حق میں ہونے لگی۔

ریاض کو خدشہ تھا کہ حزب اللہ اور ایران کی رہنمائی میں حوثی ایک مہلک جنگی قوت میں تبدیل ہو جائیں گے، جو اس کی جنوبی سرحد کے لیے خطرہ بنے گی۔ تین سالہ سعودی فضائی بمباری اور دس ہزار سے زائد ہلاکتوں کے بعد بھی حوثی افواج اتنی طاقتور ہو چکی ہیں کہ یمن سے ریاض ایئرپورٹ تک بیلٹک میزائل داغ سکتی ہیں۔ سعودی عرب کا کہنا ہے کہ حوثیوں کو بیلٹک میزائل داغنے کی مہارت اور ٹیکنالوجی حزب اللہ فراہم کر رہی ہے۔ وقت کے ساتھ، ایران نے اپنے تیار کردہ ’ابابیل سیریز‘ کے یو اے ویز (ڈرونز) بھی حوثیوں کو منتقل کیے، جن پر دھماکہ خیز وار ہیڈز نصب ہوتے ہیں اور جو ریڈارز اور پیٹریاٹ میزائل بیڑیوں جیسے قیمتی اہداف کو نشانہ بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اطلاعات کے مطابق، ایران نے یمن میں بحری جہازوں کو نشانہ بنانے والے ہتھیار اور کنڈھے پر داغے جانے والے میزائل بھی فراہم کیے ہیں۔ معتبر ذرائع نے تصدیق کی ہے کہ تہران نے افغان اور شیعہ عرب ماہرین پر مشتمل افرادی قوت بھی مسراہم کی ہے، جو حوثیوں کو تربیت دیتے ہیں، ان کی قیادت کرتے ہیں، اور ان کے لیے لاجسٹک مشیر کے طور پر خدمات انجام دیتے ہیں۔

یمن کی سعودی عرب کے ساتھ طویل سرحد ہے، جبکہ ایران کے ساتھ کوئی زمینی سرحد نہیں۔ ولی عہد محمد بن سلمان کی قیادت میں یمن میں ایرانی حمایت یافتہ حوثیوں کے خلاف یمنی حکومتی افواج کی حمایت میں سعودی عرب کی مداخلت مہنگی بھی ثابت ہوئی اور غیر نتیجہ خیز بھی۔ برسوں کی بمباری کے باوجود، جس میں 3000 سے زیادہ عام شہری جاں بحق ہوئے، سعودی عرب وہ نتیجہ حاصل نہ کر سکا جس کی اسے امید تھی۔ بلکہ، وہی صورتحال پیدا ہو رہی ہے جس سے ریاض ہر قیمت پر بچنا چاہتا تھا یعنی حوثیوں کا حزب اللہ جیسے ایک منظم اور طاقتور گروہ میں بدل جانا، اور وہ بھی ایک ایسی سرحد پر جو سعودی عرب کے بالکل ساتھ واقع ہے۔ بہت سے مبصرین کا خیال ہے کہ حزب اللہ اور ایران نواز ملیشیاؤں

کی مدد سے خوشیوں کے پورے یمن پر قبضہ اور وہاں کی حکومت سنبھالنے کے امکانات قوی ہیں۔
 حوثی باغیوں نے سعودی حکومت کو خبردار کرنے کے لیے ریاض ایئر پورٹ پر ایک ایران
 ساختہ بیلٹک میزائل داغا۔ خوش قسمتی سے یہ میزائل راستے ہی میں تباہ کر دیا گیا اور کوئی نقصان
 نہیں ہوا۔ ولی عہد کو کئی بار مشورہ دیا گیا کہ وہ جوابی حملوں سے گریز کریں اور اس غریب عرب
 ہمسایہ ملک کے ساتھ تنازع کو نہ بڑھائیں۔ حال ہی میں، متحدہ عرب امارات نے یمن میں
 سعودی قیادت والے اتحاد سے علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ امریکہ جنگ بندی کے نفاذ اور فریقین کو
 مذاکرات کی میز پر واپس لانے کی کوششیں کر رہا ہے۔

قطر پر سعودی قیادت میں مسلح کردہ ناکہ بندی بھی مکمل طور پر ناکام پالیسی ثابت ہوئی۔ ولی
 عہد محمد بن سلمان کی جانب سے قطر کی جارحانہ علاقائی خارجہ پالیسی کو کنٹرول کرنے کی کوشش
 بے اثر رہی، اور یہ مسئلہ عالمی سفارت کاری کے پس منظر میں چلا گیا۔ اقتصادی پابندیوں اور قطر
 ایئرویز کے لیے فضائی حدود کی بندش کے نتیجے میں، قطر نے ترکی اور ایران جیسے نئے اتحادی
 حاصل کیے۔ ان ممالک نے طویل مدتی اقتصادی، سیاسی اور عسکری تعاون کے معاہدے کیے۔
 ترکی نے قطر میں ایک فوجی اڈہ قائم کیا، اور ایران نے ولی عہد کی کسی بھی ”مہم جوتی“ کی صورت
 میں قطر کو عسکری مدد فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔

لبنان میں سعودی عرب کی بھونڈی چال

جو کچھ ولی عہد محمد بن سلمان (MBS) نے لبنان کے وزیر اعظم کے ساتھ کرنے کی کوشش کی،
 وہ نہایت عجیب اور ناقابل فہم واقعہ تھا۔ وزیر اعظم سعد الحریری کو ریاض کے باہر واقع ولی عہد
 کے ریزائٹ میں ہفتے کے آخر میں مدعو کیا گیا، لیکن وہاں پہنچنے کے بعد ایک خود مختار ملک کے
 وزیر اعظم کو ”تحفظاتی حراست“ میں لے لیا گیا، اور بین الاقوامی سفارتی آداب کو مکمل طور پر
 نظر انداز کرتے ہوئے اُن سے زبردستی وزارتِ عظمیٰ سے استعفیٰ دلوا لیا گیا۔ ساتھ ہی ان سے یہ
 بھی کہلوا یا گیا کہ حزب اللہ اور ایران انہیں قتل کرنے کی سازش کر رہے ہیں۔ یہ واقعہ، جس میں
 حریری جیسے رہنما کو نشانہ بنایا گیا جو کبھی سعودی عرب کے قریبی اتحادی تصور کیے جاتے تھے،

لبنان اور عالمی برادری کے لیے حیرت انگیز اور باعثِ تشویش ثابت ہوا۔ حریری ایک سنی مسلمان ہیں، اور سعودی عرب کی لبنان میں تاریخی سنی حمایت کے تناظر میں یہ ایک اہم نکتہ ہے۔

1975 سے 1990 تک لبنان ایک ہولناک خانہ جنگی کا شکار رہا، جو مختلف مذہبی فرقوں کے درمیان جاری رہی۔ بالآخر ایک طاقت کی تقسیم کا فارمولا، طویل بات چیت اور مذاکرات کے بعد، 1989 کے طائف معاہدے کی شکل میں طے پایا۔ اس معاہدے کے تحت لبنان کا وزیر اعظم ایک سنی (عام طور پر سعودی حمایت یافتہ)، صدر ایک مارونی عیسائی، اور اسپیکر پارلیمنٹ ایک شیعہ ہوگا۔ اس نازک توازن اور بقا کے ماحول میں شاید حریری کی سب سے بڑی سیاسی کامیابی یہ رہی کہ وہ حزب اللہ (جو ایک طاقتور شیعہ سیاسی جماعت ہے) کے ساتھ ہوشیاری سے اقتدار بانٹنے پر آمادہ رہے، جس کی وجہ سے وہ عرصہ دراز تک اقتدار میں رہنے میں کامیاب رہے۔

حزب اللہ لبنان کی ایک اہم سیاسی جماعت ہے جو ملک کی شیعہ اقلیت کی نمائندگی کرتی ہے۔ لبنان کا کوئی بھی سنی وزیر اعظم، اگر حکومت چلانا چاہے، تو اسے شیعہ اور عیسائی دھڑوں سے مفاہمت کرنی ہی پڑتی ہے۔ نومبر 2017 میں سعد الحریری کو استعفیٰ دینے پر مجبور کرنے کے بعد ریاض نے دعویٰ کیا کہ لبنان نے سعودی عرب کے خلاف جنگ چھیڑ دی ہے، اور اس کی ذمہ داری یمن سے ریاض پر داغے گئے میزائل حملے کی صورت میں حزب اللہ پر عائد کی۔ سعودی عرب نے فوراً اپنے شہریوں کو لبنان چھوڑنے کا حکم دیا اور ممکنہ فوجی تصادم کے خطرے کو ہوا دی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ سعودی عرب اور اسرائیل، اپنے اپنے اسباب کی بنیاد پر، حزب اللہ سے شدید نفرت رکھتے ہیں، اور دونوں نے اپنے اس مشترکہ دشمن کو سبق سکھانے کے لیے ہاتھ ملا لیا ہے۔ مگر یہ چال شاید اٹلی پڑے، اور ایران حزب اللہ کے ہاتھ مضبوط کرے، جو دنیا کے سامنے خود کو قانون کا پابند اور اصولوں کا پاسدار ظاہر کرتے ہیں۔

افریقہ کی دیومالائی کہانی ولی عہد محمد بن سلمان (ایم بی ایس) کے حالات پر خوب صادق آتی ہے۔ کہانی کچھ یوں ہے: ایک بوڑھا بادشاہ اپنے نوجوان شہزادے کو جنگل کی ہنر آزمائی کے لیے بھیجتا ہے۔ پہلے سفر میں شہزادے کو صرف شیروں کی دھاڑ اور ہاتھیوں کی چنگھاڑ سنانی دیتی ہے،

چھجر بھننا رہے ہوتے ہیں، پرندے چچھارہے ہوتے ہیں۔ وہ بار بار واپس آتا ہے، اور پھر آہستہ آہستہ وہ غیر نمایاں آوازیں سننے لگتا ہے، جیسے سانپ کی سرسراہٹ یا تتلی کے پروں کی ہلکی سی پھڑ پھڑاہٹ۔ بادشاہ اسے نصیحت کرتا ہے کہ وہ اس وقت تک واپس جاتا رہے جب تک وہ خاموشی میں خطرے کی آہٹ اور طلوع آفتاب میں امید کی کرن محسوس نہ کرنے لگے۔ حکمرانی کے قابل وہی ہے جو ان چیزوں کو سن سکے جو آواز نہیں کرتیں۔

اگر محمد بن سلمان کا ہدف واقعی ایران کو زیر کرنا ہے، تو ریاض غلط میدانوں میں جنگ چلن رہا ہے۔ لبنان اور یمن جیسے ممالک ضمنی محاذ ہیں، جہاں جنگیں مہنگی، پیچیدہ، غیر یقینی اور بے نتیجہ ثابت ہوتی ہیں۔ مشرق وسطیٰ میں طاقت کا توازن دراصل شام اور عراق جیسے ممالک میں طے ہوتا ہے، جہاں لاگت بہت زیادہ اور خطرات اس سے کہیں بڑھ کر ہوتے ہیں۔ اور ان دونوں ممالک میں ایران کئی قدم آگے ہے۔ اس کے پاس نیٹ ورک کا تجربہ، مہارت اور وہ تزویراتی صبر موجود ہے جو کم خرچ میں پر کسی جنگیں جیتنے کے لیے درکار ہوتا ہے، اور اس کے ساتھ ایک ایسی چالاکی بھی جو انکار کی گنجائش رکھتی ہے۔ ایران کو مشرق وسطیٰ سے پسپا کرنا آسان نہیں۔ ایران کی ایک اور طاقت یہ ہے کہ اُس نے اپنے اتحادیوں اور حامیوں کو یہ دکھا دیا ہے کہ وہ اچھے وقتوں میں ہی نہیں بلکہ برے دنوں میں بھی ان کے ساتھ کھڑا رہتا ہے۔ اس معاملے میں سعودی عرب مسیوں وہ پائیداری اور تسلسل موجود نہیں۔

عرب بہار کے اثرات

2011 کی عرب بہار سعودی عرب اور ایران کی رقابت کی تاریخ میں ایک نہایت اہم سنگ میل ہے۔ اس نے مشرق وسطیٰ کے سیاسی منظر نامے کو یکسر بدل کر رکھ دیا اور فرقہ وارانہ خلیج کو ایسی انتہاؤں تک پہنچا دیا جو اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی گئی تھیں۔ سنی عرب ممالک کے وہابی-سلفی بیانیے نے شیعوں کے خلاف اپنی شدت میں اضافہ کر دیا، جس سے خطے میں مزید انتشار اور تقسیم پیدا ہوئی۔ سعودی عرب، بحرین اور یمن جیسے ممالک میں مذہبی اقلیتوں نے حکمرانوں اشرافیہ کے خلاف احتجاج شروع کیے۔ چنانچہ اس کا ایک بڑا نتیجہ یہ نکلا کہ سعودی عرب اور ایران کے مابین

بالواسطہ جنگوں کا سلسلہ از سر نو شروع ہوا، جیسا کہ لبنان، یمن، بحرین اور شام میں دیکھنے کو ملا۔ سعودی عرب اور ایران نے اپنی علاقائی بالادستی کے لیے مشرق وسطیٰ کے ممالک کے داخلی نسلی و مذہبی معاملات میں مداخلت کا جو سلسلہ شروع کیا، اس سے خطے کی غیر یقینی اور بد امنی میں مزید اضافہ ہوا۔ ایران، حزب اللہ اور مختلف شیعہ ملیشیاؤں کے ذریعے شام اور عراق میں، جبکہ سعودی عرب، بحرین اور یمن میں اپنے قومی محافظ دستوں کے ذریعے اپنے ہمنوا حکمرانوں کی پشت پناہی کرتا رہا۔

سعودی قیادت میں سنی عرب ممالک اور اسلامی جمہوریہ ایران کے درمیان کشیدگی دو بنیادی نکات پر مرکوز رہی: ایک، مشرق وسطیٰ میں طاقت کا مرکز بننے کی کشمکش؛ اور دوسرے، دونوں ملکوں کے مابین دو متضاد نظریات کی برتری کی جنگ۔ مسلمانوں کی بھاری اکثریت دنیا بھر میں سنی عقیدے سے تعلق رکھتی ہے، جن کا تناسب تقریباً 80 فیصد ہے۔ یہ عقیدہ شمالی افریقہ اور مشرق وسطیٰ میں غالب ہے۔ شیعہ اکثریتی ممالک میں صرف ایران، عراق، آذربائیجان اور بحرین شامل ہیں، البتہ یمن، لبنان، کویت، شام اور قطر میں شیعوں کی ایک قابل ذکر آبادی موجود ہے۔

عرب بہار کے واقعات اسلامی جمہوریہ ایران کے لیے ایک فیصلہ کن موڑ ثابت ہوئے۔ چند عرب آموں کی معزولی اور سوشل میڈیا کے ذریعے پیدا ہونے والے خلفشار نے مشرق وسطیٰ میں ایران کو ایک زیادہ خود اعتماد اور فعال خارجہ پالیسی اپنانے کا موقع فراہم کیا۔ جمہوریت کی اس نئی لہر نے ان ممالک کو بھی اپنی لپیٹ میں لیا، جہاں شیعہ آبادی خاصی تعداد میں موجود ہے۔

ایران نے مستقل طور پر بحرین میں سیاسی اصلاحات کے مطالبات کی حمایت کی ہے، وہ جزیرہ نمالک جہاں اکثریتی آبادی شیعہ ہے، مگر حکومت سنی بادشاہت کے ہاتھ میں ہے۔ اسی طرح، سعودی عرب کے تیل سے مالا مال مشرقی علاقے ’الاحساء‘ میں بھی شیعہ آبادی خاصی بڑی ہے۔ ایرانی حکومت، اس علاقے میں شیعہ برادری کے ساتھ ہونے والے امتیازی سلوک پر سعودی عرب پر سخت تنقید کرتی رہی ہے۔ سعودی عرب میں معروف شیعہ عالم، شیخ نمر النمر کی سزائے موت اور دیگر شیعہ افراد کی پھانسی نے جنوری 2016 میں تہران اور ریاض کے مابین

ایک شدید سفارتی بحران کو جنم دیا۔ لبنان میں حزب اللہ کے رہنما نے سعودی عرب کی جانب سے نمر النمر کے سر قلم کرنے کے اقدام کو ”ظالمانہ، مجرمانہ اور دہشت گردانہ“ قرار دیا۔

اسلامی جمہوریہ ایران نے نہ صرف مشرق وسطیٰ بلکہ جنوبی ایشیائی ممالک جیسے پاکستان اور افغانستان سے بھی شیعہ برادری کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے منظم اور متحرک کیا۔ عراق کی تقسیم، تہران کے لیے ایک جیو-اسٹریٹجک فتح بن کر ابھری، کیونکہ صدام حسین کی حکومت عرب قوم پرستی کی علمبردار تھی۔ بعضی ریاست کے انہدام نے ایران کو عراق کے داخلی معاملات میں اثر اندازی کا نادر موقع عطا کیا۔ 2011 میں جب امریکی افواج عراق سے واپس ہوئیں، تو ایران نے نہایت ہوشیاری سے پیدا شدہ خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی، اور کامیاب بھی ہوا۔ بغداد میں قائم شیعہ اکثریتی حکومت اب داعش اور دیگر سنی شدت پسند گروہوں سے نمٹنے کے لیے ایرانی امداد پر بڑھتے ہوئے انحصار کر رہی ہے۔

حیران کن طور پر، سعودی عرب کی عراق کے تین پالیسی میں چلک کا عنصر آچکا ہے۔ ولی عہد محمد بن سلمان، ایران مخالف موقف رکھنے والے معروف شیعہ رہنما مقتدی الصدر سے متبرہت بڑھانے کی کوششوں میں نظر آ رہے ہیں، تاکہ عراق میں ایران کے اثر و رسوخ کو چیلنج کیا جاسکے۔ خطے میں کئی محاذوں پر سرگرم عمل ایران، اب بیس سال پہلے کی نسبت کہیں زیادہ پُر اعتماد ملک بن چکا ہے۔ امریکی و یورپی پابندیوں اور کم ہوتی تیل کی قیمتوں کے باوجود، ایران ایک مضبوط، خود کفیل اور باوقار ریاست کے طور پر اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہے، اور بدستدرتج مشرق وسطیٰ میں ایک علاقائی طاقت کے طور پر ابھر رہا ہے۔

2001 میں، ایران اور سعودی عرب کے درمیان ایک سیکیورٹی معاہدہ طے پایا، جس کا مقصد دہشت گردی اور منشیات کی اسمگلنگ سے نمٹنا تھا۔ تاہم، آنے والے برسوں میں دو بڑے واقعات نے دونوں ملکوں کے تعلقات پر گہرے اور دور رس اثرات ڈالے۔ پہلا واقعہ دہشت گردی میں نائن ایون حملوں کے بعد امریکی جنگ برائے دہشت گردی، اور دوسرا 2011 میں عرب بہار کا آغاز۔ پہلے واقعے نے مشرق وسطیٰ میں عراق کو ایک بڑی طاقت کے طور پر ختم کر

دیا، جب کہ دوسرے نے شام اور مصر جیسے اہم عرب ممالک کو غیر مستحکم کر دیا۔ ان دونوں واقعات نے سعودی عرب اور ایران کے درمیان موجودہ رقابت کو نئی شکل دی، جس میں دونوں نے مختلف انتہا پسند گروہوں کی حمایت کی اور ان کے لیے نئی پالیسیوں کا خاکہ تیار کیا۔

1979 میں، مسجد الحرام پر قبضے اور اسی برس ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد، سعودی عرب کی پالیسی میں ایک بنیادی تبدیلی رونما ہوئی۔ اس کے بعد کے برسوں میں، سعودی حکومت نے اربوں پیٹرول ڈالر خرچ کر کے وہابی-سلفی مکتبہ فکر کو دنیا بھر میں اپنے مختلف ثقافتی و سیاسی اداروں کے ذریعے پھیلا یا، جس کے اثرات دُور رس اور بعض اوقات تباہ کن ثابت ہوئے۔ تاہم، حالیہ برسوں میں سعودی حکمرانوں کو اس امر کا ادراک ہونے لگا ہے کہ اس شدت پسند بیانیے نے ملک کی معاشی اور مذہبی ساکھ کو عالمی سطح پر شدید نقصان پہنچایا ہے۔ بادشاہ سلمان اور ان کے باختیار، جارحانہ مزاج ولی عہد محمد بن سلمان کی قیادت میں ایک ہمہ جہت منصوبہ اصلاحات پیش کیا گیا ہے، جس کا مقصد مملکت کو تیل کی آمدنی پر انحصار سے نکال کر معاشی، سماجی اور مذہبی میدانوں میں نئے امکانات پیدا کرنا ہے۔ ان اصلاحات کا ایک پہلو وہابی-سلفی انتہا پسندی کو کمزور کرنا اور اسلام کو اس کی اعتدال پسند روح کے ساتھ دوبارہ پیش کرنا بھی ہے۔ ولی عہد محمد بن سلمان نے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ اسلام کی ”اصلاح“ نہیں بلکہ ”بحالی“ کر رہے ہیں، یعنی وہ مذہب کو اس کی اصل روح کی طرف واپس لے جانا چاہتے ہیں، جو برداشت، تنوع اور جدیدیت سے ہم آہنگ ہو۔

ولی عہد محمد بن سلمان نے سعودی عرب کی عسکری سرگرمیوں کو غیر ملکی جنگوں تک وسعت دی ہے۔ ان میں سب سے اہم اور نازک مہم پڑوسی ملک یمن میں حوثی باغیوں کے خلاف ہے، جس میں سعودی فوجی دستے زمینی کارروائی کے بجائے فضائی حملوں اور اتحادیوں کے ذریعے حصہ لے رہے ہیں۔ برسوں سے سعودی عرب نے پاکستان اور مصر کو مالی امداد فراہم کی ہے، لیکن ان دونوں ممالک نے سعودی عرب کی درخواست پر غیر ملکی سرزمین پر زمینی فوج بھیجنے سے انکار کر دیا۔ اس پر سعودی شاہی خاندان ناراض ہوا اور پاکستان کے ساتھ تعلقات میں سرد مہری آگئی۔ سعودی عرب کا الزام ہے کہ حوثیوں کو ایران کے پاسداران انقلاب اور لبنان کے حزب اللہ جنگجوؤں کی عسکری مدد حاصل ہے۔

اوباما انتظامیہ کے دور میں امریکہ کی ایران سے متعلق پالیسی میں ایک بڑی تبدیلی آئی۔ جولائی 2015 میں ایران اور چھ بڑی مغربی طاقتوں کے درمیان جوہری معاہدہ (JCPOA) طے پایا۔ اس معاہدے کے پورے مشرق وسطیٰ پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ امریکہ اور یورپی ممالک چاہتے تھے کہ ایران کو عالمی برادری کا حصہ بنایا جائے، لیکن سعودی عرب کی قیادت میں سنی عرب ممالک اس بات سے خائف رہے کہ ایران کہیں علاقائی طاقت کے طور پر ابھر نہ جائے۔

یہ جوہری معاہدہ سعودی عرب اور ایران کے درمیان کشیدگی میں اضافے کا باعث بھی بنا۔ اسرائیل نے پہلی بار عرب ممالک کے ساتھ کھل کر ایران کے جوہری عزائم پر تحفظات کا اظہار کیا۔ آنے والے وقتوں میں سعودی-ایران رقابت کے مزید شدت اختیار کرنے کا خدشہ ہے، اور اس کا مرکزی نکتہ مشرق وسطیٰ میں ایران کی اپنی نیابتی (پراکسی) تنظیموں کو دی جانے والی مسلسل حمایت ہوگا، بالخصوص یمن اور بحرین جیسے ممالک میں۔ ایران یمن اور شام میں بالواسطہ طور پر برسرِ پیکار ہے۔ اگرچہ سعودی عرب کی اپنی نیابتی قوتوں کو دی جانے والی حمایت ایران کے مقابلے میں اتنی مضبوط نہیں، لیکن اس کی موجودگی خطے میں کشیدگی کو مزید بڑھا دیتی ہے۔ سعودی عرب کو عراق میں خاطر خواہ حمایت حاصل نہیں، اور اس نے داعش کی کھلے عام حمایت سے بھی گریز کیا ہے۔ اس کے باوجود یہ بات عام ہے کہ شام میں داعش کو سعودی رابطوں سے مالی مدد ملتی رہی ہے۔ سعودی شاہی خاندان کو خدشہ ہے کہ اگر اخوان المسلمون کی حمایت حاصل ہو جائے، تو داعش دوبارہ ابھر کر خود سعودی عرب کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔ تاہم، شام میں سرگرم سلفی جہادی گروہ سعودی عرب کی مکمل پشت پناہی سے سرگرم ہیں، اور ان کی القاعدہ اور اس کی ذیلی تنظیموں سے باقاعدہ وابستگی موجود ہے۔

معاشی سطح پر بھی سعودی عرب اور ایران کے درمیان مسابقت آئندہ برسوں میں شدت اختیار کرے گی، خاص طور پر جب ایران پر عائد معاشی پابندیاں ختم ہو جائیں گی۔ سعودی عرب تیل کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہا ہے؛ وہ پیداوار میں کمی سے انکار کرتا ہے تاکہ ایران کو اپنا تیل مہنگے داموں فروخت کرنے سے روکا جاسکے۔ ایران آہستہ آہستہ بین الاقوامی تجارتی منڈی میں ایک فعال کھلاڑی بن کر ابھر رہا ہے، اور اس باعث معاشی رقابت میں اضافہ متوقع ہے۔

سعودی قیادت میں عرب ممالک کی جانب سے قطر پر لگائی گئی سخت اقتصادی ناکہ بندی نے خلیجی تعاون کونسل (GCC) میں دراریں ڈال دی ہیں، جو کہ ایران کے خلاف ایک متحدہ عرب محاذ پیش کرنے کی سعودی خواہش کے بالکل برعکس ہے۔ آئندہ دس سے پندرہ سالوں میں، بالخصوص JCPOA کے معیاد ختم ہونے کے بعد (2030)، نئی کشیدگیاں اور مسابقت کے مزید میدان پیدا ہو سکتے ہیں۔

خلیجی تجربہ نگاروں کا ماننا ہے کہ ولی عہد محمد بن سلمان نے خطے کی جغرافیائی سیاست اور معیشت کو نئے خطوط پر استوار کرنے کی کوشش کی، لیکن ان کے اقدامات احپانک، غیر متوازن اور غیر متوقع تھے، جس سے خطے میں نئی نیابتی جنگوں اور خانہ جنگیوں کے امکانات بڑھ گئے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ ان پالیسیوں سے مزید پناہ گزینوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا اور مزید موصول، صنعاء اور حلب جیسے شہر کھنڈرات میں بدل جائیں گے۔ تعمیر نو کی لاگت بھی چار گنا بڑھ سکتی ہے۔ کئی سفارت کاروں کو یہ تشویش لاحق تھی کہ محض سعودی عرب ہی نہیں بلکہ امریکہ بھی غیر متوقع فیصلے کر رہا ہے۔ صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی زیر قیادت امریکی حکومت نے اعلان کیا تھا کہ وہ اپنے خلیجی اتحادیوں کے ساتھ کھڑی ہے، اور اقوام متحدہ میں ایرانی حکومت کی جارحیت اور بین الاقوامی قوانین کی کھلی خلاف ورزیوں پر ان کے شکوک کی مکمل تائید کرتی ہے۔

ایران اور سرحد پار اتحاد

ایران نے اپنی طاقت میں اضافے کی حکمت عملی کو سرحد پار شیعہ یکجہتی کے فروغ اور مزاحمتی یا پابندیوں سے بچاؤ پر مبنی معیشت کی تشکیل پر مرکوز رکھا ہے۔ ایران-عراق جنگ (1980-1988) کے دوران، سنی اکثریتی صدام حکومت نے، امریکہ اور خلیجی عرب ممالک کی مدد سے، ایران کو شدید نقصان پہنچایا۔ اس کے بعد ایران نے عراقی شیعوں سے قریبی سیاسی، معاشی اور فرقہ وارانہ تعلقات استوار کیے تاکہ آئندہ عراق سے ایرانی سلامتی کو لاحق خطرات کا قلع قمع کیا جاسکے۔ ایران کا اصل ہدف یہ تھا کہ عراق میں سنی انتہا پسند گروہوں کے اثر و رسوخ کو محدود کیا جائے اور بغداد کو مستقبل میں سنیوں کے انتظامی غلبے سے محفوظ رکھا جائے۔ اسلامی

ریاست (داعش) جیسے مختلف سنی انتہا پسند گروہوں کے ابھارنے مشرق وسطیٰ میں ایران کے کردار کو شیعہ مسلمانوں کے محافظ کے طور پر مزید مستحکم کیا۔ صدر ولادیمیر پوتن کی جانب سے شام میں بشار الاسد کی حمایت میں براہ راست فضائی مداخلت نے ایران اور روس کو ایک اسٹریٹجک صف میں لاکھڑا کیا، جو کہ امریکہ-سعودی اتحاد کے مقابلے میں ایک مؤثر قوت کے طور پر ابھرا۔

مزا جمتی معیشت (Resistance Economy) ایران کی ایک ذہانت سے ترتیب دی گئی حکمت عملی ہے تاکہ وہ عالمی سطح پر معاندانہ اقتصادی ماحول میں بھی بقا اور ترقی کی راہیں تلاش کر سکے۔ یہ منصوبہ امریکہ کی قیادت میں لگائی گئی اقتصادی پابندیوں کے مہلک اثرات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد عالمی و علاقائی معاشی جھٹکوں سے بچنے کے لیے داخلی صلاحیتوں کو فروغ دینا، علم پر مبنی معیشت کی بنیاد رکھنا اور صنعتی پیداوار میں اضافہ کرنا ہے۔ اس منصوبے کا ایک اور بڑا مقصد یہ ہے کہ تیل و گیس پر انحصار کو کم کیا جائے، جو کہ ایران کی آمدنی کا بنیادی ذریعہ ہیں۔ ایران چاہتا ہے کہ امریکہ مشرق وسطیٰ میں اپنی موجودگی کم کرے یا مکمل طور پر ختم کر دے۔

عرب بہار (Arab Spring) نے ایران کے لیے اثر و رسوخ بڑھانے کے کئی نئے مواقع پیدا کیے، جبکہ سعودی عرب محض جوں کی توں صورت حال کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب کہیں سعودی نواز حکومت کو خطرہ لاحق ہوتا، تو ایران مخالف دھڑوں کی پشت پناہی کرتا؛ اور جب ایرانی اتحادی حکومتیں کمزور ہوتیں، تو سعودی عرب انہیں گرانے کی کوشش کرتا۔ مثال کے طور پر، جب شام میں بشار الاسد کی حکومت زوال کے دہانے پر پہنچی، سعودی عرب نے اسے گرانے کی کوشش کی، لیکن ایران نے روس اور حزب اللہ کی مدد سے اسے سہارا دیا اور بحال کر دیا۔ بحرین میں، جہاں شیعہ اکثریت نے سنی بادشاہت کے خلاف جمہوریت پسند مظاہرے کیے، سعودی عرب نے ایرانی اثر و رسوخ سے خوفزدہ ہو کر اپنی فوج بھیج دی اور ان مظاہروں کو بہیمانہ طاقت سے کچل دیا۔

یمن میں، ایران نے زیدی شیعہ فرقے سے تعلق رکھنے والے حوثی باغیوں کی مالی اور عسکری امداد میں اضافہ کیا۔ جب سنہ 2015 کے آغاز میں ان باغیوں نے دارالحکومت صنعا پر قبضہ کر لیا

اور ملک کے باقی حصوں کی طرف بڑھنے لگے، تو سعودی عرب نے متحدہ عرب امارات کے ساتھ مل کر ان کے خلاف فضائی بمباری مہم کا آغاز کر دیا۔ تاہم، حوثی باغیوں نے مزاحمت جاری رکھی اور دارالحکومت پر اپنی گرفت قائم رکھی۔ اس کے بعد، سعودی بحریہ نے یمنی بندرگاہوں کی ناکہ بندی کردی اور ہر قسم کی انسانی امداد کو روک دیا۔ جب عالمی ذرائع ابلاغ نے یمنی بچوں اور نومولودوں کی بھوک اور بد حالی کی تصاویر نشر کیں، تو اقوام متحدہ اور مغربی ممالک کے شدید دباؤ کے نتیجے میں سعودی عرب کو ناکہ بندی ختم کرنا پڑی اور انسانی امداد کو اسپتالوں تک پہنچنے کی اجازت دی گئی۔

مشرق وسطیٰ سے امریکہ کی مکمل پسپائی نے ایران، سعودی عرب اور دیگر علاقائی طاقتوں کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ لبنان، عراق اور شام جیسے ممالک کی خانہ جنگیوں میں براہ راست مداخلت اور کردار ادا کریں۔

عربوں کا فلسطینیوں کے ساتھ دغا

ڈونلڈ ٹرمپ اکثر خود کو ایک چالاک سوداگر قرار دیتے تھے۔ جب جنوری 2017 میں وہ امریکہ کے صدر بنے، تو انہوں نے خود کو اُن چینلجز سے نمٹنے کے لیے تیار پایا جن میں اُن سے پہلے تمام صدور ناکام رہے تھے۔ فلسطین۔ اسرائیل تنازع کی ذمہ داری انہوں نے اپنے داماد جیرڈ کشر کو سونپی، جو نہ صرف ایک پابند شریعت یہودی تھے بلکہ وائٹ ہاؤس میں ایک سینیئر مشیر بھی تھے، حالانکہ انہیں سکیورٹی کلیئرنس تک حاصل نہ تھی۔ انہیں فلسطینی۔ اسرائیلی تنازع کی پیچیدہ تاریخ کا کوئی پس منظر معلوم نہ تھا، چنانچہ ان کی قیادت میں وائٹ ہاؤس کی کوششوں کو عرب دارالحکومتوں میں شک و شبہ کی نظر سے دیکھا گیا۔

صدر ٹرمپ اور اُن کی ٹیم نے اس وقت کو موزوں اس لیے سمجھا کہ سعودی اور اسرائیلی یکم ایران کو ایک بڑا خطرہ تصور کرتے ہوئے ایک دوسرے کے قریب آچکے تھے۔ اسی تناظر میں، مصری صدر کو فلسطینی اتھارٹی کے صدر محمود عباس (جو مغربی کنارے کے نمائندے ہیں) اور حماس (جو غزہ پر قابض ہے) کے درمیان مصالحت کرانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ یہ منصوبہ اس لیے

بنایا گیا تھا تاکہ فلسطینی اتھارٹی کو فلسطینی عوام کی نمائندہ حیثیت میں مضبوط کیا جاسکے۔ لیکن صدر ٹرمپ کی جانب سے اچانک امریکی سفارت خانے کو قتل ایب سے یروشلم منتقل کرنے کے اعلان نے تقریباً تمام عرب ممالک کو شرمندہ کر دیا، سوائے سعودی عرب کے۔ ٹرمپ نے وہ کام کر دکھایا جو اس سے قبل کسی بھی امریکی صدر نے نہ کیا تھا، اور اس اقدام کے نتیجے میں فلسطین کی حمایت کرنے والے تمام دھڑے ایک پلیٹ فارم پر آ گئے۔ فلسطینی عوام ٹرمپ کے اشتعال انگیز فیصلے کے خلاف سراپا احتجاج بن گئے، کیونکہ انہوں نے یروشلم کو اسرائیل کا واحد دار الحکومت تسلیم کر لیا تھا۔ یروشلم کا مشرقی حصہ، جس پر اسرائیل نے 1967 میں قبضہ کیا تھا، مستقبل میں ایک آزاد فلسطینی ریاست کا دار الحکومت تصور کیا جاتا رہا ہے، بشرطیکہ دوریاتی حل پر کبھی عمل ہو سکے۔

ادھر ولی عہد محمد بن سلمان اور متحدہ عرب امارات کی قیادت اردن کی معیشت کو دباؤ میں لا کر گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ وہ ان کے شرائط تسلیم کرے، خطے میں ان کی قیادت کو مانے اور صدر ٹرمپ کے نام نہاد حتمی امن معاہدے پر راضی ہو جائے، جو فلسطین کے پیچیدہ مسئلے کے حل کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ ولی عہد کی ایک اور غلط حکمت عملی ہے، جس کا مقصد اردن اور فلسطینی قیادت کو سعودی مرضی کے تابع کرنا ہے، تاکہ امریکہ اور اسرائیل کے ساتھ قریبی تعلقات قائم کیے جاسکیں۔

اس دباؤ کا ایک اندازہ یہ بھی تھا کہ سعودی حکام نے عرب بینک کے چیئرمین صبح المصری کو اس وقت حراست میں لے لیا جب وہ نجی دورے پر ریاض آئے ہوئے تھے۔ صبح المصری کی اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری اردن کی معیشت کا ستون سمجھی جاتی ہے۔ عرب بینک جس کا صدر دفتر عمان میں ہے، اردن کا سب سے بڑا مالیاتی ادارہ ہے اور مشرق وسطیٰ و شمالی افریقہ میں معاشی ترقی کا ایک اہم محرک بھی۔ عرب تجربہ کاروں کے مطابق، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات نے اردن پر دباؤ ڈالا کہ وہ امریکہ کی جانب سے یروشلم کو اسرائیل کا دار الحکومت تسلیم کرنے کے فیصلے اور فلسطینی ریاست کے ایک انتہائی محدود تصور کو قبول کرے۔ تاہم، اردن نے فلسطینی موقف کی بھرپور حمایت کرتے ہوئے امریکی فیصلے کو سختی سے مسترد کر دیا تھا۔

ایک اور نہایت متنازع، حساس اور کٹھن مسئلہ جس کا سامنا ولی عہد محمد بن سلمان کو اندرون ملک ہے، وہ یہ وہابی۔ سلفی اسلام کی سخت گیر تعبیر کی اعتدال پسندی کی طرف منتقلی، تاکہ صوفی سنی اسلام کو زیادہ جگہ دی جاسکے، جو عقیدت پر مبنی اور برداشت پر یقین رکھتا ہے۔ سعودی شاہی خاندان اور اٹھارہویں صدی کے اصلاح پسند عالم محمد بن عبدالوہاب کے درمیان ایک غیر تحریری معاہدہ موجود ہے، جو آج تک ناقابل چیلنج مانا جاتا رہا ہے۔ مگر ولی عہد کا اسلام کو ”معتدل“ بنانے کا عزم ان تاریخی بنیادوں کو ہلانے کی خواہش کی عکاسی کرتا ہے، جو عشروں سے جمی ہوئی تھیں۔

ولی عہد نے سعودی عرب کے مذہبی ڈھانچے میں اصلاحات لانے کی کوششوں کے تحت مذہبی پولیس (مطوعین) کے اختیارات کم کر دیے، اور انہیں گرفتاری کا اختیار واپس لے لیا گیا۔ خواتین کو گاڑی چلانے، اسٹڈیم جانے، فلمیں دیکھنے اور بغیر مرد سرپرست کے سفر کرنے کی اجازت دی گئی۔ کنسرٹس اور سنیما گھروں کے کھولنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان فیصلوں پر اختلاف کرنے والے کئی سخت گیر وہابی اور سلفی علما کو گرفتار کر لیا گیا۔ انتہا پسندانہ تعلیمات کے خلاف عالمی سطح پر کام کے لیے ایک عالمی علما کونسل بھی بادشاہ کے حکم پر قائم کی گئی ہے۔ سعودی معاشرے کو آزاد اور لبرل بنانا، ولی عہد کے وژن میں شامل ”مملکت کی جدید کاری“ کی کوششوں کا ایک اہم حصہ ہے۔

ولی عہد محمد بن سلمان کے تحت سعودی عرب کی خارجہ پالیسی اگر صرف ٹرمپ کی جانب سے ملنے والی حمایت پر تکیہ کر رہی ہے تو یہ ایک غلط فہمی پر مبنی حکمت عملی ہے۔ امریکہ کے اقدامات کچھ بھی ہوں، ایران کے خلاف بڑھتی ہوئی بیان بازی اور اپنے سے چھوٹے سنی عرب ممالک جیسے قطر اور اردن کو زبردستی اپنی قیادت تسلیم کروانے کی کوششیں، سعودی عرب کی عرب دنیا میں سیاسی ساکھ کو کمزور ہی کریں گی۔ یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ سعودی عرب خود ہی اپنے سیاسی مقام کو نقصان پہنچا رہا ہے، ایران سے تنازع کو بڑھا کر اور قطر کو بزور طاقت تابع بنانے کی کوششوں سے۔

سعودی عرب یہ سمجھتا رہا ہے کہ امریکہ کے ساتھ اس کا سکیورٹی تعلق اسے ایران پر فوجی برتری عطا کرتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ سعودی عرب کی اصل سیاسی قوت اس کی عرب دنیا میں روایتی نیک نامی اور قدیم مقام پر استوار ہے۔ لیکن یہ عرب نظم و نسق اب ٹرمپ کی بے لگام پالیسیوں اور

محمد بن سلمان کے غیر متوازن اقدامات کے سبب لرز رہا ہے۔ صدر ٹرمپ کی جانب سے یروشلم کو اسرائیل کا دار الحکومت تسلیم کرنے کے اعلان نے تمام عرب اور مسلم ممالک میں شدید مظاہروں کو جنم دیا۔

اس اعلان کے بعد اسلامی تعاون تنظیم (OIC) کا ہنگامی اجلاس ترکی کے شہر استنبول میں طلب کیا گیا۔ لیکن سعودی عرب اور اس کے حامی ممالک، متحدہ عرب امارات، بحرین اور مصر بنی نے اس اجلاس کا بائیکاٹ کیا۔ جبکہ دیگر تمام عرب اور مسلم ممالک نے شرکت کی، جن میں ایران بھی شامل تھا۔ عرب اسپرنگ، خانہ جنگیوں، اور حالیہ دنوں میں امریکی صدر کی غیر متوقع پالیسیوں نے سعودی عرب کو دفاعی پوزیشن پر لاکھڑا کیا ہے، جبکہ ایران کے لیے ایک سنہری موقع پیدا کر دیا ہے۔ ایران کے خلاف دشمنی کو بڑھانے سے یمن کی جنگ مزید طویل ہو سکتی ہے، اور سعودی عرب کا اسرائیل سے قربت اختیار کرنا یا ٹرمپ اور جیرڈ کشتنر کا تجویز کردہ امن منصوبہ تسلیم کرنا، یہ سب سعودی عرب کی مشرق وسطیٰ میں پوزیشن کو مزید کمزور کر دے گا۔

شامی دلدل اور سعودی امکانات کی ڈوبتی ہوئی کشتی

اس وقت شام میں، صدر بشار الاسد کے خلاف سنی مزاحمتی تحریک کے اندر جو صورت حال جنم لے رہی ہے، وہ اس حقیقت کی علامت ہے کہ عرب ممالک کے باہمی اختلافات سعودی عرب کے لیے ایران سے کہیں بڑا خطرہ بن چکے ہیں۔ اس کے برعکس، ایران کی قیادت میں قائم شیعہ اتحاد نہایت منظم اور متحد ہے، جو شامی حکومت کا بھرپور ساتھ دے رہا ہے، جبکہ سنی مخالفین کی صفیں منتشر اور بکھری ہوئی ہیں۔ ان میں القاعدہ سے منسلک جہادیوں سے لے کر سلفی گروہوں جیسے جیش الاسلام تک کئی گروہ شامل ہیں۔ ایران، روس اور مختلف شیعہ ملیشیاؤں کی مدد سے بشار الاسد کی حکومت کو جو سہارا ملا ہے، اس کے پیش نظر یہ امکان کم ہی ہے کہ سنی مخالف گروہ مستقبل قریب میں اس کے لیے کوئی وجودی خطرہ بن سکیں گے۔ مزید یہ کہ شام میں موجود کچھ سنی جہادی گروہ جیسے حیات تحریر الشام، اپنا رخ خود عرب دنیا کی جانب موڑ سکتے ہیں، جو سعودی عرب کے لیے ایک بڑا سیاسی اور سکیورٹی چیلنج بن جائے گا۔ شام میں برسوں سے لڑنے والے یہ پختہ کار جنگجو

خطے کے دیگر حصوں میں بھی پھیل سکتے ہیں، جس سے ایران کے مقابلے میں سعودی عرب کی پوزیشن مزید کمزور ہو سکتی ہے۔ سعودی عرب نے خود بھی اس خطرے کو بڑھاوا دیا ہے، جب اس نے سنی عرب دنیا کے اندر موجود اختلافات کو قطر کے ساتھ تنازعے کا محور بنادیا۔

سعودی عرب اخوان المسلمون کو ایک دہشتگرد تنظیم اور آل سعود کے لیے خطرہ سمجھتا ہے، جبکہ قطر نے اس قریباً سو سال پرانی سیاسی اسلامی تحریک کے لیے اپنے دروازے کھلے رکھے ہیں، جس کے متعدد عرب ممالک میں گہرے اثرات ہیں۔ اخوان المسلمون کو سنی اتحاد سے باہر نکال کر، سعودی عرب، مصر اور متحدہ عرب امارات دراصل ایسے انتہا پسند گروہوں کے لیے جگہ بنا رہے ہیں، جیسے کہ اسلامک اسٹیٹ اور القاعدہ کے مختلف دھڑے، جو شام میں جڑیں رکھتے ہیں۔

جب امریکی حمایت یافتہ شامی ڈیموکریٹک فورسز (SDF) نے مشرقی شام میں اپنی فوجی کارروائیوں میں شدت پیدا کی، تو ہزاروں غیر ملکی داعش جنگجو اور ان کے اہل خانہ وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ بہت سے جنگجو بغیر کسی مزاحمت کے جنوب اور مغرب کی طرف شامی افواج کی صفوں سے گزر کر نکل گئے؛ کچھ دمشق اور شمال مغربی علاقوں میں چھپ گئے؛ جب کہ بعض نے امریکی ڈالر کے ذریعے ترکی پہنچنے کے لیے رشوت دے کر راستہ خریدا، اس امید میں کہ وہ یورپ واپس جاسکیں گے۔ امریکی عسکری مشیر اس بات پر تشویش میں مبتلا ہیں کہ ترکی کی کرد اکثریتی SDF کے خلاف افرین، شمالی شام میں فوجی کارروائی اس مسئلے کو مزید گمبھیر بنا رہی ہے۔

ترکی، سنی باغیوں کو کردوں کے خلاف استعمال کر رہا ہے؛ سعودی عرب اور اردن، سنی باغیوں کو بشار الاسد حکومت کے حامیوں کے خلاف لڑا رہے ہیں؛ جب کہ SDF، داعش کو شکست دینے، اس کی طاقت گھٹانے اور اسے ختم کرنے کے لیے امریکی افواج کے ساتھ مل کر کام کر رہی ہے۔ انہوں نے فرات دریا کے بالائی علاقے سے، بشمول داعش کے عملی دار الحکومت رقہ، اسے نکال باہر کرنے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی۔ 120 ممالک کے 40000 سے زائد غیر ملکی جنگجو، جو کبھی داعش کے ساتھ لڑائی میں شریک تھے، اب پورے خطے میں بکھر چکے ہیں۔ ہزاروں شام اور عراق کے میدانِ جنگ میں مارے جا چکے ہیں، لیکن جو بچے ہیں وہ اب یمن، لیبیا یا فلپائن جا رہے ہیں، اور بعض ترکی یا

شام۔ عراق سرحد پر چھپے ہوئے ہیں۔ یہ تصور کرنا کہ یہ غیر ملکی جنگجو خاموشی سے شام چھوڑ کر واپس پیرس، برسلز یا کوپن ہیگن میں دکانیں چلانے لگیں گے، ایک خام خیالی سے زیادہ کچھ نہیں۔

شام کی جنگ میں شامل ممالک جنگ کے مالک نہیں بلکہ کرایہ دار ہیں۔ بشار الاسد کی حمایت میں لڑنے والے یا ایرانی حمایت یافتہ شیعہ کرائے کے فوجی عراق، لبنان، پاکستان اور افغانستان سے آئے ہوئے ہیں۔ روس، جو پہلی بار مشرق وسطیٰ میں ایک سپر پاور کے طور پر داخل ہوا ہے، شام میں بادشاہ گر کی حیثیت رکھتا ہے۔ میدان جنگ کے لیے نجی روسی کمپنی ”ویگنر“ کے ذریعے جنگجو فراہم کیے جاتے ہیں، جو جانی نقصان برداشت کرتے ہیں۔ امریکی حمایت یافتہ کرد جنگجو شمالی شام میں داعش کی باقیات سے لڑ رہے ہیں۔ دوسری طرف، سعودی عرب اور اردن کے حمایت یافتہ سنی گروہ، بشار الاسد حکومت کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔ شام کی خانہ جنگی کو، بجا طور پر ایک سہ جہتی میدان جنگ کہا جاسکتا ہے، جس میں متعدد فریق شامل ہیں اور اتحاد مسلسل بدل رہے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس جنگ کا کوئی مالک نہیں، اور جب کوئی جنگ کا مالک نہ ہو تو اسے کوئی ٹھیک بھی نہیں کرتا۔

جیرڈ کشنر، جو امریکی منصوبہ امن برائے فلسطین کے مرکزی معمار ہیں، نے سعودی عرب کو اسرائیل کے بہت قریب کر دیا ہے تاکہ اُسے ایک ممکنہ شراکت دار بنایا جاسکے۔ لیکن یہ شراکت داری فلسطین، اردن اور دیگر کئی عرب ممالک کو بری طرح پریشان کر چکی ہے۔ یقینی طور پر، خلیج کی سنی عرب ریاستوں اور اُن سے آگے کے علاقوں کے لیے سب سے بڑا خطرہ دراصل سلفی انتہا پسند اسلامی گروہ ہیں، نہ کہ کوئی اور۔ امریکہ کے مشرق وسطیٰ سے انخلا کے نتیجے میں جو خلا پیدا ہوا ہے، اُسے اب روس، ترکی، ایران اور قطر پر کر رہے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ سعودی شاہی خاندان اس وقت کو اسرائیل سے دوستی کے لیے سازگار سمجھتا ہے۔ سعودیہ میں حالیہ داحسلی ہلچل، جس کے تحت متعدد بااثر شہزادوں، ممتاز کاروباری شخصیات اور سخت گیر علما کو گرفتار کیا گیا، کو ولی عہد محمد بن سلمان (MBS) کی جانب سے اختلاف رائے کو دبانے اور اپنی طاقت کو مضبوط بنانے کی کوشش کے طور پر دیکھا گیا، حالانکہ اس کا بہانہ بدعنوانی کے خلاف کارروائی تھا۔ سیاسی و

مذہبی سطح پر تیز رفتار تبدیلیاں سعودی عرب کو اسرائیل کے ساتھ ہم آہنگی پر مجبور کر رہی ہیں۔ مگر ایران اس ’ناپاک اتحاد‘ سے پریشان نہیں ہے، بلکہ اس نے اپنی امنچ کو بہتر بنانے کی ایک نرم حکمت عملی اختیار کر لی ہے تاکہ عرب عوام کے بڑے طبقے میں خود کو بہتر طور پر پیش کر سکے۔

یروشلم کے حتمی درجے کا مسئلہ اسرائیل-فلسطین تنازعہ کا ایک سب سے پیچیدہ سوال رہا ہے۔ صدر ٹرمپ کی جانب سے یروشلم کو اسرائیل کا دارالحکومت تسلیم کرنا، ایک ایسا فیصلہ تھا جو مذاکرات کے ذریعے ہونا تھا، مگر اسے یکطرفہ طور پر مسلط کر دیا گیا۔ ٹرمپ کے اس اقدام سے ایک ایسا خطہ، جو پہلے ہی عدم استحکام کا شکار ہے، مزید غیر مستحکم ہو گیا۔ ترک صدر کے مطابق، امریکی صدر دنیا اور خطے کو ایسی آگ میں جھونک رہے ہیں جس کا کوئی اختتام نظر نہیں آ رہا۔ ترکی نے یہ بھی کہہا کہ اگر امریکہ نے اپنا سفارت خانہ یروشلم منتقل کیا، تو وہ اسرائیل سے سفارتی تعلقات منقطع کر دے گا۔ ولی عہد محمد بن سلمان کو بھی صدر ٹرمپ کے وقت سے پہلے اس اعلان سے سبکی اٹھانا پڑی۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اب خطے میں امن کی کوششوں کو دوبارہ زندہ کرنا بہت مشکل ہو چکا ہے کیونکہ تمام عرب اور غیر عرب مسلم ممالک نے امریکہ کے اس اقدام کی شدید مذمت کی ہے۔

فلسطینی باشندے یروشلم کی کل آبادی کا تقریباً 37 فیصد ہیں، جو 850000 کے لگ بھگ ہے۔ ان میں سے کئی افراد گنجان بستیوں میں رہتے ہیں، جہاں مکانات کی توسیع یا نئی تعمیر کے لیے سرکاری اجازت نامہ حاصل کرنا انتہائی دشوار ہے۔ بین الاقوامی برادری مشرقی یروشلم کو ایک مقبوضہ علاقہ تسلیم کرتی ہے، لیکن اسی شہر کے اس حصے میں وہ مقامات بھی واقع ہیں جو تینوں توحیدی مذاہب کے لیے مقدس ہیں۔ یہاں دیوارِ گریہ (Western Wall) واقع ہے، جو یہودیوں کا مقدس ترین مقام مانا جاتا ہے، اور اسی جگہ حرم الشریف (Haram al-Sharif) بھی موجود ہے، جو مسلمانوں کا نہایت مقدس مقام ہے۔ فلسطینی قیادت اور بین الاقوامی برادری کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مشرقی یروشلم کو مستقبل میں فلسطینی ریاست کا دارالحکومت قرار دیا جائے، اگر دو ریاستی حل (Two-State Solution) پر عمل ہوتا ہے۔ مگر اسرائیل اس سے انکاری ہے، اور موجودہ وزیراعظم بنیامین نتن یاہو بار بار کہہ چکے ہیں کہ یروشلم پر کسی قسم کی سودے بازی یا

رعايت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ادھر، سعودی عرب ایک طرف اپنی معیشت اور شہری سماج کو اعتدال پسند بنانے کی کوشش کر رہا ہے اور دوسری طرف انتہا پسندی اور مختلف دہشت گرد گروہوں سے نہر آڑ ما ہے۔ یہ وہ گروہ ہیں جو انتہا پسند سلفی نظریے کے پیروکار ہیں اور اسے بے دریغ سعودی دولت کی پشت پناہی سے پھیلا رہے ہیں۔ دوسری طرف، ایران انہی پر کسی گروہوں کو سپورٹ کر رہا ہے، جن کے خلاف سعودی عرب اور امریکہ لڑ رہے ہیں۔ ایران کا یہ نیٹ ورک مشرق وسطیٰ کے کئی علاقوں میں سلفیوں کے خلاف سرگرم ہے۔

امریکہ کی جانب سے یروشلم کو اسرائیل کا دار الحکومت تسلیم کرنا، اس پیچیدہ علاقائی تناظر میں، غیر متوقع طور پر ایران کی پوزیشن کو مضبوط بناتا ہے۔ سعودی عرب کے چند حالیہ اقدامات، جیسا کہ لبنانی وزیر اعظم سعد حریری سے زبردستی استعفیٰ لینا، یروشلم کو اسرائیلی دار الحکومت تسلیم کرنے کا امریکی فیصلہ، اور اردن پر دباؤ ڈالنے کے لیے فلسطینی ارب پتی صبح المصری کی گرفتاری، سعودی مفاد کے برعکس الٹا ایران کے حق میں ثابت ہوئے۔ 13 دسمبر 2017 کو ترکی نے اسلامی تعاون تنظیم (OIC) کا ایک ہنگامی سربراہی اجلاس استنبول میں طلب کیا تا کہ صدر ٹرمپ کے فیصلے کی مذمت کی جاسکے۔ اس اجلاس میں ایرانی صدر کے ساتھ ساتھ کویت، اردن، قطر اور دیگر کئی مسلم ممالک کے سربراہان مملکت شریک ہوئے۔ جبکہ سعودی عرب اور اس کے حلیف ممالک نے محض نجلی سطح کا وفد اجلاس میں بھیجا، جسے سیاسی بے دلی سے تعبیر کیا گیا۔ اجلاس کے بعد ایرانی وزیر خارجہ جواد ظریف نے ٹویٹر پر لکھا: ”اس غیر معمولی او آئی سی اجلاس میں اعلیٰ سطحی شرکت سے حوصلہ ملا۔ چند ایک معنی خیز استثناءؤں کے باوجود۔“

گزشتہ کئی دہائیوں سے ریاض نے اپنی شناخت چھپائے رکھتے ہوئے عالمی سطح پر وہابی مکتبہ فکر کے تحت سلفی اسلام کے نظریات کو پھیلا نے میں اپنا تیل پر مبنی خزانہ جھونک رکھا تھا۔ مختلف ممالک میں مساجد اور اسلامی مراکز قائم کیے گئے، جہاں وہابی سوچ پر مبنی جہادی لٹریچر مہیا کیا گیا، تا کہ اسلامی نقطہ نظر کو وہابی قالب میں ڈھالا جاسکے۔ ان کوششوں کے بعد، سعودی عسکری

اور خفیہ نظام نے یمن میں ایک وحشیانہ جنگ کا آغاز کیا، جس میں بے دریغ بمباری کے ذریعے شہری علاقوں کو نشانہ بنایا گیا، اور لاکھوں بے گناہ افراد، بشمول خواتین اور بچے، بے پناہ تباہی، فاقہ کشی، اور بیماریوں کا شکار ہوئے۔ اسی کے ساتھ، سعودی عرب کی جانب سے قطر کے خلاف معاشی اور فضائی ناکہ بندی کی گئی، جس نے قطر کو ایران اور ترکی کی جھولی میں دھکیل دیا۔ ان تمام ناکام خارجی مہمات کے بعد، نوآموز ولی عہد کی قیادت میں مملکت اب اپنے زخم چاٹ رہی ہے۔ خطے کے امور کو ناچنیتہ طریقے سے سنبھالنے کی بدولت، سعودی عرب نے اپنے قریبی اتحادیوں کو بھی شرمندگی میں ڈال دیا، جنہوں نے ولی عہد کو مزید مہم جوئی سے باز رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ ان تمام حالات کا مرکزی نکتہ سعودی عرب اور ایران کے درمیان خطے میں بالادستی کے لیے جاری کشمکش ہے۔

یمن کی جنگ درحقیقت ولی عہد کی خاص حکمت عملی تھی، اور اس میں ناکامی کو ان کے لیے نقصان دہ دھبہ سمجھا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسی کے حکم پر سمندری ناکہ بندی، فضائی حملے، اور حوثیوں کو اپنے خلاف سامنے لانے کی حکمت عملی پر عمل کیا گیا۔ سعودی سوشل میڈیا پر یہ تاثر شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے کہ سعودی حکومت قطر اور بیماری کو، طور جنگی ہتھیار استعمال کر رہی ہے تاکہ یمنیوں کو شکست دی جاسکے۔ وائٹ ہاؤس اور امریکی وزارت خارجہ اس وقت خطے کے بدترین انسانی بحران کو نظر انداز کر رہی ہیں اور ناکہ بندی پر چشم پوشی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ امریکی فوجی کمانڈرز جو اس بحران سے واقف ہیں، کہتے ہیں کہ ایران نے گزشتہ پانچ برسوں میں یمن میں جتنی پیش رفت کی ہے، وہ لبنان میں حزب اللہ کو تیار کرنے میں بیس برس میں بھی حاصل نہ کر سکا۔ جب یمن کی جنگ کا آغاز ہوا، اس وقت ایران کے حوثیوں سے روابط انتہائی محدود تھے۔ مگر آج یہ تعلق ایک مضبوط اتحاد کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ ایران انتہائی ہوشیاری سے اس تنازعے کو چلا رہا ہے اور سعودی عرب کو مالی لحاظ سے سخت سزا دے رہا ہے، کیونکہ سعودیہ ہر ماہ اربوں ڈالر خرچ کر رہا ہے، جبکہ ایران کی لاگت معمولی ہے۔ ایران حوثیوں کی میزائل صلاحیتوں کو بہتر بنانے میں بھی مدد دے رہا ہے۔ اب تک سو سے زائد میزائل سعودی شہروں اور فوجی اڈوں پر داغے جا چکے ہیں، جن

میں ریاض کا ہوائی اڈہ بھی شامل ہے۔ روس ہر اس قرارداد کو ویٹو کر دیتا ہے جو امریکہ سلامتی کونسل میں ایران کو میزائل ٹیکنالوجی کی فراہمی پر مذمت کے لیے پیش کرتا ہے۔

1990 کی دہائی میں مشرق وسطیٰ میں ایران کا اثر و رسوخ تقریباً نہ ہونے کے برابر تھا، مگر آج کے دن وہ پورے خطے میں غیر معمولی سطح پر پہنچ چکا ہے۔ یمن میں شیعہ حوثی باغیوں نے 2014 میں بغاوت کرتے ہوئے اقتدار پر قبضہ کیا، اور پھر وقت کے ساتھ اپنی گرفت مضبوط کرتے چلے گئے۔ یہ بظاہر ایک مقامی واقعہ تھا، لیکن ریاض نے ردِ عمل میں زمینی فوج بھیجے بغیر فضائی حملے شروع کر دیے۔ حوثیوں کو لبنان کی حزب اللہ کی عسکری مدد حاصل ہے، جسے ایران کی پشت پناہی حاصل ہے، اور یہی اتحاد اب سعودی عرب کو لہولہان کر رہا ہے۔ بشار الاسد کی علوی حکومت، حزب اللہ، ایران اور روس کی مدد سے شامی خانہ جنگی میں فقیاب ہوئی، جبکہ سعودی عرب کی پشت پناہی میں لڑنے والے جہادی سنی گروہ بری طرح شکست کھا گئے۔ عراق میں بھی سعودی اثر و رسوخ ہوا ہو چکا ہے؛ کیونکہ 2014 میں وہاں کے سنی اکثریتی صوبے داعش کے ”خلافتی منصوبے“ میں ضم ہو گئے تھے، اور بعد ازاں ایرانی حمایت یافتہ شیعہ حکومت اور ملیشیاؤں نے ان علاقوں کو دوبارہ قبضے میں لے لیا۔

سعودیہ کی ایران کے خلاف جدوجہد اصل میں سنی-شیعہ کشمکش پر مبنی ہے، نہ کہ معیشت پر۔ دونوں ممالک تیل کی دولت سے مالا مال ہیں، اوپیک کے رکن ہیں، اور ایک ہی تیل کارٹیل سے منسلک ہیں۔ مگر ایران ایک واضح طور پر شیعہ ریاست ہے، جبکہ سعودی عرب پر سخت گیر سنی وہابی حکومت کا قبضہ ہے۔ یہی مذہبی تفریق اس ٹکراؤ کی بنیاد ہے۔

مشرق وسطیٰ میں سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ ولی عہد محمد بن سلمان اور جیروڈ کشر نے حقیقت سے ماوراء اور یک رخا فہم کو اپنا لیا ہے۔ لبنان کے وزیراعظم سے زبردستی استعفیٰ دلوانا جیسے اقدامات نہ تو ایران کو مرعوب کر سکتے ہیں، نہ ہی حزب اللہ کو خوفزدہ۔ ایران نے امریکہ سے کسی تصادم سے اجتناب کی پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ عراق میں وہ وزیراعظم حیدر العبادی کی دوبارہ کامیابی کی حمایت کر رہا ہے، جسے امریکہ بھی پسند کرتا ہے۔ ایران کو بخوبی علم ہے کہ وہ عراق اور

شام میں فتح یاب فریق بن کر ابھرا ہے، اور اسی لیے وہ اپنی کامیابی کو دبے الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ اسلامی جمہوریہ نے یہ بھی سمجھ لیا ہے کہ سعودی ولی عہد کی ایران مخالف تند و تیز تقاریر محض ان کی داخلی اقتدار کو مضبوط کرنے کی حکمت عملی کا حصہ ہیں اور وہ واقعی کسی جنگ کے خواہاں نہیں۔ درحقیقت، مشرق وسطیٰ میں کسی نئی جنگ سے کسی کو بھی حقیقی فائدہ نہیں ہوگا، لیکن جنگیں اکثر وہی شروع کرتے ہیں جو اپنی طاقت کا غلط اندازہ لگاتے ہیں۔ سعودی عرب (ولی عہد محمد بن سلمان کی قیادت میں) اور امریکہ (صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی حکومت میں) دونوں نے خطے میں ایک ”وائلڈ کارڈ“ کے طور پر کردار ادا کیا ہے، غیر متوقع، نا تجربہ کار، اور خطرناک۔

آج کا مشرق وسطیٰ ایک انتہائی دباؤ زدہ خطہ بن چکا ہے، جہاں تنازعات کے حل کے لیے محفوظ راستے نہایت محدود ہو چکے ہیں۔ قطر، ایران اور ترکی اس ماحول میں سعودی بالادستی کا توازن توڑنے کے لیے ایک مؤثر حفاظتی والو کے طور پر ابھرے ہیں۔ قطر نے اخوان المسلمون اور شیعہ ایران کے ساتھ تعلقات قائم کر کے نہ صرف عرب دنیا کے اندر بلکہ بیرونی دنیا کے ساتھ بھی مکالمے اور مصالحت کے نئے راستے ہموار کیے ہیں۔ اگر سعودی عرب قطر کو لمبے عرصے تک خلیجی تعاون کونسل (GCC) سے الگ تھلگ رکھتا ہے، تو یہ قطر کو ترکی اور ایران کے مزید قریب کر دے گا، اور نتیجتاً ریاض کے لیے ایک بڑا سیاسی خسارہ ثابت ہوگا۔ اگر سعودی عرب نے صدر ٹرمپ کی غیر یقینی اور وقتی شراکت داری کے زیر اثر اپنی روایتی خارجہ پالیسی سے انحراف جاری رکھا، تو خطے میں نہ صرف اس کی حیثیت کمزور ہوگی، بلکہ ایران مزید مستحکم ہوگا۔ چاہے کسی کو پسند ہو یا نہ ہو، مشرق وسطیٰ اب سعودی مرکزیت سے ہٹ کر ایک ایرانی، ترک، روسی اور قطری محور میں تبدیل ہو چکا ہے۔

امریکہ اس وقت تک ایران اور اس کی نیابتی قوتوں (proxies) کا مؤثر طور پر سامنا نہیں کر سکتا، جب تک وہ مشرق وسطیٰ میں ایران کے ریاستی کردار کو سمجھنے اور تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہو، جہاں کے کئی ممالک خانہ جنگیوں سے برباد ہو چکے ہیں۔ گزشتہ پانچ برسوں میں ایران کا اثر و رسوخ بے پناہ بڑھ چکا ہے۔ عراقی شیعہ ملیشیاں، جو پہلے امریکی افواج کے خلاف لڑ کر تجربہ کار

ہو چکی تھیں، 2012 میں بشار الاسد کی حکومت کی مدد کے لیے شام پہنچیں۔ 2013 میں حزب اللہ نے شام کے اسٹریٹجک قصبہ القصر کو مخالفین سے چھینا۔ دسمبر 2016 میں حلب کی فتح میں بھی شیعہ ملیشیاؤں نے فیصلہ کن کردار ادا کیا، جو بشار حکومت کی بقا کے لیے ایک اہم سنگ میل ثابت ہوئی۔ گزشتہ دو برسوں کے دوران حمص اور غوطہ جیسے علاقوں پر شدید بمباری کی گئی، جس کے نتیجے میں وہاں کے رہائشیوں کو بچاؤ کے لیے ہجرت پر مجبور ہونا پڑا، اور اکثر باغیوں کے ساتھ حبس لے۔

ایرانی نیابتی قوتیں صرف لڑنے آتی نہیں، بلکہ لڑائی کے بعد علاقائی نظام کو بھی اپنے کنٹرول میں لے لیتی ہیں۔ لبنان میں حزب اللہ کا ’ریاست در ریاست‘ ماڈل، جو کبھی استثنائے سمجھا جاتا تھا، اب ایران کی تربیت یافتہ دیگر ملیشیاؤں میں بھی رائج ہو چکا ہے۔ ایران ان گروہوں کو انتشار سے فائدہ اٹھانا اور متاثرہ علاقوں میں مقامی آبادی کو سلامتی اور بنیادی خدمات فراہم کرنا سکھاتا ہے، تاکہ انہیں مقبولیت اور جواز حاصل ہو۔

ایران کی پاسداران انقلاب کی شاخ، ’قدس فورس‘، جو مرحوم جنرل قاسم سلیمانی کی سربراہی میں کام کرتی تھی، ایرانی سرحد کے باہر تمام فوجی آپریشنز کی نگرانی کرتی تھی۔ جنرل سلیمانی کو ایران میں نہایت بااثر، چالاک اور خود مختار شخصیت سمجھا جاتا تھا، جو براہ راست رہبر اعلیٰ آیت اللہ خامنہ ای کو رپورٹ کرتے تھے۔ وہ یمن، عراق، شام اور لبنان میں ایران کی نیابتی قوتوں کو اسلحہ اور رہنمائی فراہم کرتے تھے، اور مقامی فلاحی اداروں پر قبضہ یا ان کے ساتھ الحاق کر کے ان کے ذریعے مدد رسانی کے عمل کو کنٹرول کرتے تاکہ عوامی حمایت حاصل کی جاسکے۔ ان کی حکمت عملی کے نتیجے میں مشرق وسطیٰ کی تمام بڑی عرب ریاستوں میں ایک طاقتور شیعہ محور اثر وجود میں آیا ہے، جو ایران کی علاقائی حکمت عملی کا ستون بن چکا ہے۔

2 جنوری 2020 کو، امریکہ کے ایک ڈرون حملے میں جنرل قاسم سلیمانی اور ابو مہدی المہندس (کمانڈر، الحشد الشعبی) کی ہلاکت نے مشرق وسطیٰ میں نیابتی جنگ کے حساب کتاب کو بدلنے کے آثار پیدا کر دیے۔ ایران نے اس قتل کا جواب دیتے ہوئے عراق میں عین الاسد ایئر بیس

اور اربیل میں امریکی فوجی اڈوں پر درجنوں ہیلکوپٹر میزائل داغے۔

اس دوران، عراق میں ایران مخالف جذبات میں تیزی آئی ہے۔ حالیہ مشاہدات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ عراقی متوسط طبقہ ایرانی مداخلت سے سخت نالاں ہے۔ وہ مقامی حکومت میں ایرانی اثر اندازی کو اپنی معاشی بد حالی کا اصل سبب سمجھتے ہیں۔ عراقی شہری، خاص طور پر شیعہ اکثریتی شہروں میں، ایرانی مذہبی شخصیات کے ثقافتی غلبے سے بھی اکتائے ہوئے ہیں۔ نجف جیسے مقدس شہر میں ایرانی قونصل خانے کو نذر آتش کیا جانا ایک نہایت اہم علامتی واقعہ ہے، یہ شہر شیعہ مذہبی قیادت کا مرکز ہے جہاں آیت اللہ علی السیستانی جیسے جید عالم مقیم ہیں۔ اس قونصل خانے کی تباہی اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ اب کئی عراقی شیعہ، ایران سے اپنی مذہبی وابستگی ترک کر رہے ہیں۔ یہ بے چینی زیادہ تر شیعہ علاقوں تک محدود ہے، اور سنی یا کرد علاقوں میں ایسی کیفیت نہیں دیکھی گئی۔ عراقی شیعہ اب عرب قوم پرستی کی جانب دوبارہ رجوع کر رہے ہیں، جب کہ سعودی عرب بھی اپنی وہابی۔ سلفی سخت گیر مذہبی تعبیر کو اعتدال کی طرف لانے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ تمام تبدیلیاں امریکہ کے لیے انتہائی اہم ہیں، تاکہ وہ COVID-19 کے بعد مشرق وسطیٰ کے لیے اپنی پالیسیوں کو نئے سرے سے تشکیل دے سکے۔

بیجنگ معاہدہ

امریکہ 1938 سے مشرق وسطیٰ میں ایک اہم کھلاڑی رہا ہے، جب تیل کی دریافت کے بعد امریکی کمپنیوں نے یہاں قدم جمائے۔ لیکن ولی عہد محمد بن سلمان (MBS) کے اقتدار میں آنے کے بعد، خاص طور پر صدر جو بائیڈن کے دور حکومت میں، سعودی عرب اور امریکہ کے تعلقات میں سرد مہری پیدا ہوئی۔ بائیڈن کا موقف، جسے عملی حقیقت پسندی (pragmatic realism) کہا گیا، یہ تھا کہ امریکہ کو مشرق وسطیٰ میں اپنی فوجی موجودگی بتدریج کم کرنی چاہیے۔ دوسری جانب، چین، جو دنیا کی دوسری بڑی معیشت اور ایک ابھرتی ہوئی ایشیائی طاقت ہے، نے مشرق وسطیٰ کے مختلف دارالحکومتوں میں اپنی موجودگی بڑھالی۔

محمد بن سلمان کی قیادت میں سعودی عرب نے اپنی خارجہ پالیسی کا رخ چین کی طرف موڑ لیا، جس کے نتیجے میں چینی ثالثی سے ایران اور سعودی عرب کے درمیان تعلقات کی بحالی کے لیے بیجنگ معاہدہ وجود میں آیا۔ اس معاہدے کا ایک فوری اور اہم نتیجہ یمن کی نیاہتی جنگ کا اختتام ہے، جہاں ایرانی حمایت یافتہ حوثی باغیوں نے آٹھ سال تک سعودی افواج سے جنگ لڑی۔ اقوام متحدہ کے مطابق، اس جنگ کے دوران تشدد، بھوک اور بیماریوں کی وجہ سے تقریباً 377000 افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

یہ چینی ثالثی میں طے پانے والا سعودی-ایران معاہدہ نہ صرف چین کے عالمی وقار میں اضافہ کا باعث بنا ہے بلکہ اسرائیل کے اس خواب کو بھی دھچکا پہنچایا ہے کہ وہ سعودی عرب کے ساتھ مل کر ایران مخالف اتحاد قائم کرے گا۔ دوسری طرف، چین کا ریکارڈ امریکہ کے مقابلے میں نسبتاً صاف سمجھا جاتا ہے، اور اس کے دونوں ممالک سے خوشگوار تعلقات ہیں، وہ سعودی تیل کا سب سے بڑا خریدار ہے اور ایران کا سب سے بڑا تجارتی شراکت دار۔ یہی معاشی اثر و رسوخ چین کو یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ دونوں حریف ممالک کو ایک میز پر بٹھا سکے۔

باب پنجم

یورپ اور امریکہ میں مسلم نوجوانوں کا انتہا پسندی کی جانب جھکاؤ

انیسویں صدی کے اوائل سے ہی کئی مسلم ممالک میں سماجی و سیاسی اصلاحات کی تحریکوں نے اپنی حکومتوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ طلباء کو اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپی ممالک جانے کی اجازت دیں۔ دوسری عالمی جنگ کے خاتمے اور ایشیا و افریقہ کی نوآبادیات کے ختم ہونے کے بعد مسلم طلباء مسلسل یورپ کے بڑے شہروں، خصوصاً برطانیہ، میں موجود رہے۔ 1947 میں برصغیر کی مذہبی شناخت کی بنیاد پر ہونے والی تقسیم نے لاکھوں مسلمانوں اور ہندوؤں کو ان کے آبائی علاقوں سے بے دخل کر دیا۔ ابتدائی طور پر برطانیہ میں آنے والے تارکین وطن انہی دونوں برادریوں کے بے دخل شدہ افراد تھے۔ اس وقت برطانیہ نازی جرمنی سے جنگ کے بعد کی تباہ کاریوں سے دوبارہ سنبھلنے کی کوشش میں تھا۔ ایک طرف برطانیہ کو ایک بڑی مزدور قوت کی ضرورت تھی، تو دوسری طرف ان ممالک کی غربت لوگوں کو ترک وطن پر مجبور کر رہی تھی۔ ان میں سے اکثر لوگ واجبی تعلیم یافتہ تھے اور بہت کم ایسے تھے جو انگریزی زبان سے صحیح طور پر واقف تھے۔ اسی طرح، ترکی کے باشندوں کی بڑی تعداد اُس وقت مغربی اور مشرقی جرمنی میں ہجرت کر

گئی، جب اتحادی افواج کی شدید بمباری کے نتیجے میں فرینکفرٹ جیسے بڑے شہر ملے کا ڈھیر بن چکے تھے۔ ان شہروں اور شاہراہوں کی تعمیر نو کے لیے جرمنی کو ہنرمند مزدوروں کی بڑی ضرورت تھی۔ شمالی اور وسطی افریقہ کی فرانسیسی نوآبادیات سے مزدور اور نیم ہنرمند افراد کی ایک مستحکم لہر فرانس کے بڑے شہروں کی جانب ہجرت کرتی رہی۔ ہجرت کا یہ رجحان بیلجیئم، اٹلی اور نیدرلینڈز میں بھی کم و بیش اسی نوعیت کا تھا۔

شمالی یورپ کی آزاد خیال جمہوریتوں جیسے ڈنمارک، سویڈن اور ناروے، نے معاشی مواقع کی دستیابی کے باعث بڑی تعداد میں مسلمانوں کو قانونی طور پر ہجرت کی اجازت دی۔ زبان نے یورپی ممالک میں مہاجرین کی نقل و حرکت میں ایک فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ سابق برطانوی نوآبادیات سے تعلق رکھنے والے ایشیائی اور افریقی مہاجرین، جو انگریزی زبان جانتے تھے، وہ برطانیہ کی طرف گئے، جبکہ شمالی اور وسطی افریقہ کے فرانسیسی بولنے والے مہاجرین نے فرانس اور بیلجیئم کا رخ کیا۔ سرینام اور انڈونیشیا جیسے ممالک سے ڈچ زبان بولنے والے مہاجرین ہالینڈ اور بیلجیئم میں جا بے۔ جنوبی ایشیا سے تعلق رکھنے والے اور شمالی افریقہ کے فرانسیسی بولنے والے مہاجرین نے ان نئے دیار میں عموماً اپنی اپنی برادریوں کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی، جہاں وہ اپنے نسلی اور علاقائی پس منظر کے مطابق سماجی ڈھانچے اور ثقافتی اقدار کو دوبارہ تشکیل دیتے رہے۔

مسلمانوں کی اسپین کی طرف ہجرت

مسلمانوں کی اسپین کی طرف ہجرت کا آغاز 710ء میں ہوا، جب پہلے عرب اور شمالی افریقہ کے بربر قبائل نے آبنائے جبرالٹر عبور کر کے جزیرہ نما آئبیریا کو فتح کیا۔ اس سے قبل کہ عباسی سلطنت کے مخالف اُموی شہزادہ عبدالرحمن اول 755ء میں اسپین پہنچتا، مسلمان یہاں قدم جما چکے تھے۔ عبدالرحمن، جو شام میں اُموی خاندان کا فرد تھا، اسپین میں اُموی سلطنت کا بانی بنا۔ اُس نے جنوبی اسپین، خصوصاً اندلس میں اپنی توجہ مرکوز کی اور وہاں ایک عظیم تہذیب کی بنیاد رکھی۔ اندلس میں مسلمانوں نے عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ انتہائی رواداری کا سلوک روا رکھا، جس کے نتیجے میں کئی لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ انہوں نے فنون لطیفہ، موسیقی، ثقافت، طب

اور سائنس کے فروغ میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔ قرطبہ اُن کے عہد کی سب سے بڑی اور ترقی یافتہ شہر بن کر ابھرا۔ دسویں صدی عیسوی تک قرطبہ کی آبادی پانچ لاکھ ہو چکی تھی۔ قدیم تواریخ کے مطابق، قرطبہ میں سات سو مساجد، ساٹھ ہزار محلات اور ستر کتب خانے موجود تھے۔ ان میں سے ایک کتب خانے میں پانچ لاکھ مخطوطات تھے، جن کی نگرانی کے لیے محققین، جلد ساز، اور لائبریری منتظمین کا عملہ متعین تھا۔ یورپ کی سب سے پہلی اسٹریٹ لائٹس بھی اسی شہر میں لگائی گئی تھیں، جو پانچ میل تک مدینۃ الزہراء تک جاتی تھیں، یہ خلیفہ کا شاہی محل تھا، جو ہاتھی دانت، عقیق، سنگ مرمر اور پلستر سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس تعمیر کو مکمل ہونے میں تقریباً چالیس سال لگے۔ افسوس کہ یہ محل گیارہویں صدی میں تباہ کر دیا گیا۔ تاہم، اس کی بحالی کا کام اس صدی کے ابتدائی برسوں میں شروع ہوا اور اب بھی جاری ہے۔

گیارہویں اور بارہویں صدی تک اسپین میں عیسائیوں کی دوبارہ فتوحات (Re-Conquest) کا آغاز ہو چکا تھا۔ اگرچہ عربوں نے آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالے، لیکن ان کے اندرونی اختلافات نے رفتہ رفتہ انہیں جنوبی علاقوں کی طرف پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اسی دوران، 1238ء میں محمد ابن الاحمر نے، جب ارغون کے بادشاہ فرڈیننڈ نے غرناطہ کا محاصرہ کیا، تو تحفظ کی تلاش میں المصالح کی راہ اپنائی اور غرناطہ واپس لوٹ آیا۔ اُس نے الحمرا کے محل کی تعمیر کا آغاز کیا اور اُس کی دیوار پر یہ کلمہ تحریر کیا: ”لا غالب الا اللہ“ (اللہ کے سوا کوئی غالب نہیں)۔

عیسائی بادشاہوں نے پہلے طلیطلہ، قرطبہ اور اشبیلیہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا، اور آخر میں غرناطہ تنہا رہ گیا۔ 1482ء میں، مسلمانوں کی داخلی کشمکش کھل کر سامنے آئی اور اختلافی گروہوں میں بٹنے کی وجہ سے کمزوری پیدا ہوئی، جبکہ اطراف کے متحد عیسائی سلطنتوں نے مل کر غرناطہ کو دس سال کے محاصرے کے بعد 1492ء میں فتح کر لیا۔ بادشاہ فرڈیننڈ اور ملکہ ازابیلانے غرناطہ کے الحمرا محل پر عیسائی ہسپانوی سلطنت کا پرچم لہرایا اور اسی سال کرسٹوفر کولمبس کو امریکہ روانہ کیا۔ مسلمانوں کی تہذیب و تمدن، جو اسپین کے عروج کا محور رہا تھا، اب عیسائی ہسپانیہ کی نئی شناخت کے دوران بتدریج حاشیے پر چلا گیا۔

حالیہ برسوں میں، مشرق وسطیٰ میں خانہ جنگیوں کے نتیجے میں مسلمانوں کی ایک نئی لہر اسپین پہنچی ہے؛ جس کے سبب اسپین میں مسلم آبادی 2007ء میں تقریباً دس لاکھ سے بڑھ کر 2017ء میں بیس لاکھ سے تجاوز کر گئی۔ ہسپانوی بائیں بازو (Left) اب کلیسا کو بین المذاہب مکالمے کے مقام میں بدلنے کی حمایت کر رہی ہے۔ ایک سطح پر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اسپین کے اسلامی ماضی کو اب بائیں بازو کی سیاست نے ایک رومانوی خیال کی صورت میں بدل دیا ہے۔ تاہم، اسپین کی عیسائی اکثریت کے ایک بڑے طبقے میں شدید اضطراب پایا جاتا ہے کہ اسلام پندرہ صدی قبل مسیح کے عظیم کلیسا میں دوبارہ اللہ کو لے آئیں گے، اور اسلامی غلبے کا ایک طوفان اسپین کی زوال پذیر مسیحیت کو بہالے جائے گا۔ ملک بھر میں ہزاروں گرجا گھرا ب ویران پڑے ہیں، جہاں عبادت گزار باقی نہیں رہے۔

برطانیہ میں مسلمان

ملکہ وکٹوریہ کے دور حکومت میں انگلینڈ کی پہلی مسجد ووکنگ، سرے (Woking Surrey) میں تعمیر ہوئی، جو لندن سے تقریباً 30 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ گوٹلیب ولہلم لائٹنر (Gottlieb Wilhelm Leitner) ایک مستشرق تھے، جن کی پیدائش ہنگری میں یہودی والدین کے گھر ہوئی۔ کریمیہ کی جنگ کے دوران برطانوی فوج کے لیے مترجم کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد وہ 17 برس کی عمر میں انگلینڈ آئے اور کننگز کالج میں تعلیم حاصل کی۔ اسلام اور ہندو ثقافت سے اُن کی گہری دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ صرف 21 سال کی عمر میں وہ کننگز کالج میں عربی اور اسلامی قانون کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ وہ کشمیر پر بھی گہری تحقیق رکھتے تھے اور کئی برس ہندوستان میں مقیم رہے۔ وہاں وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل بھی رہے۔ 1883ء میں انہوں نے ووکنگ میں رائل ڈرامیٹک کالج کی زمین حاصل کی اور وہاں اورینٹل انسٹیٹیوٹ (Oriental Institute) قائم کیا۔ 1889ء میں انہوں نے وہیں ایک مسجد بھی تعمیر کروائی، جس کے لیے مالی معاونت بھوپال کی بیگم نے فراہم کی۔ یہ مسجد مغل بادشاہ شاہجہاں کے نام سے منسوب کی گئی اور اسے برطانیہ کی پہلی مسجد اور مغربی یورپ میں (مورس اسپین کے بعد) پہلی

مسلم عبادت گاہ ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ وکنگ کی یہ مسجد مسلمانوں میں بہت مقبول رہی، کیونکہ وہیں عید کی نمازیں ادا کی جاتی تھیں اور وہیں ملکہ وکٹوریہ کے قریبی معتمد، سیکریٹری اور اردو کے استاد منشی عبدالکریم سے ملاقات کا موقع ملتا تھا۔ برمنگھم ڈیلی پوسٹ (Birmingham Daily Post) نے مئی 1891ء کے ایک مضمون میں لکھا کہ منشی عبدالکریم، جو کہ حافظ قرآن بھی تھے، اُس دور میں عید کی نماز کی امامت کے لیے مسجد میں مدعو کیے جاتے تھے۔

84 سال کے وقفے کے بعد برطانیہ میں دوسری مسجد 1973 میں لندن شہر کے قلب میں واقع ریجنٹ پارک میں تعمیر کی گئی۔

یہ 1940 کی بات ہے جب برطانوی حکومت کو یہ بات منوائی گئی کہ وہ مسلمان کمیونٹی کے لیے ایک مسجد کی تعمیر کے لیے لندن میں زمین فراہم کرے۔ دراصل یہ چرچل کی جنگی کابینہ تھی، جس نے 24 اکتوبر 1940 کو لندن میں مسجد کے لیے زمین فراہم کرنے کی منظوری دی تھی۔ برطانوی حکومت نے 2.3 ایکڑ پر محیط ایک مرکزی مقام بلا شرط مسلم کمیونٹی کو بطور تحفہ دیا تاکہ وہ اپنی مذہبی ضروریات کے مطابق عبادات اور دیگر امور انجام دے سکیں۔ قاہرہ، مصر کی جامعہ ازہر (Al-Azhar University) نے مرکزی لندن میں قائم اس نئی مسجد کے لیے ایک امام کو تعینات کیا، اور یہ سلسلہ کئی دہائیوں تک جاری رہا۔ اس مسجد کی ابتدائی مالی امداد سعودی عرب کے بادشاہ فیصل نے فراہم کی۔ بعد ازاں، جامعہ ازہر سے اماموں کی آمد کا سلسلہ ختم کر دیا گیا اور بتدریج صوفی سنی اماموں کی جگہ حنبلی، وہابی۔ سلفی اماموں نے لے لی۔ ریجنٹ مسجد سینٹر کی بورڈ آف ٹرسٹیز میں لندن میں تعینات مسلم ممالک کے سفر اور ہائی کمشنر شامل تھے۔ تاہم، حالیہ برسوں میں یہ مرکز سعودی عرب کی مسلم ورلڈ لیگ (Muslim World League) سے مکمل مالی و تعلیمی معاونت حاصل کرتا ہے۔

یورپ میں مہاجرین کی مجموعی تعداد میں اضافے کے ساتھ ساتھ 1970 اور 1980 کی دہائیوں میں مسلمانوں کی آبادی میں بھی کئی گنا اضافہ ہوا۔ انہوں نے اپنے اہل خانہ کو بلایا اور وہیں کی مستقل شہریت حاصل کر لی۔ سعودی عرب کے مذہبی قیادت نے اسے ایک سنہرا موقع جانا

اور یورپ میں مزید مساجد اور اسلامی مراکز کی تعمیر کا سلسلہ شروع کر دیا، اور وہابی-سلفی اسلام کے سعودی تصور کو پر جوش انداز میں آگے بڑھایا، جس کے لیے مسلم کمیونٹی کی قیادت کو فراخ دلانہ مالی امداد دی گئی۔ اندازہ ہے کہ سعودی حکومت نے اب تک 2 سے 3 ارب امریکی ڈالر مساجد، اسلامی مراکز، اور سعودی جامعات میں مبلغین کی نظریاتی تعلیم پر خرچ کیے ہیں۔ فی الوقت برطانیہ میں 2700 سنی مساجد موجود ہیں، جن میں سے 425 مساجد ایسی جنگہوں پر تعمیر کی گئی ہیں جہاں پہلے گر جا گھر تھے یا وہ برطانوی عیسائیت کے کھنڈرات پر کھڑی کی گئیں۔

برطانیہ کے تمام بڑے شہروں میں مسلمانوں کی خاصی آبادی ہے: نانچسٹر میں مسلمان کل آبادی کا 15.8 فیصد، برمنگھم میں 21.8 فیصد، بریڈفورڈ میں 24.7 فیصد ہیں۔ گزشتہ چالیس برسوں میں، انگریزی بولنے والے عرب مبلغین نے سعودی فنڈنگ کے ذریعے منظم انداز میں وہابیت کے فضائل اور سلفی اسلام کے انداز کو فروغ دیا ہے۔ جمعے کے خطبے اور مطالعہ مراکز کے ذریعے دی جانے والی تعلیمات نے ان کی مذہبی تشکیل نو کی ہے۔ ان پروپیگنڈا مراکز سے وہابی-سلفی نظریات رکھنے والے افراد تیار ہو رہے ہیں جو بعد میں برطانیہ کی جامعات اور کالجوں میں اثر و رسوخ حاصل کرتے ہیں۔

برطانیہ کی مشہور یونیورسٹی یونین ہال ہر جمعے کو ایک مسجد میں تبدیل ہو جاتی ہے، اور مؤذن کی اذان ان بلند و بالا کٹورین طرز کے گنبدوں میں گونجتی ہے۔ خطبہ عام طور پر وہ نوجوان طلبہ دیتے ہیں جو سعودی یونیورسٹیوں کے سمر اسکولوں میں شرکت کر چکے ہوتے ہیں، اور جو مغرب کی مسلم ممالک کے خلاف مبینہ زیادتیوں پر گفتگو کرتے ہیں۔ یہ خطبات نہایت جوش و خروش سے نوجوانوں کو جہاد کے لیے رضا کار بننے پر آمادہ کرتے ہیں۔ چیچنیا، کشمیر اور افغانستان میں جہاد کے لیے پُر جوش تقاریر کی جاتی ہیں۔ مدینہ کی اسلامک یونیورسٹی غیر ملکی طلبہ کے لیے تقریباً 85 فی صد نشستیں مخصوص رکھتی ہے اور یورپ و شمالی امریکہ سے آنے والے طلبہ کے لیے سمر اسکول بھی منعقد کرتی ہے۔

انہی نوجوان مسلمانوں میں سے، جو برطانیہ کے مایہ ناز اسکولوں اور جامعات سے تعلیم یافتہ ہوتے ہیں، بعد میں خود کش حملہ آور اور داعش کے رضا کار بن کر مشرق وسطیٰ میں تباہی مچاتے

ہیں۔ یہی وہ وہابی سلفی اسلام ہے جسے آج دنیا کے بیشتر حصوں میں ”سچا اسلام“ بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ القاعدہ، داعش، بوکو حرام، الشبَاب، افغان طالبان، تحریک طالبان پاکستان، اور دیگر تمام شدت پسند گروہ اسی متشد اور عدم برداشت پر مبنی تعبیر دین کو ماننے ہیں۔ مساجد کے ساتھ ساتھ برطانیہ میں لگ بھگ 100 شرعی عدالتیں بھی کام کر رہی ہیں۔ یہ عدالتیں خاصی پوشیدہ رہتی ہیں اور خاندانی اور مالی تنازعات کو اسلامی شریعت کے مطابق حل کرتی ہیں۔ ان کے فیصلوں کو اگر ملکی عدالتوں سے منظوری حاصل ہو جائے تو انہیں مکمل قانونی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ عموماً ان عدالتوں کے فیصلے عورتوں کے ساتھ غیر منصفانہ ہوتے ہیں اور ان پر دباؤ بھی ڈالا جاتا ہے۔ یہ عدالتیں زیادہ تر لندن، مانچسٹر، بریڈ فورڈ، برمنگھم اور نیوٹن جیسے شہروں میں کام کرتی ہیں، اور انہیں مسلم آر بیٹریشن ٹریبونل (MAT) چلاتا ہے، جس کے فیصلے 1996ء کے ثالثی ایکٹ کے تحت ریاستی عدالتوں میں نافذ کیے جاسکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ برطانیہ کے مسلمانوں کی دوسری اور تیسری نسل میں انتہا پسندی مکمل طور پر سرایت کر چکی ہے، اور اس خطرناک رجحان کی اصل جڑ، جسے سب جانتے ہیں مگر نظر انداز کرتے ہیں، وہابیت اور سلفیت ہے، جنہیں سعودی مبلغین نے نہایت چالاکی سے قابل فخر اور قابل تقلید بنا کر پیش کیا۔ ان نوجوانوں کی پرورش اسلام کے ایک مسخ شدہ تصور کے ساتھ ہوئی، جس نے نہ صرف دیگر مذاہب کے بارے میں ان کے دلوں میں نفرت بٹھائی بلکہ اپنے ہی دین کی دیگر تعبیرات کو ناقابل قبول بنا دیا۔

داعش کے مشہور جلاّد، جسے دنیا ’جہادی جان‘ کے نام سے جانتی ہے، کی شناخت محمد اموازی کے طور پر ہوئی، جو کویت میں پیدا ہوا مگر لندن میں پلا بڑھا۔ اموازی ان ہزاروں برطانوی شہریوں میں سے ایک تھا جو شام اور عراق گئے تاکہ داعش میں شمولیت اختیار کریں اور تربیت حاصل کر کے جنگ میں حصہ لیں۔ 27 سالہ اموازی مغربی لندن کے ایک خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور اس نے یونیورسٹی آف ویسٹ منسٹر سے کمپیوٹر پروگرامنگ میں ڈگری حاصل کی تھی۔ دنیا کو اس کے بارے میں 2014ء میں علم ہوا جب اس نے امریکی فوٹو جرنلسٹ جیمز فوئی کے قتل کی

ویڈیو میں برطانوی لب و لہجے میں بات کرتے ہوئے کیمرے کا سامنا کیا۔ اس کے بعد اس نے دیگر مغربی یرغمالیوں کے قتل کی ویڈیوز بھی بنائیں اور امریکہ کو دھمکیاں دیں۔ مسئلہ یہ نہیں کہ کتنے افراد شام یا عراق گئے اور واپس لوٹے، بلکہ اصل تشویش اس نظریاتی تسلط کی ہے جو برطانوی مسلم نوجوانوں کو اپنی گرفت میں لے چکا ہے۔

برطانیہ کے مسلمان عالمی مسلم آبادی کی مختلف تہوں کا ایک گہرا عکس ہیں، جن کی موجودہ آبادی 16 سے 18 لاکھ کے درمیان ہے، جن میں سے تقریباً دو تہائی کا تعلق جنوبی ایشیائی پس منظر سے ہے۔ ان میں سے 50 فیصد سے زائد برطانیہ میں پیدا ہوئے اور تقریباً اتنے ہی تیس برس سے کم عمر ہیں۔ سلفی تعلیمات تقریباً تمام سنی مساجد میں عام ہیں، اگرچہ کچھ ہی مساجد خود کو کھل کر سلفی کہتی ہیں۔ برطانیہ میں سلفی نظریات کی حامل اہم مساجد میں بزمگاہ کی گرین لین مسجد اور سلفی انسٹیٹیوٹ، لندن کی بریکسٹن میں واقع مسجد ابن تیمیہ، اور لوٹن کا اسلامک سنٹر شامل ہیں۔

برطانیہ میں سلفی نظریات کے فروغ کی سب سے بڑی تنظیم ”جمعیۃ احیاء منہاج السنہ“ (JIMAS’ Minhaaj al-Sunnah’ Jamiyyah Ithyaa) ہے، جسے انگریزی میں Society for the Revival of the Prophetic Way بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے بانی اور سرکردہ رہنما منور علی عرف ابو منتصر کو برطانیہ میں سلفی دعوت کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ وہ ملک بھر کی مساجد، کمیونٹی مراکز اور یونیورسٹیوں میں اسلامی مطالعاتی حلقوں کے ذریعے نوجوانوں میں سلفی نظریات کے فروغ کے بڑے ذمہ دار تصور کیے جاتے ہیں۔ ابو منتصر نے اپنے نوجوانی کے دور میں وہی کشمکش جھیلی جو اکثر دوسری نسل کے برطانوی مسلمان نوجوانوں کو درپیش ہوتی ہے، یعنی ایک طرف گھر کا مذہبی ماحول اور دوسری طرف ایک آزاد خیال اور غیر مسلم برطانوی معاشرے کا دباؤ۔ آخر کار اس نے اپنے لیے ایک مذہبی شناخت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا اور اسلام کو انگریزی زبان میں دستیاب کتابوں کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کی۔ تاہم، اس نے جلد ہی محسوس کیا کہ وہ اسلام جو مغرب میں ”لبرل اسلام“ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، اور وہ اسلام جو سعودی وہابی نظریات کی بنیاد پر مساجد میں پڑھایا جا رہا ہے، دونوں میں ایک گہرا تضاد موجود

ہے۔ یہی تضاد سمجھنے اور گہرائی سے سیکھنے کے لیے وہ سعودی عرب گیا، جہاں اس نے جامعہ اسلامیہ مدینہ میں تعلیم حاصل کی، جو سلفی نظریات کا ایک اہم عالمی مرکز مانا جاتا ہے۔

سلفیت کو ایک مذہبی فکر یا نظریے کے طور پر وقت کے ساتھ ساتھ ایک خاص تناظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے، جس میں اس کے عقائد اور تاریخی ارتقا کو مد نظر رکھنا لازم ہے۔ یہ اسلام کے جنبی سنی مکتبہ فکر کے اندر ایک مذہبی دھارا ہے، جو قرآن، سنت اور سلف صالحین یعنی ابتدائی مسلم نسلیوں کی خالص اور غیر مخلوط تعلیمات پر زور دیتا ہے۔ برطانیہ میں یہ مذہبی نظریہ 1990 کی دہائی کے وسط تک ایک مؤثر نیٹ ورک کے ذریعے مضبوطی سے قائم ہو چکا تھا، جس میں مساجد، مطبوعات، میڈیا اور انٹرنیٹ پر وسیع لٹریچر شامل تھا۔ اس سلفی رجحان نے حنا ص طور پر جنوبی ایشیائی نژاد مسلمانوں کی دوسری نسل کے نوجوانوں کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ ان کے ساتھ بڑی تعداد میں سیاہ فام اور سفید فام نو مسلم بھی شامل ہوئے۔ اس تحریک سے وابستہ افراد کی اوسط عمر 18 سے 30 سال کے درمیان تھی، اور یہ زیادہ تر سلفی مساجد کے قریب رہنے والے علاقوں میں پائے جاتے تھے۔

ابومنصر کی قیادت میں، سلفیت ایک مذہبی فرقہ یا کلٹ (Cult) کی شکل اختیار کر گئی، جس نے ’خالص‘ اسلامی روایات کی تجدید اور مذہب کو ایک احتجاجی صورت میں پیش کرنے کی راہ اپنائی۔ جمعیتہ احیاء منہاج السنہ (JIMAS) کے اراکین کی پہچان بن گئی کہ وہ فوجی جیکٹس، پتلونیں اور بوٹ پہنتے تھے۔ انہوں نے اپنے ناموں سے پہلے ابو (یعنی فلاں کا باپ) اور ام (یعنی فلاں کی ماں) کا سابقہ لگانا شروع کیا۔ سلفی مسلمانوں کا رویہ انتہائی انفرادی، سخت گیر اور عدم برداشت پر مبنی تھا، جو یہ تاثر دیتا تھا کہ صرف وہی ”نجات یافتہ فرقہ“ سے تعلق رکھتے ہیں۔ دیگر اسلامی مکاتب فکر پر ان کے سخت اور لچک سے عاری تنقیدی بیانات نے نہ صرف دوسرے مسلمانوں سے الگ کر دیا بلکہ فرقہ وارانہ کشیدگی کو بھی جنم دیا۔ اس سخت گیر رویے نے دوستوں، خاندانوں اور اسلامی تنظیموں کے درمیان اختلافات اور تناؤ پیدا کیا۔ جماس کے اندر بھی نسلی گروہ بندیوں اور فکری دھڑوں نے اختلافات کو جنم دیا، جس کے نتیجے میں تنظیم تقسیم ہو گئی، اور آج تک یہی تقسیم اس کی شناخت بنی ہوئی ہے۔

جمعیتہ احیاء منہاج السنہ (JIMAS) کے اراکین تین نمایاں گروہوں میں تقسیم ہو گئے:

’پیوریسٹ‘ (Purists)، ’پولیٹیکوز‘ (Politicos)، اور ’جہادی‘ (Jihadists)۔ پیوریسٹ وہ تھے جو سلفی اصولوں اور سعودی ریاست کے وفادار رہے، اور حکمرانوں کے خلاف کسی قسم کی بغاوت یا تنقید کے مخالف تھے۔ یہ طبقہ وہابی نظریات سے قریب تر تھا اور دوسرے فرقوں کے عقائد و رسومات میں ’اصلاح‘ کی پر امن تبلیغ کو ہی حل سمجھتا تھا۔ پولیٹیکوز اگرچہ بیشتر عسکری سلفی پیوریسٹوں سے اتفاق رکھتے تھے، مگر وہ چاہتے تھے کہ سلفی قیادت وقت کے بدلتے ہوئے سماجی و سیاسی حالات کو بھی مدنظر رکھے۔ ان کے نزدیک اجتماعی شعور اور سیاسی حکمت عملی بھی اصلاح امت کے لیے ضروری ہے۔ اس کے برعکس، جہادی گروہ حالات حاضرہ سے بے زار اور بے صبر تھے۔ ان میں سے اکثر نے افغانستان اور چینچیا کی جنگوں میں شرکت کی تھی، اور وہ براہ راست کاروائیوں کے ذریعے تبدیلی کے خواہاں تھے۔ ان تینوں گروہوں میں عقائد اور تھیولوجی کے حوالے سے اتفاق پایا جاتا ہے، لیکن مسلم دنیا کے مسائل کے حل کے لیے اپروچ اور عملی حکمت عملی میں شدید اختلاف موجود ہے۔ برطانیہ میں 2017 کے دوران پانچ مختلف مقامات پر دہشت گردانہ حملے ہوئے، جن سے یہ بات واضح ہوئی کہ سلفی جہادی نظریہ نو جوانوں میں غالب ہوتا جا رہا ہے۔

اس کے مقابلے میں، معروف جدید صوفی اسکالر جیسے کہ شیخ محمد ہشام قبانی نے سلفی تنقید کا علمی اور عقلی دفاع کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے سلفیوں کے اعتراضات کا جواب انہی بنیادی متون (قرآن و حدیث) کے ذریعے دیا، اور صوفی عقائد و اعمال کو عقلی بنیادوں پر ثابت کیا۔ ان کی سات جلدوں پر مشتمل ”انسائیکلو پیڈیا آف اسلامک ڈاکٹرین“، کو سلفیوں کے خلاف ایک علمی رد کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

برطانوی مسلمانوں خصوصاً نو جوانوں میں سلفیت کی مقبولیت کے پانچ بنیادی اسباب ہیں۔ اول، سعودی عرب کی ریاستی سرپرستی میں سلفی بیانیے کی عالمی سطح پر اشاعت، جو نہ صرف مساجد کے ذریعے بلکہ آن لائن و آف لائن وسیع لٹریچر اور سعودی یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل مبلغین کے ذریعے پھیلائی گئی۔ دوم برطانیہ میں پیدا ہونے والے مسلمانوں کی دینی شناخت کی تلاش

اور ان کا یہ جذبہ کہ وہ اپنی مذہبی خود اعتمادی کو بحال کریں۔ سوم سلفیت کی کشش، جو بیرونی اثرات کے ساتھ ساتھ دوسرے اسلامی فرقوں سے مقابلے اور خود سلفی حلقوں کے اندرونی اختلافات کی وجہ سے بھی پیدا ہوئی۔ چہارم روایتی اسلامی نقطہ نظر کا علمی و فکری ردِ عمل، جس نے سلفی نوجوانوں کو زیادہ غور و فکر پر آمادہ کیا اور انہیں دوسروں کے لیے نرم رویہ اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ پنجم نائن لیون اور دیگر دہشت گردانہ حملوں کے بعد سلفیوں کی طرف سے اپنے انداز و اطوار کو مزید معتدل بنانے کی کوششیں۔

سلفیت کے ارتقائی عمل اور برطانوی نوجوانوں میں اس کی کشش کے باوجود، روایتی اسلام کی جانب بھی ایک واضح رجحان دیکھا جا رہا ہے، جس کی نمائندگی پرکشش امریکی عالم دین حمزہ یوسف کرتے ہیں۔ وہ اپنی اسلام فہمی، موسیقی، ادب اور سائنس کی اہمیت پر گہری گرفت کے ذریعے مضبوط دلائل پیش کرتے ہیں۔ معتدل سلفی ان کی منطق کو نجی مجالس میں سراہتے ہیں، لیکن عوامی سطح پر انہیں محض ایک صوفی قرار دے کر رد کر دیتے ہیں۔ حمزہ یوسف کے پیغام کی بازگشت دیگر ممتاز انگریزی علما مثلاً عبدالحکیم مراد، جو کیمبرج یونیورسٹی میں اسلامک اسٹڈیز کے پروفیسر ہیں، اور امریکی نژاد اسلامی عالم شیخ نوح کیلر، جو اردن میں مقیم ہیں، کی آوازوں میں بھی سنائی دیتی ہے۔ برطانیہ کے کئی نمایاں علما خود کو 'ہائبرڈ' یعنی وہابی-صوفی کہتے ہیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو برطانوی مسلم برادریوں پر سلفیت کے اثرات گہرے اور ہمہ گیر رہے ہیں، جس کی بڑی وجوہات میں اس کے لٹریچر کی آسان دستیابی اور ملک بھر کی مساجد میں اس کے مبلغین کی موجودگی شامل ہیں۔

فرانس اور اسلام

نپولین بونا پارٹ نے 1798 سے 1801 تک مصر پر قبضہ کیا۔ اگرچہ یہ قبضہ قلیل المدت تھا، لیکن اس نے مصر کے تاریخی آثار کا منظم اندراج کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ فرانسیسی فوج نے 1830 سے 1857 کے دوران الجزائر کو نوآبادی بنایا؛ یہ فرانس کی پہلی افریقی نوآبادی تھی اور جغرافیائی لحاظ سے فرانس کے سب سے قریب بھی تھی۔ 1881 میں تیونس کو فرانسیسی محافظت

(protectorate) میں شامل کر لیا گیا، جبکہ فرانسیسی مغربی افریقہ کو 1880 سے 1912 کے درمیان نوآبادی بنایا گیا۔ 1912 ہی میں مراکش کو بھی محافظت میں شامل کیا گیا۔ پہلی جنگِ عظیم میں فرانس، روس اور برطانیہ کا اتحادی تھا، جو سلطنتِ عثمانیہ اور جرمنی کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ 1920 میں لیگ آف نیشنز نے فرانس کو شام اور لبنان کا مینڈیٹ سونپا۔ تاہم، لبنان نے 1941 میں اور شام نے 1946 میں آزادی حاصل کی۔ تیونس اور مراکش 1956 میں آزاد ہوئے، جبکہ مالی اور سینیگال نے 1960 میں، اور الجزائر نے 1962 میں آزادی حاصل کی۔ انیسویں صدی کے اوائل میں انپو لین کے چند مسلم سپاہی فرانس کے رون وادی (Rhône Valley) میں آ بسے؛ صدی کے اختتام تک پیرس میں تقریباً 800 مسلمان مقیم تھے، جن میں سے بیشتر طلباء تھے۔ الجزائر کے مزدوروں کی آمد کا آغاز 1900 میں ہوا، جس کے کچھ ہی سال بعد مراکش کے لوگ بھی آنے لگے۔

1914 میں، پہلی جنگِ عظیم سے عین قبل، فرانس میں شمالی افریقہ سے آئے ہوئے مسلمانوں کی تعداد تقریباً 30000 تھی۔ جنگ کے دوران ان کی تعداد میں زبردست اضافہ ہوا: 132000 افراد، جن میں اکثریت الجزائر یوں کی تھی، فرانس کے کھیتوں اور کارخانوں میں کام کرنے کے لیے بھرتی کیے گئے، جبکہ مزید 175000 افراد کو فوج میں بھرتی کیا گیا۔ جنگ میں تقریباً 25000 مسلمان سپاہی مارے گئے۔ جنگ کے بعد اکثریت نے وطن واپسی اختیار کی، اور یوں 1919 میں فرانس میں صرف 100000 مسلمان باقی رہ گئے۔ 1930 کی معاشی کساد بازاری کے دوران بھی کئی لوگ وطن واپس چلے گئے۔ تاہم، دوسری جنگِ عظیم کے بعد فرانس نے تعمیر نو اور صنعتی ترقی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ہنرمند اور غیر ہنرمند افرادی قوت کی امیگریشن کو فروغ دیا۔ 1962 سے قبل ان میں اکثریت الجزائری کارکنوں کی تھی، لیکن الجزائر کی آزادی کے بعد فرانسیسی حکومت نے اپنی دیگر سابقہ نوآبادیوں سے بھی امیگریشن کی حوصلہ افزائی شروع کر دی۔

فرانس میں مذہب کی بنیاد پر مردم شماری نہیں ہوتی، لیکن اندازہ ہے کہ وہ افراد جو بیرونِ ملک پیدا ہوئے ہیں، ان کی تعداد تقریباً 17 لاکھ ہے۔ مسلمان عموماً صنعتی شہروں کے آس پاس آباد

ہیں، جن میں سب سے زیادہ تعداد پیرس اور اس کے نواحی علاقوں میں پائی جاتی ہے۔ برطانیہ کے برعکس، جہاں مسلمانوں نے اندرونِ شہر خود کو مخصوص محلوں (گھٹیوز) تک محدود رکھا، فرانس میں وہ چھوٹے شہروں کے مضافات میں جا بسے۔ دونوں جنگوں کے درمیانی عرصے میں، فرانسیسی مسلمان مذہبی معاملات میں نسبتاً غیر محتاط اور روادار تھے۔ عام طور پر ان کے آجروں کی جانب سے جمعے کی نماز کے لیے عارضی لکڑی کے ڈھانچے فراہم کیے جاتے تھے۔ پیرس کی مشہور مسجد کی تعمیر 1922 میں شروع ہوئی اور 1926 میں مکمل ہوئی۔ یہ مسجد بظاہر ان مسلمانوں کی خدمات کے اعتراف میں بنائی گئی تھی، جنہوں نے فرانس کا دفاع کرتے ہوئے جانیں قربان کیں۔

ایک وقت تھاجب فرانس ایک عظیم مسلم نوآبادیاتی طاقت تھا، اور اس کی حکمران اشرافیہ مغربی و شمالی افریقہ میں اپنی حکمرانی کے اظہار کے طور پر پیرس میں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کرنا چاہتی تھی۔ اگرچہ فرانس میں ریاست اور مذہب کو الگ رکھا جاتا ہے، تاہم ریاست نے اس مسجد کی تعمیراتی لاگت میں خاطر خواہ مالی تعاون کیا۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے یہ رقم الجزائر میں قائم ایک خیراتی ادارے کے ذریعے فراہم کی گئی۔ اس انتظام کے تحت طے پایا کہ فنڈز ایک ”اسلامی ادارے“ پر خرچ کیے جائیں گے، جس میں ترک حمام، خریداری کی جگہ، لائبریری اور ایک مسجد شامل ہوگی۔ اس مسجد کا افتتاح سلطان مراکش نے کیا، اور اس میں استعمال ہونے والا ایرانی قالین ایران کے بادشاہ محمد رضا پہلوی کی طرف سے بطور تحفہ دیا گیا۔

فرانس میں مسلمانوں کی موجودہ آبادی تقریباً 5760000 ہے، جو ملک کی کل آبادی کا 8.8 فیصد بنتی ہے۔ اس وقت فرانس میں تقریباً 2200 مساجد ہیں اور فرانسیسی مسلم کونسل کی قیادت اگلے پانچ برسوں میں ان کی تعداد دوگنی کرنے کی خواہاں ہے۔ سعودی عرب کی مسلم ورلڈ لیگ نے 1980 اور 1990 کی دہائی میں مساجد کی تعمیر اور اماموں کی تنخواہوں کے لیے کروڑوں یورو فراہم کیے۔ 1979 کے بعد فرانس کے کچھ غریب ترین محلوں میں تبلیغی جماعت، سلفی تحریکوں اور اخوان المسلمون جیسی بین الاقوامی اسلامی تحریکوں نے بھرپور سرگرمی دکھائی۔ تاہم 1990-2000 کی دہائی میں ریاست نے فرانس میں اسلام پر کنٹرول کی کوشش کی اور ایک

نمائندہ کونسل کے ذریعے اسے منظم کرنے کی کوشش کی۔

فرانسیسی سنی اسلام میں کیتھولک چرچ کی طرح کوئی مذہبی درجہ بندی یا روحانیت کی باقاعدہ تنظیم نہیں، جو ریاست سے بات چیت کے لیے بطور نمائندہ کردار ادا کر سکے۔ وزارت داخلہ کے لیے یہ خاصا مشکل رہا کہ وہ فرانس میں اسلام کو ایک باقاعدہ نظم دے، خاص طور پر جب پیرس کی جامع مسجد سمیت متعدد انتظامی اختیارات الجزائر کے سپرد کیے جا چکے تھے۔ 2000 کی دہائی میں فرانس نے اخوان المسلمون کے بڑھتے ہوئے اثر کو قابو میں لانے کی کوشش کی، جو Union of Islamic Organisations of France کے ذریعے آزادانہ کام کر رہی تھی۔

فرانس کے مسلم معاشرے کی گزشتہ ساٹھ برسوں میں جو تبدیلی دیکھنے کو ملی ہے، وہ نہایت حیران کن ہے۔ اب ان کی شناخت صرف اسلام پر مبنی ہے اور وہ فرانسیسی سماج کی تمام اقدار کو اسلام دشمن تصور کرتے ہیں۔ سلفیت اب زیادہ تر مساجد میں غالب بیانیہ بن چکی ہے، بالخصوص ان مضافاتی علاقوں میں جہاں مسلم برادریاں بستی ہیں۔ زیادہ تر نوجوان، جو روایتی خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں، اسی بیانیے سے متاثر ہو رہے ہیں۔ سلفیت کے ”طہارت پسند“ (purists) اور ”جہادی“ دھڑے عموماً بڑے شہروں کی اندرونی مساجد یا مضافاتی علاقوں میں محدود پائے جاتے ہیں۔ الگ تھلگ رہنے، اور مرکزی فرانسیسی سماج سے سماجی و ثقافتی طور پر تقریباً مکمل علیحدگی کی وجہ سے، دوسری اور تیسری نسل کے فرانسیسی مسلمانوں کو اب یہ پختہ یقین ہو چلا ہے کہ وہ قومی مرکزی دھارے سے کٹ چکے ہیں۔

فرانس میں اسلام کو سمجھنے اور اس کا تجزیہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے ایک ”مارکیٹ“ (منڈی) کے طور پر دیکھا جائے۔ کلاسیکی معاشی نظریے کے مطابق، کسی بھی منڈی میں طلب اور رسد میں توازن پیدا ہوتا ہے۔ یہی اصول مذہب پر بھی لاگو ہوتا ہے جب اسے ایک ”مصنوع“ (product) کے طور پر تصور کیا جائے۔ ”حقیقی اسلام“ کی تلاش کرنے والے مسلمانوں کی یہ جستجو ایک مارکیٹ تشکیل دیتی ہے۔ جو ادارے یا جماعتیں اس ”مصنوع“ کو فراہم کرنے کا دعویٰ کرتی ہیں، وہ اپنی مارکیٹ شیئر کو بڑھانے اور ”منافع“ حاصل کرنے کی کوشش میں ہوتی

ہیں۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ صرف وہی ”سچا اسلام“ فراہم کر سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ سب سے حکمت عملیاں بناتے ہیں، ابلاغ کی صلاحیتوں کو بڑھاتے ہیں، اشتہاری مہمات چلاتے ہیں، اور دعویٰ کرتے ہیں کہ وہی اپنے صارفین کی اصل ضرورت پوری کر سکتے ہیں۔

فرانسیسی اسلامی منڈی میں مسابقت کی شدت اس لیے بھی ہے کہ یہاں مسلم تنظیموں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس منڈی کی بے ثباتی براہ راست عالمی اسلامی منڈی کی بے ثباتی سے جڑی ہوئی ہے۔ اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو ”اسلامی تشکیل نو“ (re-Islamization) ایک تعاملاتی (interactive) عمل ہے، جس میں ہر مرحلہ اس وقت ہی کامیاب ہو سکتا ہے جب طلب و رسد میں توازن قائم ہو۔

سلفیت کے، فرانسیسی نوجوان مسلمانوں اور نو مسلموں کے درمیان، ”اسلامی تشکیل نو“ کی غالب صورت بن جانے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اسے براہ راست سعودی عرب کے ”مقدس سرزمین“ سے درآمد کیا گیا ہے، جہاں بظاہر اسلام اپنی ”خالص“ شکل میں رائج ہے اگرچہ حقیقت میں یہ محض ایک فریب ہے۔

سعودی عرب کی مسلم ورلڈ لیگ نے بہت سے فرانسیسی بولنے والے مراکشی اماموں کو سعودی اسلامی جامعات میں وہابی اور سلفی نظریات کے مطابق تربیت دی۔ ان اماموں نے اپنی ذمہ داریاں غیر معمولی طور پر انجام دیں۔ انہوں نے فرانس کے مسلم نوجوانوں کی دوسری اور تیسری نسل کو بھی انتہا پسندی کی طرف مائل کر دیا۔ پیرس میں بم دھماکے، برسلسز ایئر پورٹ پر حملے، اور دیگر شہروں میں سیاہوں و زائرین پر حملے اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ نوجوان کس حد تک شدت پسند ہو چکے ہیں۔

فرانس میں سلفی نظریے کی گہری سرایت کا اندازہ ایک واقعے سے لگایا جاسکتا ہے: ایمیلی کونگ، جس کا تعلق فرانس کے ایک چھوٹے سے قصبہ بریٹی سے تھا اور جو ایک پولیس افسر کی بیٹی تھی، نو عمری میں اسلام قبول کرتی ہے۔ جیسے ہی اُس نے سلفی لباس اپنایا، سر سے پیر تک سیاہ عبا یا اور نقاب میں خود کو ڈھکا اُسے عوامی طور پر طعن و تشنیع کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر کار وہ شام چلی گئی

جہاں اس نے داعش میں بطور مبلغ اور بھرتی کارشمولیت اختیار کی۔ رقبہ کے سقوط کے بعد اس نے ہتھیار ڈال دیے، اور فی الحال وہ امریکہ و شامی کرد فورسز کے زیر انتظام جیل میں قید ہے۔

2012ء میں ایک فرانسیسی صحافی نے ایک دستاویزی فلم بنائی جس کا عنوان تھتا: Emilie Konig vs Ummu Tawwab۔ یہ فلم اُس وقت کی ہے جب وہ شام روانہ نہیں ہوئی تھی۔ اس میں وہ مکمل نقاب میں نظر آتی ہے، صرف آنکھوں کی باریک سی جھری باقی ہے۔ اُس انٹرویو میں وہ سلفیت اور وہابیت کے فضائل بیان کرتی ہے اور اپنے فکری سفر کا احوال سناتی ہے۔ شام میں، اُس نے داعش کے شعبہ بھرتی میں کام کیا اور سوشل میڈیا پر کئی تبلیغی ویڈیوز جاری کیں۔ ایک ویڈیو میں وہ اسلحے کی مشق کرتے ہوئے دیکھی گئی، اور بھرپور انداز میں اسلامی خلافت کے لیے نوجوانوں کو داعش میں شامل ہونے کی دعوت دے رہی تھی۔

فرانسیسی محکمہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے مطابق، اس وقت بھی تقریباً 690 فرانسیسی جہادی شام میں موجود ہیں، جن میں سے 43 فیصد خواتین ہیں۔ رقبہ کے سقوط کے بعد ان میں سے کئی کو گرفتار کیا گیا، اور اب انہیں ان کے اپنے ممالک جیسے فرانس، برطانیہ، روس، قازقستان اور انڈونیشیا واپس بھیجنے کی تیاریاں جاری ہیں۔

فرانسیسی صدر میکرون کی جانب سے پیش کردہ اصلاحات کو شفاف اور حقیقت پسندانہ انداز میں نافذ کرنا ہوگا، اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان میں فرانسیسی مسلم کمیونٹی کو پوری طرح شامل نہ کیا جائے۔ فرانسیسی بولنے والے مراکش نے اس ضمن میں ایک مثبت پیش رفت کی ہے اس نے وہابی۔ سلفی اسلام کو ختم کر کے حنفی صوفی سنی روایات کو بحال کرنا شروع کیا ہے، جو رواداری اور دوسرے مذاہب کے احترام کا درس دیتی ہیں۔ نوآبادیاتی دور میں مراکشی و اسلامی ثقافتیں فرانسیسی ثقافت کے ساتھ ساتھ چلتی تھیں، اور خود فرانسیسی حکام ان ثقافتی پہلوؤں کی سرپرستی کرتے تھے، جیسے صوفیانہ موسیقی (ٹرانس میوزک) اور اولیاء کرام کی عرس تقریبات۔

خوش آئند بات یہ ہے کہ 2004ء سے مراکش نے وزارتِ اوقاف و امور اسلامی کے ذریعے ایک تربیتی حکمت عملی اپنائی ہے تاکہ فرانس کی مساجد میں اپنے معتدل اسلامی نظریات کو فروغ

دے سکے۔ مراکش نے فرانسیسی وزارت داخلہ سے یہ وعدہ بھی کیا ہے کہ وہ ان کے لیے تربیتی کورسز فراہم کرے گا۔ مراکشی حکومت کی یہ کوششیں اگر بڑے پیمانے پر جاری رہیں تو فرانس کے مسلمانوں میں رائج سلفی و وہابی بیانیے کا مؤثر توڑ کیا جاسکتا ہے اور اسلام کی روادار روایت کو بحال کیا جاسکتا ہے۔

امریکہ اور کینیڈا میں اسلام

جب 1501 میں مغربی افریقہ سے غلاموں کو ”نئی دنیا“ میں لایا گیا، تو اسلام مغربی افریقہ میں پہلے ہی سے مضبوطی سے قائم ہو چکا تھا۔ اگلے 350 برسوں تک، مسلمان مرد، خواتین اور بچے غلام بنا کر امریکہ بھیجے جاتے رہے اور یوں انہوں نے کولمبس کے بعد کے امریکہ میں توحید پر مبنی ایک نئے مذہب کا تعارف کرایا۔ تاہم، امریکہ میں غلاموں کے درمیان اسلام پوری طرح زندہ نہ رہ سکا، سوائے چند ابتدائی اور محدود شکلوں کے، جن کا تعلق افریقی اسلامی اصل سے جڑا ہوا تھا۔ جب غلامی کا باضابطہ خاتمہ ہوا، تو افریقی امریکیوں کو صرف عیسائیت پر عمل کرنے کی اجازت دی گئی، اور طویل عرصے تک یہی ان کے لیے واحد مذہبی اختیار بنا رہا۔

اسلام امریکہ میں ایک مؤثر اور پائیدار مذہبی متبادل کے طور پر اس وقت آیا جب اسے افریقی نژاد امریکی برادریوں نے قبول کیا، خاص طور پر مذہبی تحریک ”نیشن آف اسلام (NOI)“ کے ذریعے، جس نے افریقی نژاد امریکی اسلام کو ایک کثیر جہتی شناخت فراہم کی۔ تاہم ایک بڑا تغیر اس وقت آیا جب بیسویں صدی کے آغاز میں امریکہ آنے والے تارکین وطن کی برادریوں نے اسلام کو فروغ دیا، جن میں احمدیہ تحریک کا کردار اہم رہا، جو خاص طور پر امریکہ کے شمال مشرقی شہروں میں افریقی امریکیوں کو مخاطب کرتی تھی۔ اگرچہ زیادہ تر افریقی نژاد امریکی احمدی نہیں بنے، لیکن احمدیہ تحریک کے توسط سے انہیں اسلام سے ابتدائی تعارف حاصل ہوا، جسے انہوں نے ایک موقع کے طور پر استعمال کیا تاکہ وہ روایتی سنی اسلام کا مطالعہ کریں اور اس پر عمل پیرا ہوں۔ نتیجتاً، 1950 اور 1970 کی دہائیوں میں انہوں نے اپنی آزاد اسلامی برادریاں قائم کیں۔

1960 کی دہائی میں امریکہ کے امیگریشن قوانین میں تبدیلی کے بعد، بڑی تعداد میں ایسے

تاریکین وطن امریکہ آنے لگے جو اپنے مذہبی، ثقافتی اور نسلی تنخص کو قائم رکھنا چاہتے تھے، اور اس میں اسلام ایک بنیادی ستون کے طور پر شامل تھا۔ ان میں عربی بولنے والے تاریکین وطن کے ساتھ ساتھ بڑی تعداد میں جنوبی ایشیائی مسلمان بھی شامل تھے۔ جنوبی ایشیائی مسلمانوں کی تیزی سے بڑھتی ہوئی تعداد نے رفتہ رفتہ ایک مخصوص امریکی مسلم شناخت تشکیل دینے کی کوششوں کو تقویت دی۔ یہ لوگ اعلیٰ تعلیم اور پیشہ ورانہ ترقی کی خواہش لیے امریکہ آئے، تاکہ خود اور اپنی آئندہ نسلوں کے لیے مادی ترقی حاصل کر سکیں۔ ان کے لیے اسلام ان کی ثقافتی شناخت کا لازمی حصہ تھا اور یہ ان کی مادی خواہشات سے متصادم نہیں تھا۔ تاہم، 1970 اور 1980 کی دہائیوں میں صوفی اسلام کے پھیلاؤ سے قبل، بہت کم سفید فام امریکی اسلام قبول کرتے تھے۔

مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن (MSA) کا قیام 1963 میں University of Illinois at Urbana-Champaign کے کیمپس پر بین الاقوامی طلباء کی کوششوں سے عمل میں آیا۔ اس کی ابتدائی قیادت عرب طلباء کے ہاتھ میں تھی جو انخوان المسلمون سے وابستہ تھے۔ اس تنظیم کے بانیوں میں ہشام الطالب شامل تھے، جن پر بعد میں القاعدہ کو مالی امداد فراہم کرنے کے الزامات کے تحت ایف بی آئی نے نشتیش کی۔ ایک اور اہم بانی جمال برزنجی تھے، جنہوں نے بعد ازاں ورجینیا کے شہر فالز چرچ میں ”دارالبحرہ“ نامی مسجد قائم کی۔ اسی مسجد کے ساتھ ایک وقت میں وہ افراد وابستہ رہے جن پر نائن الیون حملوں میں ملوث ہونے کا شبہ ظاہر کیا گیا، جیسے انور العولقی اور ندال ملک حسن۔

نیویارک ٹائمز کی ایک رپورٹ کے مطابق، MSA کو ابتدا ہی سے سعودی عرب کی وہابی تنظیم ”مسلم ورلڈ لیگ“ سے مالی معاونت اور نظریاتی رہنمائی حاصل رہی۔ 9/11 حملوں سے محض چھ ماہ قبل، یونیورسٹی آف سدرن کیلیفورنیا میں MSA کے زیر اہتمام طالبان کے سفارتی نمائندے سید ہاشمی کو مہمان مقرر کے طور پر مدعو کیا گیا۔ اسی طرح، نائن الیون حملوں کا مرکزی منصوبہ ساز خالد شیخ محمد 1986 میں نارتھ کیرولائنا کے اینڈی اسٹیٹ یونیورسٹی میں MSA کا رکن رہ چکا تھا۔

بعد ازاں، MSA کی شاخیں امریکہ اور کینیڈا کی متعدد جامعات میں قائم ہو گئیں۔ ایک مرکزی تنظیم کے طور پر، اس نے نہ صرف جامعات کے مسلم طلباء بلکہ وسیع مسلم کمیونٹی سے بھی روابط

استوار کیے۔ آج امریکہ کی تقریباً اسی فیصد مساجد، جو سنڈے اسکولز اور کمیونٹی سینٹرز سے جڑی ہوئی ہیں، وہابی۔ سلفی نظریات کے زیر اثر کام کر رہی ہیں۔ امریکہ میں وہابی نظریاتی اثر و رسوخ کی ایک اور اہم علامت ”کنسل آن امریکن اسلامک ریلیشنز“ (CAIR) ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ امریکہ کے ستر فیصد سنی مسلمان اپنی مساجد میں وہابی تعلیمات کے حامی ہیں۔ وہابی اثر و رسوخ صرف مساجد کی تعمیری یا مالی امداد تک محدود نہیں، بلکہ اس میں ان کی حسابیادوں کا کنٹرول، اماموں کی تقرری، ان کی تربیت، اور تبلیغی مواد کا تعین بھی شامل ہے۔ ان مساجد میں تقسیم ہونے والا دینی لٹریچر عموماً سعودی عرب سے فراہم کیا جاتا ہے۔ اس طرح، ایک منظم انداز میں وہابی۔ سلفی فکر امریکی مسلم معاشرے میں سرایت کرتی گئی ہے۔

اسلامک سوسائٹی آف نارٹھ امریکہ (ISNA) شمالی امریکہ میں مسلمانوں کی سب سے بڑی تنظیم ہے، جو ہر سال امریکہ اور کینیڈا کے مختلف بڑے شہروں میں سالانہ کنونشن منعقد کرتی ہے۔ ان کنونشنز میں عموماً سچاس ہزار سے زائد شرکاء شرکت کرتے ہیں، جو دونوں ممالک سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان تقریبات میں اسلامی مسائل کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو ہوتی ہے اور بین المذاہب مکالمے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، لیکن وہابی قیادت میں پنپنے والی اسلامی دہشت گردی اور اس کے ہتھیار بننے کے عمل پر کبھی کھل کر بات نہیں کی جاتی۔ ISNA اور CAIR، دونوں تنظیمیں سعودی حکومت سے قریبی تعلقات رکھتی ہیں۔ اس وقت امریکہ میں بارہ سو سے زائد مساجد وہابی کنٹرول میں ہیں، جنہیں سعودی حکومتی اداروں جیسے مسلم ورلڈ لیگ اور ورلڈ اسمبلی آف مسلم یوتھ سے کروڑوں ڈالر کی مالی امداد حاصل ہوتی ہے۔ ان اداروں نے ایک وقت میں القاعدہ کو بھی مالی معاونت فراہم کی تھی۔

یہ غلط فہمی نہ رکھی جائے کہ امریکہ میں تیسری نسل کے مسلمان، خواہ ان کا تعلق کسی بھی قوم یا نسل سے ہو، بڑی تعداد میں وہابی۔ سلفی مساجد کا رخ نہیں کرتے؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ان مساجد میں باقاعدگی سے شرکت کرتے ہیں اور ایک سخت گیر، قدامت پسند نظریاتی زاویہ اختیار کر چکے ہیں، جس کا دائرہ کار بہت محدود ہو چکا ہے۔ نائن الیون کے حملوں کے بعد، مسلم کمیونٹی بھی امریکی

سماج کی طرح نظریاتی طور پر دو حصوں میں بٹ گئی۔ حملوں سے پہلے مسلمان امریکہ میں اپنی آواز اور بڑھتی ہوئی موجودگی پر خوش تھے، لیکن جب ان کے اپنے بچے، جو امریکہ میں پیدا ہوئے، وہیں پلے بڑھے، ایسے ہولناک واقعے کو ”بدلہ“ قرار دے کر قبول کرنے لگے، تو یہ ایک جھٹکا تھا۔ یہ سمجھنا مشکل تھا کہ ایسی نفرت اور کدورت کس طرح اس معاشرے میں رچ بس گئی، جس میں وہ ساری زندگی رہے تھے۔

نو جوان مسلمانوں کو شدت پسندی کی طرف مائل کرنے والا ایک بڑا سبب ان کی شناخت کی تلاش ہے۔ وہ اکثر رنگ، نام اور مذہب کی بنیاد پر خود کو دوسروں سے مختلف محسوس کرتے ہیں، خصوصاً پرانی نسل کے تارکین وطن کے مقابلے میں۔ جمعے کے خطبوں میں وہابی نظریات اور دنیا بھر میں امریکہ کی مسلم اقوام کے خلاف کارروائیوں کی تفصیلات شامل ہوتی ہیں۔ یہ خطبات اکثر فلسطین کا محاصرہ، عراق پر امریکی حملہ اور افغانستان میں بمباری جیسے تازہ ترین واقعات پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ نہ صرف امریکی ثقافت سے بلکہ اپنے والدین کی مسلم ثقافت سے بھی دوری نو جوانوں کو اس طرف دھکیلتی ہے کہ وہ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے ذریعے ایک ایسی عالمی اسلامی شدت پسند تحریک کا حصہ بن جائیں، جو ان کی شناخت اور غصے کو ایک نیا رخ دیتی ہے۔

خود ساختہ جہادیوں میں سے ایک مشہور واقعہ عمر حمادی کا ہے، جو ایک شامی تارک وطن کے بیٹے تھے جس نے جنوبی ریاست الاباما کے قصبے ڈیفنی میں ایک سفید فام امریکی خاتون سے شادی کی تھی، جو عیسائی فرقے ”سدرن بیپٹسٹ“ سے تعلق رکھتی تھیں۔ مئی 2012 میں، عمر نے اپنی

خودنوشت The Evolution of an American Jihadi: The Case of

Omar Hammami (ایک امریکی جہادی کا ارتقا: عمر حمادی کا معاملہ) کا پہلا حصہ انٹرنیٹ پر جاری کیا۔ اس میں انہوں نے صومالیہ کے خانہ جنگی سے متاثرہ علاقوں میں جانے سے پہلے اور بعد کے اپنے تجربات بیان کیے۔ قلمی نام ”ابو جہاد الشامی“ کے تحت لکھی گئی 127 صفحات پر مشتمل اس خودنوشت میں واضح ہوتا ہے کہ آن لائن دستیاب سلفی طرز کے اسلامی لٹریچر اور سلفی مساجد کے ماحول نے نو جوان ذہنوں پر کس طرح تباہ کن اثرات مرتب کیے ہیں۔

ان کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ذہین اور باصلاحیت نوجوان تھے۔ انہوں نے اپنے اسکول کی سو فوٹو مور (دوسری سال) کلاس کے صدر کا انتخاب جیتا، اور ایک خوبصورت سنہرے بالوں والی لڑکی سے محبت میں مبتلا تھے، جو اسکول کی مقبول ترین لڑکیوں میں شمار ہوتی تھی۔ وہ ہونہار طلبہ کے پروگرام کا ستارہ تھے اور ان کا خواب تھا کہ وہ ایک ماہر سرجن بنیں۔ پندرہ سال کی عمر میں ان میں خاصی جاذبیت تھی۔ مگر جو بیڑ سال تک، ان میں خود انتہا پسندی کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ انہوں نے اپنا لباس بدل دیا اور اسکول کے باہر پرچم کے پاس کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے۔ اُن کی تعلیمی کارکردگی شاندار تھی اور ان کے ACT (کالج داخلہ امتحان) کے نمبر 93 ویں پر سینکڑوں میں تھے۔ انہوں نے سینئر سال کو چھوڑ دیا اور براہ راست یونیورسٹی آف سدرن الاباما میں داخلہ لے لیا۔ وہاں اب وہ اکیلے نماز نہیں پڑھتے تھے۔ جامعہ سے مسجد کا فاصلہ پیدل طے کیا جاسکتا تھا۔ جلد ہی وہ وہاں کی نوخیز مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کے صدر بن گئے۔ عمر حمای پوری شدت کے ساتھ سلفیت میں ڈوب گئے اور اس کے اصطلاحات اور باریکیوں پر عبور حاصل کیا۔ اس تحریک نے انہیں ایک نئی طرح کا بھائی چارہ، نظم و ضبط اور زندگی کا مقصد عطا کیا۔ انہوں نے ٹخنوں سے اوپر شلوار پہننا شروع کیا، جو سلفیوں میں عام رواج ہے۔ انتہا پسندی اس حد تک ان کی سوچ میں پیوست ہو گئی کہ ایک موقع پر انہوں نے خاندانی تصویریں کھینچوانے سے بھی انکار کر دیا۔ ان کے والد شفیق حمای اس حرکت سے ناراض ہو گئے اور انہیں گھر سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ اس کے بعد عمر نے خود کو مکمل طور پر دعوت (اسلام کی تبلیغ) کے لیے وقف کر دیا۔ اُن کا طرز لباس ہی ایسا ہوتا تھا کہ لوگ سوال کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ وہ تجارتی مراکز میں چنے پہن کر گھومتے تاکہ لوگ ان سے استفسار کریں۔ کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں ایک صومالی لڑکی سے شادی کرنے کے بعد وہ مصر چلے گئے، جہاں انہوں نے جامعہ الازہر میں داخلہ لیا تاکہ اسلام کا مطالعہ کر سکیں۔

اس وقت صومالیہ ایک ہولناک خانہ جنگی کی لپیٹ میں تھا۔ جو کچھ قحط اور خشک سالی سے بچا تھا، وہ تزاؤں اور جنگی سرداروں کی لوٹ مار کا شکار ہو گیا۔ اس ابتری کے عالم میں ایک جہادی تحریک

نے سراٹھایا، جس نے جون 2006 میں دارالحکومت موغادیشو پر قبضہ کر لیا۔ ان باغیوں کی قیادت القاعدہ سے منسلک تنظیم الشبাব کر رہی تھی، جس کا مطلب عربی میں ”نوجوان“ ہے۔ اس کے پڑوس میں واقع مسیحی ملک ایتھوپیا، اسلامی دہشت گردی کے پھیلاؤ سے خوفزدہ ہو کر حملے کی تیاری کرنے لگا۔ ایتھوپیائی افواج نے امریکی فوج کی پشت پناہی میں سرحد پر جمع ہونا شروع کیا۔ جیسے ہی اس ممکنہ تصادم کی خبریں جہادی چیٹ رومز میں گونجنے لگیں، اسامہ بن لادن نے تمام جہادیوں کو صومالیہ پہنچنے اور جہاد میں شامل ہونے کی دعوت دی۔

مصر میں مقیم عمر جمہی صومالیہ کی صورتحال کو قریب سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا ذہن مکمل طور پر تیار ہو چکا تھا اور دینی اعتبار سے وہ اس یقین تک پہنچ چکا تھا کہ ”جہاد اس پر فرض ہو چکا ہے“۔ وہ اپنی جان قربان کر کے اسلام کے بھائی بہنوں کو بچانا چاہتا تھا۔ اس وقت تک وہ سوشل میڈیا پر سرگرم ہو چکا تھا۔ وہ مغرب میں مقیم اپنے جہادی ساتھیوں کو جہاد میں شامل ہونے کی دعوت دیتا، مگر صومالیہ کا نام نہیں لیتا تھا۔ عمر نے موغادیشو کا سفر کیا، اور ایئر پورٹ پر امیگریشن حکام کو بتایا کہ اس کی بیوی صومالیہ سے ہے اور وہ اپنے والدین سے ملنے آئی ہے۔ اسی دوران، ہزاروں ایتھوپیائی فوجی صومالیہ میں داخل ہو گئے اور برق رفتاری سے موغادیشو پر قبضہ کر لیا۔ اسلامی کورٹ یونین (ICU) کی قیادت ملک سے فرار ہو گئی، جبکہ ان کا جہادی ونگ الشباب جنوبی صومالیہ کی طرف پیچھے ہٹ گیا اور ایتھوپیائی افواج کو نکلنے کے لیے ایک نیا مسلح مزاحمتی محاذ کھول دیا۔ یہ واضح نہیں ہو سکا کہ عمر جمہی کو الشبাব کی قیادت سے کس نے جوڑا، تاہم اپنی بیوی کو بھیجے گئے ایک ای میل میں اس نے لکھا کہ اس کی دیرینہ خواہش پوری ہو چکی ہے، وہ ”اسلامی جہاد کے صومالی خیمے“ کے نیچے آچکا ہے، اور وہ اس پر ”سکون“ محسوس کر رہا ہے۔ محض تین سال کے اندر، عمر الشبাব کی اعلیٰ قیادت تک پہنچ گیا۔ وہ ایک طاقتور کردار میں سامنے آیا، گوریلا حملوں کی قیادت کی، حملوں کی منصوبہ بندی میں شریک ہوا اور اعلیٰ کمانڈرز کے ساتھ مل کر حکمت عملی تیار کرنے لگا۔ جلد ہی وہ ایک ”جہادی ہیرو“ بن کر ابھرا، جو بھرتی کی ویڈیوز میں نمایاں نظر آتا تھا، اور ان ویڈیوز نے سیکڑوں غیر ملکی جنگجوؤں کو صومالیہ کی طرف کھینچ لیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب کوئی امریکی

شہری کسی دہشت گرد تنظیم کی اعلیٰ صفوں تک پہنچا تھا۔ امریکی خفیہ اداروں میں یہ غلط تاثر پایا جاتا تھا کہ امریکی مسلم نوجوان، یورپ کے مسلمانوں کے برعکس، سماجی طور پر ہم آہنگ اور معاشی طور پر کامیاب ہیں، لہذا ان کے انتہا پسندی کی طرف مائل ہونے کے امکانات کم ہیں۔ حقیقت اس کے برعکس تھی: اتوار کے مدارس اور جمعہ کے خطبے پہلے ہی مسلم نوجوانوں کو بنیاد پرستی کے لیے تیار کر چکے تھے، اور سوشل میڈیا پر موجود سلفی لٹریچر نے امریکی یونیورسٹیوں کے کمپسوں میں زیر تعلیم نوجوانوں کو گہرے طور پر متاثر کیا تھا۔

افغانستان میں امریکی فوجوں کی موجودگی اور عراق پر حملے نے مغرب میں پروان چڑھنے والے ان مسلم نوجوانوں کی نفسیات پر گہرا اثر ڈالا، جن کی جڑیں ایک طرف اسلامی دنیا میں تھیں۔ سیٹلائٹ ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ نے یمن اور نیویارک، ڈیہیٹی (الاباما) اور صومالیہ کے درمیان فاصلوں کو سمیٹ کر رکھ دیا۔ عمر حامی کے لیے عراق کی جنگ وہ چنگاری ثابت ہوئی جس نے اسے شدت پسندی کی راہ پر ڈال دیا۔

خود ساختہ انتہا پسند اسلامی دہشت گرد سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کی پیداوار ہیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ 11 دسمبر 2017 کو ٹائمز اسکوائر، سب وے، مین ہیٹن میں پیش آیا، جب اکاید اللہ نامی ایک بنگلہ دیشی تارک وطن، جو بروکلن کے بنگلہ دیشی علاقے میں مقیم تھا اور مقامی سلفی مسجد میں نماز ادا کرتا تھا، اچانک منظر عام پر آیا۔ تقیثی حکام کو اس نے بتایا کہ اس نے بم بنانے کا طریقہ انٹرنیٹ سے سیکھا، اور ایک الیکٹریشن کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے بم کے پرزے جمع کیے۔ خوش قسمتی سے اس کا بنایا گیا کچا پائپ بم مکمل طور پر پھٹ نہ سکا، صرف دھواں نکلا اور وہ خود زخمی ہو گیا۔ یہ واقعہ اس بات کی مثال ہے کہ وہابی۔ سلفی نظریات پر مبنی لٹریچر، جو مختلف وہابی اداروں اور جمعہ کے خطبات کے ذریعے نوجوانوں تک پہنچایا جاتا ہے، کیسے مسلم نوجوانوں کو دہشت گردی کی طرف مائل کرتا ہے۔ یہ نوجوان سوشل میڈیا کے ذریعے بھی انتہا پسندی کی طرف مائل ہوتے ہیں اور وہابی۔ سلفی انداز میں پیش کیے گئے قرآن وحدیث کے تفسیری نظریات کے زیر اثر بھی، جنہیں ”اصلی اسلام“ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

وہابی۔ سلفیوں کے لیے ان کی مسلم شناخت، قرآن و حدیث کی وہابی تشریحات کے دائرے میں ہی قائم ہوتی ہے۔ وہ ہر اس ثقافتی عنصر کو رد کرتے ہیں جو اسلامی اصولوں کی ظاہری اور لغوی تشریح سے انحراف کرتا ہو۔ ان کے نزدیک بغیر حجاب یا مکمل چھپنے باہر نکلنا یا حضرت محمد ﷺ کی ولادت کی خوشی منانا بھی ”بدعت“ ہے۔ ان کے نزدیک تقریباً ہر ثقافتی اظہار بدعت کے زمرے میں آتا ہے، کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں مکہ و مدینہ میں ایسی کوئی چیز نہ تھی۔ بلکہ، خود نبی کریم ﷺ کو بھی مدینہ کے اطراف میں بسنے والے کچھ بدویوں کی سخت مزاجی اور جہالت سے پریشانی رہتی تھی۔

اسلامی ریاست (داعش) کا مظاہرہ پسندانہ تشدد اور قیامت خیز نظریہ، سعودی عرب کی دہائیوں پر محیط کوششوں کا نتیجہ ہے، جن کا مقصد پر امن حنفی، صوفی، سنی اسلام کو ایک متشدد، تنگ نظر وہابی مذہب میں تبدیل کرنا رہا ہے۔ جیسے جیسے دنیا کا آپسی رابطہ بڑھتا جا رہا ہے، علم، معلومات، خبریں، سافٹ ویئر، تجارت اور مختلف سماجی گروہ عالمی ویب پر جمع ہو رہے ہیں۔ مختلف نسلیں اور معاشرتیں اب بغیر کسی فلٹر کے ایک دوسرے سے اور وسیع دنیا سے جڑ رہی ہیں۔ فیس بک، ٹوئٹر، یوٹیوب، واٹس ایپ جیسے سوشل میڈیا پلیٹ فارمز نے جہادی اسلام پرستوں کے لیے اسلام کی مسخ شدہ تشریح کو پھیلانے کی کھڑکیاں پوری طرح کھول دی ہیں۔ اگر اس رجحان پر مؤثر طریقے سے قابو نہ پایا گیا تو یہ سوشل میڈیا پر پھیلنے والا وہابی جہادیت کا عفریت آئندہ بھی دنیا بھر کے لیے ایک کٹھن چیلنج بن رہے گا۔

نئی ٹیکنالوجی کا ظہور

سان فرانسسکو (کیلیفورنیا، امریکہ) 1960 کی دہائی کے اواخر میں ایک ایسا مرکز بن چکا تھا جہاں مختلف سماجی، ثقافتی، فکری اور ٹیکنالوجیکل تحریکیں جنم لے رہی تھیں۔ یہاں ٹیکنالوجی کا ایک انقلاب شروع ہوا، جو پہلے فوجی ٹھیکیداروں کی ترقی سے جڑا، اور جلد ہی الیکٹرانک کمپنیوں، مائیکرو چپ بنانے والوں، ویڈیو گیم ڈیزائنرز اور کمپیوٹر کمپنیوں کے ساتھ تعاون کے راستے کھلنے لگے۔ اس اشتراک عمل کے نتیجے میں ٹیکنالوجی کا امتزاجی عمل (technological

(convergence) شروع ہوا۔ اسی دوران ہیکرز کی ایک ذیلی ثقافت بھی وجود میں آئی، جس میں سائبر پینکس اور شو قیہ ٹیکنالوجی کے دلدادہ افراد شامل تھے۔ کچھ نیم علمی اداروں کی مدد سے، چند ذہین افراد نے دنیا کا پہلا کمپیوٹر ماؤس بھی یہیں ایجاد کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب پپی تحریک اور بیٹ جنریشن کی ردِ ثقافتی تحریک نے امریکی جامعات میں ہلچل مچا رکھی تھی۔ مغرب میں لوگ اب روحانی بصیرت کی تلاش میں زین بدھ مت اور کرشن کلٹ کی طرف مائل ہونے لگے تھے۔ مراقبہ اور یوگا زندگی کا فیشن بنتے جا رہے تھے، اور ایک بڑی تعداد میں نوجوان اور ذہین افراد مذہبی و سماجی گروہوں کی طرف راغب ہونے لگے تھے۔ اکیسویں صدی کے سب سے ذہین دماغوں میں سے ایک 'اسٹیو جابز' بھی اسی انوکھے اور پر آشوب ماحول کی پیداوار تھے۔ انہوں نے سبزی خوری، صبح کے مراقبہ اور دنیا کو بدلنے کے خواب کو اپنی زندگی کا حصہ بنالیا تھا۔

ابتدائی دور میں، پپی نوجوان اور ٹیکنالوجی کے ماہرین ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہ تھے۔ ان میں سے کئی ردِ ثقافتی سوچ رکھنے والے افراد کمپیوٹروں اور پیٹنگٹون کو امریکی فوجی طاقت کے نئے آلہ تسلط کے طور پر دیکھتے تھے۔ تاہم، 1970 کی دہائی کے اوائل میں سوچ کے زاویے میں ایک انقلابی تبدیلی آئی، اور کمپیوٹر کو فرد کی آزادی اور خود اظہار کی علامت کے طور پر دیکھنا شروع کر دیا گیا۔

اکیسویں صدی کی ٹیکنالوجی کی حیران کن ایجادات نے دنیا کو بدل دیا جیسے آئی فون، گوگل سرچ انجن، مائیکروسافٹ آپریٹنگ سسٹم اور جنہیں اسلامی جہادی تنظیمیں بھی استعمال کر رہی تھیں، ان سب کے موجد، دراصل وہی لوگ تھے جو سینڈل پہنتے تھے، چرس پیتے تھے، اور امریکی اعلیٰ تعلیمی اداروں جیسے MIT سے تعلیم چھوڑ چکے تھے۔ ان کے منفرد اندازِ فکر اور بصیرت نے انہیں وہ مقام دیا کہ وہ اسٹیو جابز، لیری پیج، مارک زکربرگ اور بل گیٹس جیسے قابلِ رشک کامیاب انسان بن گئے۔

’چپٹی دنیا‘ (Flat World) کی تمثیل کو سب سے پہلے تھامس فریڈمین نے ایک منفرد انداز

میں اپنی ایک معروف بیسٹ سیلر کتاب میں استعمال کیا، جس میں انہوں نے اس استعارے کے ذریعے ٹیکنالوجی سے تحریک پانے والی عالمگیریت (globalization) کو بیان کیا۔ ٹیلی کمیونیکیشن کمپنیوں نے دنیا کو ”وائرڈ“ کر دیا یعنی سمندروں کی تہ میں آپٹیکل فائبر کیبلز بچھا کر مختلف ممالک اور براعظموں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا۔ اس غیر معمولی سطح کی ربط پذیری کے نتیجے میں فون کالز، انٹرنیٹ کنکشنز اور ڈیٹا ٹرانسفر کی لاگت میں بے حد کمی واقع ہوئی۔ اس عالمگیر رابطے سے سب سے زیادہ فائدہ دہشت گرد تنظیموں جیسے القاعدہ اور داعش نے اٹھایا۔ انہیں اپنے چھوٹے چھوٹے اقدامات کے ذریعے بھی عالمی سطح پر بڑے اثرات ڈالنے کا موقع مل گیا۔ مثال کے طور پر، پاکستان میں القاعدہ سے منسلک جنگجوؤں کی جانب سے ”وال اسٹریٹ جرنل“ کے صحافی ڈینیئل پریل کا سر قلم کرنے کی خوفناک ویڈیو پوری دنیا میں انٹرنیٹ کے ذریعے پھیل گئی۔ یہی ویڈیوز ان دہشت گرد تنظیموں کی آن لائن بھرتی کے لیے بھی استعمال ہوئیں۔ ”چپٹی دنیا“ نے ان کے لیے اپنا پیغام دہشت پوری دنیا تک پلک جھپکتے پہنچانا آسان بنا دیا۔

داعش (ISIS) کی ٹیکنالوجی ونگ نہ صرف آن لائن مارکیٹنگ میں ماہر ثابت ہوئی بلکہ اس نے عالمی ویب (World Wide Web) پر موجود وسیع ڈیٹا کو اپنی حکمت عملی کے لیے استعمال کرنا بھی خوب سیکھ لیا ہے۔ انٹرنیٹ سے وہ ممکنہ اہداف جیسے کہ ٹرانسپورٹ کے مراکز، جوہری توانائی کے پلانٹس، سرکاری عمارات اور ہوائی اڈوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں۔ جیسے سیاسی تنظیمیں انٹرنیٹ کو فنڈ ریزنگ کے لیے استعمال کرتی ہیں، ویسے ہی دہشت گرد گروہ بھی اپنی مالی معاونت کے لیے اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ القاعدہ شروع سے ہی اپنی عالمی مالیاتی نیٹ ورک پر انحصار کرتی آئی ہے۔ اسلامی دہشت گرد میڈیا سیل ان ویب سائٹس کے وزیٹرز کو ٹریک بھی کرتے ہیں تاکہ ان کے رجحانات پر مبنی پروفاکٹریا کی جاسکیں۔ جو افراد ان ویب سائٹس کو بار بار دیکھتے ہیں یا کسی درجے میں جہادی نظریات سے متاثر نظر آتے ہیں، ان سے بعد ازاں رابطہ کیا جاتا ہے۔ بھرتی کرنے والے افراد انٹرنیٹ کی انسٹراکٹو ٹیکنالوجی جیسے چیٹ رومز اور سائبر کیفے کا استعمال کرتے ہوئے نوجوانوں کو ہدف بناتے ہیں، جو

ان کی شدت پسندانہ سوچ کے لیے پذیرائی کا مظاہرہ کریں۔

اسلامک اسٹیٹ نے ایک وقت میں نہ صرف عراق اور شام کے بڑے علاقوں پر قبضہ کیا تھا بلکہ اس نے دنیا بھر میں بڑی تعداد میں مسلم نوجوانوں کی سوچ کو بھی مسخر کر لیا تھا۔ بہت سے ذہین اور ٹیکنالوجی سے واقف نوجوان سخت گیر وہابی اور سلفی نظریات کو دنیا کے مختلف حصوں میں فروغ دینے کے لیے اس تنظیم سے جڑ گئے۔ یوں ایک ”چیٹی دنیا کی دہشت گردی“ (flat terrorist world) کا خاکہ اُبھر آیا یعنی ایک ایسی دنیا جہاں عالمی سطح پر پھیلے شدت پسند نظریات اور نیٹ ورکس انٹرنیٹ کے ذریعے تیزی سے منسلک ہو گئے۔ 30 سال سے کم عمر کے نوجوان مسلمان، خصوصاً شمالی امریکہ اور یورپی ممالک میں، پہلے ہی ہفتہ وار خطبات اور اتوار کے مدارس کے ذریعے تشدد پر مبنی سلفی اسلام کی تعلیم حاصل کر چکے ہیں، جو کہ ان کے ذہنوں کو انتہا پسندی کی طرف مائل کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

جہادی پلیٹ فارم کے طور پر سوشل میڈیا کا رول

داعش (Islamic State) نے ڈیجیٹل میڈیا کی طاقت کو ابتدائی دنوں میں ہی پہچان لیا تھا، جب اردن میں مقیم القاعدہ کے جہادی ابو مصعب الزرقاوی نے اپنی جہادی کارروائیوں کی دھندلی ویڈیوز انٹرنیٹ پر اپ لوڈ کرنے کے امکانات دریافت کیے۔ جیسے جیسے تنظیم نے ترقی کی اور کمپیوٹر سے واقف نوجوان اس کا حصہ بنتے گئے، داعش کے پروپیگنڈا ماہرین نے اپنے حریف القاعدہ کو یہ دکھا دیا کہ وہ میڈیا حکمت عملی میں کہیں آگے ہیں۔ داعش نے اپنی رسائی کو وسعت دینے کے لیے ٹیلیگرام (Telegram)، سورا سپاٹ (Surespot) جیسے سوشل میڈیا پلیٹ فارمز اور JustPaste.it جیسے کائنیت شئیرنگ سسٹمز کا استعمال انتہائی مہارت سے کیا۔ ایک چالاک حکمت عملی کے تحت، داعش نے اپنی میڈیا سرگرمیوں کو غیر مرکزیت دی اور ان کے چینلز مختلف خود مختار پیداواری گروپوں کے مواد سے بھرے رہتے تھے، مالی (Mali) سے لے کر چیچنیا (Chechnya) تک، جو کہ ثقافتی تنوع کے ساتھ یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہابی سلفیت پوری دنیا میں سرایت کر چکی ہے۔ داعش کو اس بات پر فخر تھا کہ وہ ایسا مواد تیار کرتی ہے جو بیک وقت تخلیقی

بھی ہوا اور اشتعال انگیز بھی۔ القاعدہ کی عراقی شاخ نے الزرقاوی کی قیادت میں یرغالیوں کے سر قلم کرنے کی ویڈیوز کو بطور پروپیگنڈا ہتھیار استعمال کیا۔

تاہم، اسامہ بن لادن کے بعد القاعدہ کے دوسرے اہم رہنما، ایمن الظواہری نے اس عمل پر شدید ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور الزرقاوی کو انتباہ دیا کہ ایسی شدید خونی کارروائیوں کی تشہیر القاعدہ کی ساکھ کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ مستقبل میں ایسی حرکات سے گریز کیا جائے۔ الزرقاوی کو جون 2006 میں ایک امریکی فضائی حملے میں مار دیا گیا۔ بعد ازاں، القاعدہ نے خود کو اسلامی ریاست عراق (ISI) کے طور پر دوبارہ منظم کیا، جو ایک ایسی دہشت گرد تنظیم کے طور پر ابھری جو سنی مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے خود کو وقف سمجھتی تھی اور اس نے زیادہ سے زیادہ زمین پر قبضہ کر کے اکیسویں صدی کی پہلی اسلامی خلافت قائم کرنے کی کوشش کی۔ داعش نے ابو بکر البغدادی کی قیادت میں عراق میں فرقہ وارانہ درازوں کا فائدہ اٹھایا اور شمالی عراق کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کیا، جس میں موصل جیسا اہم اور دوسرا سب سے بڑا شہر بھی شامل تھا۔

داعش کی تیز رفتار توسیع (2013-2014) میں ڈیجیٹل میڈیا پلیٹ فارمز کا شاطرانہ استعمال انتہائی اہم کردار کا حامل تھا۔ اس تنظیم کی ڈیجیٹل میڈیا ونگ ”الفرقان“ نے اپنے تمام حملوں کو دستاویزی شکل میں پیش کیا، خاص طور پر عراقی شیعہ فوجیوں کے انجام کو اجاگر کیا جو اسلامی ریاست کے جنگجوؤں کے سامنے خاموشی سے ہتھیار ڈال دیتے تھے۔ داعش کی پروپیگنڈا ویڈیوز، جنہیں ”تلواروں کی جھنکار“ (Clanging of the Sword Videos) کے نام سے جانا جاتا تھا، نے ناظرین پر انتہائی اثر انگیز اثرات مرتب کیے۔ ان ویڈیوز کی اشاعت کے بعد کئی علاقوں میں عراقی سیکورٹی فورسز کا مورال پست ہو گیا اور وہ داعش سے لڑنے سے خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئیں۔ یورپ اور امریکہ کے مسلم نوجوانوں کو داعش کی خلافت میں شامل ہونے کے لیے راغب کرنے کی غرض سے، تنظیم کے پروڈکشن ونگ نے شہادت سے متعلق ویڈیوز اور لٹرچر کو انتخابی انداز میں شائع کیا، جن میں خلافت کو ایک مثالی (utopian) ریاست کے طور پر دکھایا گیا تھا،

جہاں مذہبی جبر کا کوئی نشان تک نہیں تھا۔ وہ یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ خلافت اب کوئی خیالی یا مجرد تصور نہیں رہا بلکہ ایک حقیقی اور قابل رسائی حقیقت ہے، جس میں کوئی بھی آکر شامل ہو سکتا ہے۔

یورپ سے جو افراد ترکی کے راستے داعش میں شامل ہوئے، وہ اکثر اعلیٰ سماجی حیثیت کے حامل پروفیشنلز تھے، اور ان کی شمولیت نے جہادی حلقے کو ایک نئی سماجی عزت عطا کی۔ نئے ذہین افراد کا آنا داعش کے میڈیا مواد کے لیے بھی بیش بہا اثاثہ بن گیا: جدید ایکشن کیمرے اے کے-47 رائفلوں اور اسناپ رائفوں پر نصب کیے گئے، جس سے فرسٹ پرسن ایکشن ویڈیوز منظر عام پر آئیں، جو کہ پروپیگنڈا اور تشہیر کے لیے نہایت مؤثر تھیں۔ داعش کے سوشل میڈیا ونگ کی چکدار اور لدی ہوئی مزاحمتی حکمت عملی نے امریکی قانون نافذ کرنے والے اداروں اور سلیکون ویلی کے ڈیجیٹل ماہرین کو حیرت زدہ کر دیا۔ داعش کے سرکاری ترجمان نے اپنے ہمدردوں کو مغربی غیر مسلموں کو کسی بھی ہتھیار سے قتل کرنے کی ترغیب دی۔ داعش کے پروپیگنڈا سے متاثر ہونے والے افراد کا کہنا تھا کہ وہ اللہ کے احکام کی پیروی کرتے ہوئے اسلامی ریاست سے بیعت کرتے ہیں، ایک ایسی بیعت جو صرف روحانی نہیں بلکہ عملی اور انتقامی رنگ میں بھی ڈھل جاتی ہے۔

ابتدائی طور پر، القاعدہ اپنے کارکنان کی بھرتی کے معاملے میں زیادہ محتاط اور منتخب انداز اختیار کرتی تھی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے آپریشنز کی کامیابی کا انحصار رازداری پر ہوتا تھا، کیونکہ وہ ہمیشہ اپنے اہداف کے انتخاب میں حیرت انگیز طریقہ اپناتے تھے۔ اس کے برخلاف، داعش کی بھرتی کا عمل بالکل کھلا اور آن لائن تھا، جو امریکی ٹیکنالوجی سے میسر آنے والے متعدد سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کے ذریعے انجام پاتا تھا۔ داعش کی بھرتیوں کا بنیادی مقصد عراق اور شام میں قبضے میں لی گئی زمین کا دفاع کرنا اور وہاں خلافت کا قیام تھا۔

القاعدہ نے ”آرٹ آف ریکورنگ“ کے عنوان سے ایک رہنما کتابچہ تیار کیا تھا۔ داعش کے بھرتی کنندگان نے اسی کتابچے کو اپنے جہادی اڈے پر جنگجو کھینچنے کے لیے استعمال کیا۔ داعش ترجیحاً ایسے افراد کو بھرتی کرتی تھی جو اسلامی تعلیمات سے نا آشنا یا کمزور مذہبی پس منظر رکھتے ہوں، کیونکہ رہنما کتابچے کے مطابق ایسے لوگوں کو آسانی سے برین واش کیا جاسکتا تھا۔ کتابچہ یہ

بھی مشورہ دیتا ہے کہ ممکنہ بھرتی شدگان کو وہابی۔ سلفی اسلامی کتابیں اور ویڈیوز ڈاک یا ڈیجیٹل فارمیٹ میں فراہم کی جائیں۔ نچوڑ یہ ہے کہ بھرتی کنندگان کو مسلسل رابطے میں رہنا چاہیے، یہاں تک کہ ممکنہ جہادی کو جہاد اور شہادت کے موضوع پر بیشتر احادیث از برہو حبانیں اور وہ شدید خواہش کے ساتھ اس کی طرف مائل ہو جائے۔

داعش کی قیادت کا بڑا منصوبہ یہ تھا کہ وہ عالمی مسلم برادری کو متحد کرے اور عراق و شام کے زیر قبضہ وسیع علاقوں میں ایک خلافت قائم کرے۔ داعش نے ان علاقوں پر قبضے کے بعد وہاں پر سخت شرعی قوانین کے تحت حکومت کرنا شروع کی، اور اپنے نئے بھرتی شدگان کو موعودہ خلافت کی طرف ہجرت پر آمادہ کیا۔ انہوں نے مسلسل یہ مؤقف اپنایا کہ موعودہ خلافت عراقی اور کرد زبانی افواج کے حملوں کی زد میں ہے، جنہیں امریکی فضائیہ کی پشت پناہی حاصل ہے؛ جبکہ شام میں وہ بشار الاسد کی فوجوں، ایرانی رضا کاروں اور حزب اللہ کے جنگجوؤں کے حملوں کی زد میں ہے، جنہیں روسی فضائیہ کی حمایت حاصل ہے۔

اس دوران، عرب بہار (Arab Spring) کے جوش و خروش کے بعد مشرق وسطیٰ کا دل گویا اندر سے پھٹ گیا۔ القاعدہ کے زہریلے بیانیے نے داعش کی فکری اور عسکری ترقی کو مزید بڑھا دیا، جس کے نتیجے میں جنگجو شام، عراق، لیبیا، مصر اور یمن کے محاذوں پر کود پڑے۔ 2015 تک، سینکڑوں امریکی اور یورپی مسلمان نوجوان داعش میں شامل ہو چکے تھے۔ سوفان گروپ، جو کہ ایک عالمی سکیورٹی تحقیقاتی ادارہ ہے، کے اندازے کے مطابق 27000 سے 13000 رضا کار، جن میں خواتین اور سفید فام مغربی نو مسلم بھی شامل تھے، عراق و شام میں داعش کی خلافت میں شامل ہونے کے لیے پہنچے۔ ان میں فرانس، جرمنی اور برطانیہ کے شہری نمایاں تھے، کیونکہ ان کی پرورش وہابی۔ سلفی جہادی بیانیے کے سائے میں ہوئی تھی۔ 2015 میں، انٹرنیٹ نے کتاب، رسائل اور ٹیلی وژن جیسے روایتی میڈیا کی جگہ لینا شروع کر دی تھی۔ سوشل میڈیا پلیٹ فارمز نے ہر فرد کو مرکزی دھارے میں شامل ہونے کا موقع فراہم کیا۔ یہ پلیٹ فارمز نہایت آسانی سے استعمال ہونے والے اور کم لاگت والے تھے، جس نے داعش جیسے گروہوں کو

وسیع تر رسائی اور تبلیغی طاقت فراہم کی۔

عام تاثر کے برعکس، انٹرنیٹ کے ذریعے انتہا پسندی کی طرف مائل ہونے والے اکثر نو جوان کچھ مذہبی مسلمان نہیں ہوتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے بہت سے اس کی تلاش میں بھی نہیں نکلے تھے، بلکہ انتہا پسندی نے انہیں تلاش کر لیا۔ آن لائن بنیاد پرستی تمام اقتصادی طبقات میں دیکھی گئی ہے۔ واحد مشترک عنصر یہ تھا کہ جو نو جوان انٹرنیٹ کے ذریعے انتہا پسند بنے اور بھرتی ہوئے، وہ داعش کے مقصد اور مغرب مخالف بیانیے کے لیے ہمدردی رکھتے تھے۔ انتہا پسندی کا زیادہ پھیلاؤ ان کمیونٹیز میں ہوا ہے جہاں عدم مساوات، معاشی محرومیاں اور سیاسی مایوسیاں غالب ہیں۔ اکثر یہ رجحان ان لوگوں میں جڑ پکڑتا ہے جو مظلوموں کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ یکجہتی کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں۔ جب وہ یوٹیوب پر فلسطین یا عراق میں ہونے والے مظالم کی ویڈیوز دیکھتے ہیں تو ان کے دل و دماغ میں ایک چنگاری سی بھڑکتی ہے۔ جب یہ ہمدردی کی چنگاری بھڑک اٹھتی ہے تو مشاہدے میں آیا ہے کہ اکثر نو جوان اس موضوع کے بارے میں مزید جاننے کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ جہادی حوالے میں پھنس جاتے ہیں۔

سائبر اسپیس میں اسلامی انتہا پسندی

القاعدہ اور داعش دونوں کے لیے سائبر میگزین سب سے زیادہ مستیازی ذرائع ابلاغ ہیں۔ 'انسپائر' (Inspire) نامی میگزین اصل میں القاعدہ نے تیار کیا تھا تا کہ انقلابی جذبہ اور دہشت گردی سے متعلق علم، جیسے کہ بم بنانے کے طریقے اور حملوں کی تنظیم کاری، کو عام کیا جاسکے۔ یہ میگزین انگریزی زبان میں شائع ہوتا تھا تا کہ مغربی دنیا کے ناظرین تک باسانی پہنچ سکے، اور 2010 ہی میں انٹرنیٹ پر وسیع پیمانے پر دستیاب ہو گیا تھا۔ یہ میگزین اتنا موثر ثابت ہوا کہ کئی افراد اس سے متاثر ہو کر دہشت گردانہ کارروائیاں کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ مثال کے طور پر، بوسٹن میں راتھن بم دھماکوں میں ملوث دو بھائی، تاملان اور جوہر سارنائیف، نے پریشر لگڑ میں بم تیار کرنے کا طریقہ اسی میگزین سے سیکھا تھا۔ داعش کے آئی ٹی ماہرین نے بہت جلد یہ بات سمجھ لی تھی کہ فیس

بک اور ٹوئٹر جیسے سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کی عالمی سطح پر پہنچ کس قدر وسیع ہے۔ سنہ 2014 میں فیس بک صارفین کی اوسط عمر 30 سال تھی، اور اُس وقت فیس بک پر تقریباً 1.3 ارب فعال اکاؤنٹس تھے۔ داعش نے ان پلیٹ فارمز کو مؤثر انداز میں اپنے پیغام 'یعنی اسلامی جہاد' کے فروغ کے لیے استعمال کیا، اور اسی کو انتہا پسند نیٹ ورکس تک رسائی کا ایک گیٹ وے بھی بنایا، جہاں سے وہ مختلف شدت پسند گروہوں اور آن لائن مباحثوں سے جڑ سکتے تھے۔

ٹوئٹر کا استعمال بھی بڑے پیمانے پر کیا گیا تاکہ پر تشدد ویڈیوز پر مبنی مواد کو پھیلا یا جاسکے، اپنے نظریات کو فروغ دیا جاسکے، اور ممکنہ بھرتی کے امیدواروں سے براہ راست رابطہ قائم کیا جاسکے۔ یہ پلیٹ فارم داعش کو یہ سہولت بھی فراہم کرتا تھا کہ وہ اپنے مخالفین کے ردِ عمل اور تاثرات کا جائزہ لے سکیں، کیونکہ خود مشرق وسطیٰ میں بھی بہت سے لوگ داعش کی حمایت نہیں کرتے تھے۔ تنظیم اس ڈیٹا کو مختلف طریقوں سے اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتی تھی۔ داعش کے ٹوئٹر بریگیڈ اکثر جعلی خبریں پھیلا کر تھے تاکہ لوگوں کی ہمدردی حاصل کر سکیں۔ اکثر اوقات ان کے جھوٹے ٹوئٹس کو مرکزی دھارے کے ذرائع ابلاغ (mainstream media) نے 'بریکنگ نیوز' سمجھ کر نشر بھی کر دیا۔ ایک مشہور واقعہ اپریل 2013 میں پیش آیا، جب ایسوسی ایٹڈ پریس (AP) کا ٹوئٹر اکاؤنٹ داعش نے ہیک کر لیا اور یہ خوفناک جھوٹی خبر پوسٹ کی گئی: 'بریکنگ نیوز: واٹ ہاؤس میں دو دھماکے، باراک اوباما زخمی'۔ چند ہی لمحوں میں یہ جھوٹا ٹویٹ ٹرینڈ کرنے لگا اور وال اسٹریٹ میں حصص کی قیمتیں گر گئیں۔ جب ٹوئٹر نے ایسے اکاؤنٹس بند کیے جن کے دہشت گرد تنظیموں سے تعلق کا شبہ تھا، تو داعش نے فوراً نئے اکاؤنٹس بنائے اور پھر سے ہزاروں لوگ انہیں فالو کرنے لگے۔ یہی چالاکی اور حربہ دیگر دہشت گرد تنظیموں نے بھی اپنا یا نام بدل کر، پھر سے سرگرم ہو جانا۔

یوٹیوب ایک اور مؤثر ذریعہ ہے جسے یہ دہشت گرد تنظیمیں بخوبی استعمال کرتی ہیں۔ یہ انتہائی مقبول پلیٹ فارم روزانہ لاکھوں نئے ویڈیوز وصول کرتا ہے اور لاکھوں کروڑوں صارفین انہیں دیکھتے ہیں، جس کی وجہ سے مواد کی نگرانی (Content Monitoring) بے حد مشکل ہو جاتی

ہے۔ یوٹیوب کی جانب سے جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق ہر منٹ میں تقریباً 300 گھنٹوں پر مشتمل ویڈیوز اپلوڈ کی جاتی ہیں۔ یہ بہت بڑی مقدار یوٹیوب کے لیے مواد کو فلٹر کرنا ایک چیلنج بنا دیتی ہے۔ مغربی ممالک کی انٹیلی جنس ایجنسیاں بھی ایک عجیب الجھن کا شکار ہیں: ایک طرف وہ جہادی ویڈیوز سے حاصل ہونے والی حساس معلومات کو کارآمد سمجھتی ہیں، اور دوسری طرف انہی ویڈیوز سے نوجوانوں کی ذہن سازی اور انتہا پسندی کا خدشہ لاحق ہے۔ لہذا، یوٹیوب، گوگل، ٹویٹر اور فیس بک جیسے میڈیا پلیٹ فارمز کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ ایسے الگوردمز (Algorithms) استعمال کریں جو تشدد پر مبنی زبان اور مواد کو پہچان سکیں، بالکل اسی طرح جیسے یہ چائلڈ پورنو گرافی جیسے غیر قانونی مواد کو روکنے کے لیے الگوردمز استعمال کیے جاتے ہیں۔

ویڈیو گیم ٹیکنالوجی (VGT) بھی دہشت گرد گروہوں کی جانب سے بڑے پیمانے پر استعمال کی جا رہی ہے۔ گلوبل اسلامک میڈیا فرنٹ، جو القاعدہ اور داعش سے وابستہ ایک انتہا پسند تنظیم ہے، ہمیشہ ایسے نوجوانوں کی تلاش میں رہتی ہے جو کمپیوٹر کے ماہر، میڈیا سے لبریز اور ویڈیو گیم کے عادی ہوں۔ ایک مرتبہ ایک ویب سائٹ پر ایک ویڈیو گیم پیش کی گئی جس کا عنوان تھا 'کویسٹ فار بٹش'، جس میں کھلاڑی 'امریکیوں' سے لڑتے ہیں اور مختلف مراحل طے کرتے ہیں جن میں 'جہادی پروش' اور 'امریکہ کا جہنم' جیسے درجات شامل ہوتے ہیں۔ ویڈیو گیم ٹیکنالوجی کو بہت چالاکی سے جہادی بھرتی کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہ اکثر مشہور گیمنز جیسے 'گریسنڈ تھیفٹ آٹو' کے طرز کو معمولی ترمیم کے ساتھ اپنا کر کیا جاتا ہے، تاکہ کھلاڑی داعش کے ارکان کے طور پر لڑائی میں حصہ لینے کا کردار ادا کر سکیں۔ گیم میں کی جانے والی مخصوص ترمیم میں داعش کے جنگجوؤں کو قانون نافذ کرنے والے اہلکاروں کو قتل کرتے ہوئے، امریکی فوجی قافلوں پر بموں سے حملے کرتے ہوئے اور داعش کے نشانہ بازوں کو امریکی فوجیوں کو گولیوں سے نشانہ بناتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ چند ہین مسلمان لڑکے داعش کے ٹیکنالوجی سیل کا بنیادی حصہ ہیں جو رقبہ، شام میں داعش کے ہیڈ کوارٹر میں قائم ہے۔

امریکی فوج نے بھی 2002 میں ویڈیو گیمنز تیار کیے تاکہ نوجوان نسل تک رسائی حاصل کی جا

سکے اور بھرتی کی جاسکے۔ امریکی فوج کا دعویٰ ہے کہ ویڈیو گیمز ان کی بھرتی میں نہایت مؤثر ثابت ہو رہے ہیں۔ داعش نے امریکی فوج کی اس مارکیٹنگ حکمت عملی کو بغور دیکھا اور اسی طرز پر مغربی ممالک میں اپنی بھرتی مہم کو تیز کر کیا۔ ایک ”چیٹی دنیا“ (flat world) میں دہشت گرد گروہ بھی ایک دوسرے سے ہتھکنڈے سیکھتے ہیں۔ ویڈیو گیم ٹیکنالوجی ایک مؤثر ذریعہ بن چکی ہے کہ ایسے وسیع تر حلقے، خاص طور پر وہ نوجوان مسلمان، جو بچپن سے اپنے محلوں کی مساجد میں وہابی-سلفی بیانیے سے متاثر ہو چکے ہوں، ان تک رسائی حاصل کی جائے۔ داعش سوشل میڈیا کو سائبر حملوں کے لیے بھی استعمال کرتی ہے۔ یہ حملے، جنہیں ’ڈینائل آف سروس‘ (Denial of Service) کہا جاتا ہے، نسبتاً سادہ طریقے سے کیے جاتے ہیں جن میں کمپیوٹر نیٹ ورکس کو درہم برہم کر کے، ان پر کثیر تعداد میں ’پنگز‘ بھیجی جاتی ہیں تاکہ نظام میں غیر ضروری پیغامات کا سیلاب آجائے۔ ’پنگ‘ ایک ڈیٹا پیکیٹ ہوتا ہے جو حملہ آور کو یہ جانچنے میں مدد دیتا ہے کہ آیا کوئی مخصوص نظام نیٹ ورک پر فعال ہے یا نہیں۔ جب پنگز کا سیلاب کسی مخصوص ویب سائٹ یا سرور پر بھیجا جاتا ہے، تو وہ بینڈ ویڈتھ کو بھر دیتا ہے اور سسٹم کی میموری کو لبریز کر دیتا ہے، جس سے نیٹ ورک یا تو جام ہو جاتا ہے یا کریش کر جاتا ہے۔ آج بھی داعش تکنیکی طور پر ماہر نوجوانوں کو اپنی طرف راغب کرتی ہے، خاص طور پر امریکہ سے، جو زبردست ہیکنگ صلاحیتوں کے حامل ہوتے ہیں۔

داعش نے مغربی ممالک سے خواتین کی بھرتی کے لیے ایک منظم حکمت عملی ترتیب دی ہے، کیونکہ اسے طویل مدتی بنیادوں پر اپنی صفوں کو بڑھانا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے ایسی خواتین کے ایک باقاعدہ گروہ کی بھی ضرورت ہے جو اگلی نسل کے جہادی جنگجوؤں کو جنم دے سکیں۔ مغرب میں پلّی بڑھی مسلمان خواتین داعش کی بھرتی کا بنیادی ہدف ہیں۔ داعش کی خواتین ہمدرد، جن میں سے بعض خود بھی بھرتی کنندگان ہیں، نے درجنوں سوشل میڈیا اکاؤنٹس بن رکھے ہیں جن کے ذریعے وہ خواتین کو خلافت کی سرزمین کی طرف ہجرت کی دعوت دیتی ہیں۔ شام اور دیگر مقامات کے لیے سفری رہنما کتابچوں اور ہدایات کو آن لائن دستیاب کر دیا گیا ہے۔

ذہن اور پرکشش نوجوان خواتین کو تنظیم کی طرف راغب کرنے کے لیے، ایسی خواتین کی تصاویر اس کی ویب سائٹس پر پوسٹ کی جاتی ہیں جن کے پاس مکمل اسلحہ موجود ہوتا ہے۔ داعش نے ایسی جعلی ٹویٹس بھی اپلوڈ کیں جو بظاہر ان خواتین کی طرف سے تھیں جنہوں نے شام میں اسلامی ریاست میں شمولیت اختیار کی تھی۔ ان پیغامات میں ایسی خوبصورت اور خوشگوار زندگی کا نقشہ کھینچا گیا جس میں ان خواتین کو وعدہ شدہ خلافت نے گلے لگایا اور عزت دی۔ تاہم، حقیقت اس سے بالکل مختلف اور نہایت ہولناک تھی، کیونکہ جو خواتین داعش کی قید سے فرار ہونے میں کامیاب ہوئیں، انہوں نے اس 'جہادی جنت' کی بھیانک تصویر پیش کی کہ کس طرح انہیں بے دردی سے استعمال کیا گیا، ان کے ساتھ بدسلوکی کی گئی، اور انہیں جہادی جنگجوؤں کے لیے جنسی غلام بنا کر رکھا گیا۔

فرانس میں نومبر 2016 کے دہشت گرد حملوں کے بعد، فرانسیسی پولیس نے وزارت داخلہ کے لیے ایک خفیہ رپورٹ تیار کی۔ اس رپورٹ کے چند چوڑکا دینے والے انکشافات میں سے ایک یہ تھا کہ یورپی یونین میں کم از کم 90 خودکش بمبار آزادانہ گھوم رہے ہیں۔ رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا کہ داعش بم سازی اور خفیہ پیغام رسانی (encryption) کی تکنیکوں میں مہارت حاصل کر چکی ہے تاکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق حملے کی منصوبہ بندی کر سکے۔

پیرس کے دہشت گرد حملوں کی منصوبہ بندی نہایت باریکی سے کی گئی تھی۔ اعلیٰ تربیت یافتہ بم سازوں کو خاص طور پر شام سے فرانس منتقل کیا گیا۔ اگرچہ بم سازی میں عام دستیاب مواد استعمال کیا گیا، لیکن اس عمل کے لیے خاص مہارت درکار تھی، جو اس بات کا اشارہ دیتی ہے کہ حملوں سے قبل پیرس میں کوئی ماہر فرد پہلے سے موجود تھا۔

ظاہر ہے کہ اصل سوال یہی ہے کہ آن لائن پلیٹ فارمز اور نیٹیکنالوجیز کے ذریعے پھیلتی ہوئی انتہا پسندی کو کس طرح روکا جائے؟ اسی پس منظر میں، فیس بک، یوٹیوب، ٹویٹر اور مائیکروسافٹ جیسے بڑے سوشل میڈیا اور سافٹ ویئر اداروں نے مل کر ایک اتحاد قائم کیا جسے 'گلوبل انٹرنیٹ فورم ٹوکاؤنٹرٹیرازم (GIFCT)' کا نام دیا گیا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ یہ اشتراک دہشت

گردی کے مسئلے کے حل کے لیے تکنیکی طریقوں، تحقیق اور حکومت و سول سوسائٹی کے ساتھ شراکت داری پر توجہ مرکوز کرے گا۔ ان کمپنیوں کے سربراہان طویل عرصے سے اس مشکل توازن کو سنبھالنے کی کوشش کرتے آرہے ہیں، ایک طرف آزادی اظہار کا تحفظ، اور دوسری طرف آن لائن دہشت گرد مواد کو روکنے کی ذمہ داری۔ وہ اس بات پر شدید تشویش کا شکار تھے کہ کس طرح جدید ٹیکنالوجیز کو رجعت پسند عناصر نفرت انگیز اور پر تشدد پیغامات پھیلانے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ نئے فورم کے ذریعے، یہ کمپنیاں مشین لرننگ پر مبنی مواد کی شناخت اور درجہ بندی کی تکنیکوں (content detection and classification techniques) کے بارے میں ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اٹھانے پر متفق ہوئیں، اور اس بات پر بھی اتفاق ہوا کہ دہشت گرد مواد کے خاتمے سے متعلق شفافیت پر مبنی رپورٹنگ کے معیارات وضع کیے جائیں گے۔ ساتھ ہی، اقوام متحدہ کی کاؤنٹر ٹیرازم کمیٹی کے ساتھ ایک پائیدار شراکت داری قائم کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا، تاکہ انتہا پسندی اور آن لائن نفرت انگیزی کے خلاف بہتر اقدامات کیے جاسکیں، اس کے ساتھ ساتھ آزادی اظہار اور صارفین کی پرائیویسی کا بھی خیال رکھا جائے۔ فیس بک نے خاص طور پر ایسا سافٹ ویئر تیار کرنے میں سرمایہ کاری کی ہے جو انتہا پسندانہ مواد کو اس سے پہلے ہی روک دے جب وہ سائٹ پر شائع ہونے والا ہو، یعنی اسے پیشگی جانچ کے مرحلے میں ہی پکڑ لیا جائے۔

داعش سے وابستہ ذہین ٹیکنالوجی ماہرین نے ان رکاوٹوں کے باوجود ایسے طریقے ڈھونڈ نکالے جن کی مدد سے وہ مسلسل آن لائن مواد شائع کرتے رہے۔ برطانیہ نے حال ہی میں آن لائن دہشت گردی کے خلاف اپنی مہم کو دوبارہ تیز کرتے ہوئے اُن سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کے خلاف کارروائی کا آغاز کیا جو دہشت گردانہ پروپیگنڈے کے خلاف کوئی مؤثر قدم نہیں اٹھا رہے تھے۔ فرانسیسی صدر ایمانوئل میکرون نے بھی واضح الفاظ میں کہا ہے کہ وہ ان ٹیکنالوجی کمپنیوں کے خلاف نئے قانونی اقدامات پر غور کریں گے جو نفرت انگیز مواد کو ہٹانے میں ناکام رہتی ہیں۔ تاہم، مقبول خفیہ پیغام رسانی کی ایپ ٹیلیگرام نے اس معاملے میں تعاون کرنے سے انکار کر دیا،

اور مسلسل ایسی سرگرمیوں کے لیے ایک محفوظ پلیٹ فارم بنی رہی۔

داعش کے دار الحکومت کا سقوط

داعش کا دار الحکومت راقہ، جو مشرقی شام میں دریائے فرات کی وادی میں واقع تھا، 17 اکتوبر 2017 کو امریکی حمایت یافتہ شامی ڈیموکریٹک فورسز (SDF) کے ہاتھوں آزاد کرالیا گیا۔ آخری ایام میں داعش کے جنگجو اتحادی افواج کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے خودکش حملہ آوروں کا استعمال کر رہے تھے۔ اس سے قبل تنظیم نے شام کے پالمیر اور عراق کے ہترا جیسے قدیم آثارِ قدیمہ پر قبضہ کر کے وہاں کے کئی اہم تاریخی مقامات کو تباہ کر دیا تھا، کیونکہ ان کے نزدیک یہ اسلامی اصولوں کے خلاف تھے جیسا کہ وہ وہابی تعبیر اسلام سے اخذ کرتے تھے۔

تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ داعش ایک نئے مرحلے کی تیاری کر رہی تھی، جس میں وہ دوبارہ زیر زمین باغی تحریک کی صورت اختیار کرے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی نظریہ محض طاقت سے ختم نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اسے بند رنج اور حکمت سے قابو میں لایا جاسکتا ہے۔ داعش کا اثر ان ناراض سنی آبادیوں میں جڑ پکڑ چکا تھا جو نادانی یا مایوسی کے عالم میں شدت پسند اسلام کو قبول کرنے کے لیے تیار تھیں، بغیر اس کے انجام کو سمجھے۔ داعش کے ہاتھوں راقہ سے بے دخل ہونے کے واقعات میں علامتی اہمیت بھی تھی، کیوں کہ یہ اُن کے خود ساختہ خلافت کا عملی مرکز تھا۔ کبھی یہ شہر تین لاکھ سے زائد نفوس کا مسکن تھا، مگر 2014 کے آغاز میں جب داعش نے کنٹرول سنبھالا تو ہزاروں افراد علاقہ چھوڑ گئے۔ جو لوگ اُن کے سخت گیر اسلام کو ماننے سے انکاری تھے، انہیں اسپورٹس اسٹیڈیم میں سرعام پھانسی دی گئی یا قید کر دیا گیا۔ صرف آخری دو برسوں میں شہر میں محض 20 ہزار کے قریب لوگ باقی رہ گئے تھے۔ تشویش کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ راقہ کے سقوط سے قبل 8 ہزار سے زائد داعش جنگجو جن میں فرانس، بیلجیم، ہالینڈ، جرمنی اور برطانیہ کے شہری شامل تھے، فرار ہو چکے تھے اور ممکنہ طور پر اپنے ممالک واپس نہیں گئے بلکہ دوسرے مقامات کا رخ کر چکے ہیں۔ ان کے اذہان کو اس قدر نفرت سے آلودہ کیا گیا ہے کہ ان کی اصلاح مشکل تصور کی جاتی ہے۔ اگرچہ راقہ، موصل، تکریت اور دیر الزور جیسے تمام علاقوں میں داعش کا ظاہری ڈھانچہ منہدم

ہو چکا ہے، مگر اس کا نظریہ سوشل میڈیا پر اب بھی زندہ ہے اور کئی افراد کو متاثر کر رہا ہے، خاص طور پر اکیلا حملہ آور (lone-wolf attacker) جیسا کہ یکم نومبر 2017 کو نیویارک سٹی کے علاقے لوئر مین ہیٹن میں پیش آیا۔

اس حملے میں ازبک نژاد امیگرنٹ سیف اللہ ساپوف، 29 سالہ نوجوان نے ٹرک کو ہجوم پر چڑھا دیا، جس کے نتیجے میں نو افراد ہلاک اور کئی زخمی ہوئے۔ ایف بی آئی کی تفتیش میں اس نے اعتراف کیا کہ وہ داعش کے پروپیگنڈہ ویڈیوز سے متاثر ہو کر یہ حملہ کرنے پر آمادہ ہوا۔ اس کے موبائل فون سے 90 سے زائد ویڈیوز برآمد ہوئیں جن میں داعش جنگجو قیدیوں کو قتل کرتے، بم بنانے کی تربیت دیتے اور ابوبکر البغدادی کی تقاریر شامل تھیں۔ اس نے خاص طور پر البغدادی کے اُس ویڈیو کا ذکر کیا جس میں وہ دنیا بھر کے مسلمانوں سے سوال کرتا ہے کہ وہ عراق میں مسلمانوں کے قتل عام کے خلاف کیا کر رہے ہیں۔

تنہا دہشت گرد (Lone Wolf Terrorists)

’لون ولف‘ (تنہا بھیڑیا) کی اصطلاح کو 1990 کی دہائی کے اواخر میں دوسفید فام بالادست افراد نام میٹر گر اور اریکس کرٹس نے مقبول بنایا۔ اُن کا مقصد نسل پرست ہم خیال افراد کو اس یا تھا کہ وہ اکیلے ہی پُر تشدد جرائم انجام دیں تاکہ اس قسم کی کارروائیوں میں کسی تنظیم یا گروہ کا براہ راست نام نہ آئے اور پکڑے جانے کا خطرہ کم ہو۔ اسی حکمت عملی کو بعد میں داعش کے میڈیا منتظمین نے اختیار کیا، تاکہ دنیا بھر کے نوجوان مسلمانوں کو انفرادی طور پر جہاد کی راہ پر چلنے کے لیے ترغیب دی جاسکے۔ جو کارروائیاں ایسے افراد اکیلے انجام دیتے ہیں، وہ بسا اوقات داعش کی کسی تنظیمی ہدایت کے بغیر کی جاتی ہیں۔ تاہم، داعش کی قیادت ان حملوں کی ذمہ داری قبول کرتی ہے اور ان حملہ آوروں کو شہید کے طور پر ہیرو بنا کر پیش کرتی ہے۔ عام طور پر، ایسے تنہا دہشت گرد کسی شدت پسند تنظیم سے نظریاتی یا فکری وابستگی رکھتے ہیں، مگر ان کا براہ راست کوئی رابطہ نہیں ہوتا۔ وہ کسی بڑے گروہ سے ہدایات نہیں لیتے، بلکہ مکمل طور پر اپنی سوچ اور منصوبہ بندی کے تحت عمل کرتے ہیں۔ یہی تنہائی اور تنظیمی رابطے کی عدم موجودگی ایسے دہشت گردوں کو سکیورٹی

اداروں اور انسداد ہشت گردی کی ایجنسیوں کے لیے ایک خطرناک چیلنج بنادیتی ہے، کیوں کہ ان کا سراغ لگانا اور پیشگی کارروائی کرنا بے حد مشکل ہو جاتا ہے۔

مسلمان نوجوانوں کی خود ساختہ انتہا پسندی، جو مقامی مساجد، سوشل میڈیا پلیٹ فارمز یا شدت پسند اسلامی تنظیموں کے ذریعے جنم لیتی ہے، تنہا حملہ آور دہشت گردی کے غیر معمولی پھیلاؤ کی چند بڑی وجوہات میں شامل ہے۔ اصل خطرہ اس ایک فرد سے ہوتا ہے جو آپ کے پڑوس میں ہی رہتا ہے۔ وہ انٹرنیٹ پر موجود شدت پسند پیغامات، سوشل میڈیا کی تحریروں یا محلے کی مسجد میں دیے جانے والے خطبوں سے متاثر ہو کر بم تیار کر سکتا ہے اور شہر کے مشہور مقامات پر حملوں کی منصوبہ بندی کر سکتا ہے۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی، بیلجیئم، روس اور سویڈن جیسے ممالک میں ایسے تنہا دہشت گردی کے واقعات رپورٹ ہو چکے ہیں۔ سن 2009 میں ٹیکساس کے فورٹ ہڈ فوجی اڈے پر فائرنگ، مانچسٹر میں موسیقی کے کنسرٹ پر حملہ اور لندن برج پر دہشت گردی جیسے واقعات اس کی مثالیں ہیں۔ ایسے حملہ آوروں کا بروقت سراغ لگانا پولیس اور ایجنسیوں کے لیے ایک بڑا چیلنج ہے، کیونکہ وہ اکثر خفیہ طریقے سے منصوبہ بندی کرتے ہیں اور کسی تنظیم سے براہ راست وابستہ نہیں ہوتے۔ بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ دو بھائی یا ایک ہی خاندان کے افراد مل کر ایسے حملے کی منصوبہ بندی اور عمل درآمد میں شریک ہوتے ہیں، جیسا کہ اسپین، فرانس اور سری لنکا میں ہونے والے حملوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

یورپ (روس کے علاوہ)، امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں تقریباً تین کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ ان میں سے اکثریت ایک رُخنے، قدامت پسند، سخت گیر اور انتہائی رجعتی وہابی۔ سلفی اسلام پر عمل پیرا ہے، جس میں لباس سمیت دیگر معاملات میں سخت پابندیاں شامل ہیں، جو انہیں جدیدیت سے دور رکھتی ہیں۔ اگر وہ جدید دنیا کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ ہونا چاہتے ہیں، جبکہ اسلامی روایات اور عبادات کو بھی محفوظ رکھنا چاہتے ہیں، تو سب سے پہلے انہیں وہابیت کے زہریلے اثرات سے نکال کر اسلام کے اُن ترقی پسند اور پُر امن رجحانات کی طرف لانا ہوگا جو خفی اور صوفی سنی مکاسب فکر کے ذریعے صدیوں تک دنیا بھر میں، حتیٰ کہ خود سعودی عرب میں بھی، پُر امن طریقے سے رائج تھے۔

باب ششم

جہادی تحریک کی انٹرنیٹ کے ذریعے تنظیم

انٹرنیٹ ایک وسیع سائبر اسپیس ہے جو ہر فرد کو مواقع فراہم کرتا ہے۔ یہ ایک طاقتور ذریعہ ہے جو دنیا بھر میں مختلف ذرائع سے معلومات تک انسان کو رسائی دیتا ہے، اور ہر شخص کو اپنی سوچ اور رائے کو کئی طریقوں سے منتقل کرنے کی اجازت دیتا ہے: ایک سے ایک، ایک سے بہت سارے، اور بہت ساروں سے ایک کو۔ یہ ایک ناگزیر تکنیکی معجزہ ہے، جہاں علم اور معلومات کی آزادانہ روانی ممکن ہے۔ لیکن دیگر تمام ٹیکنالوجیوں کی طرح، اس کا استعمال فائدے کے لیے بھی ہو سکتا ہے اور غلط استعمال سے پورے معاشرے کو شدید نقصان بھی پہنچایا جاسکتا ہے۔ ہر سال سوشل میڈیا استعمال کرنے والوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو رہا ہے۔ 2019 تک تقریباً 2.77 ارب افراد سوشل میڈیا استعمال کر رہے تھے۔ اسمارٹ فون ٹیکنالوجی اور انٹرنیٹ کنیکٹیویٹی کے سستے ہونے اور رسائی کے آسان ہونے کے باعث، یہ تعداد مزید تیزی سے بڑھنے کی توقع ہے، اور جلد ہی یہ تین ارب سے تجاوز کر جائے گی۔

جہادی سائبر افواج

وہابی سلفی نظریات کے پیروکار سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کو نہایت ہوشیاری سے استعمال کرتے

ہیں۔ ان کے پاس ”سائبر افواج“ موجود ہیں جو دنیا بھر کے مسلم نوجوانوں کو بھرتی کرنے اور انہیں انتہا پسندی کی طرف مائل کرنے کے لیے سرگرم ہیں۔ سائبر میگزینز القاعدہ اور داعش جیسے گروہوں کے دستخطی ذرائع ابلاغ بن چکے ہیں۔ یہ نئے افراد کی بھرتی، فنڈ جمع کرنے، اور نوجوانوں کے متاثر کن ذہنوں کو جہاد کے لیے آمادہ کرنے کے لیے ایک نہایت مؤثر ذریعہ ہیں۔ القاعدہ نے اپنے ابتدائی دنوں میں بھی انٹرنیٹ کو پروپیگنڈے کے لیے استعمال کرنے کی بھرپور صلاحیت کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کی پہلی ویب سائٹ ”عزام ڈاٹ کام“ 1990 کی دہائی کے آخر میں بنائی گئی تھی۔

”انسپائر“ القاعدہ کا آن لائن میگزین تھا، جو خاص طور پر مغربی دنیا کے سامعین تک رسائی کے لیے انگریزی زبان میں شائع ہوتا تھا۔ اپنے نام کے عین مطابق، اس میگزین نے نوجوانوں کو جہاد کی طرف راغب کرنے میں زبردست کامیابی حاصل کی۔ ”انسپائر“ کے کئی شمارے اس بات کی تفصیلی ہدایات فراہم کرتے تھے کہ کس طرح گھر کے باورچی خانے میں بم تیار کیا جاسکتا ہے اور کس طرح زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کے لیے حملے کیے جاسکتے ہیں۔

القاعدہ کی طرح، دولت اسلامیہ (اسلامک اسٹیٹ) کا بھی ایک آن لائن میگزین ہے جسے ”دابق“ کہا جاتا ہے۔ دولت اسلامیہ اپنے مرکزی کارندوں کی قیادت میں ایک مرکزی مقصد کے تحت مواد کی غیر مرکوز تیاری کے طریقہ کار کو مؤثر طور پر استعمال کرتی ہے تاکہ اپنے پیغام کو فروغ دے اور بھرتی کو ممکن بنائے۔ جولائی 2014 میں اس نے میگزین کے دو خصوصی شمارے جاری کیے، جن کا مقصد جہادی نظریے کی ترویج اور دنیا بھر سے نوجوانوں کو خلافت میں شمولیت کی دعوت دینا تھا۔ ”دابق“ ایک عالمی سامعین کے لیے ترتیب دیا گیا میگزین تھتا اور اسے فرانسیسی، جرمن اور روسی سمیت مختلف زبانوں میں شائع کیا گیا۔ اس میگزین کے تین بنیادی مقاصد تھے: مذہبی، عسکری اور سیاسی۔ اس کا پہلا شمارہ مسلمانوں کو شام میں قائم ہونے والی خلافت میں شامل ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ میگزین کا نام حلب کے قریب واقع ایک چھوٹے سے قصبے ”دابق“ پر رکھا گیا ہے، جس کا ذکر ایک حدیث میں اس مقام کے طور پر کیا گیا ہے جہاں

مسلمانوں اور صلیبیوں کے درمیان ایک عظیم جنگ برپا ہوئی تھی۔ دابق کے پہلے دو شمارے ابو مصعب الزرقاوی (القاعدہ عراق کے بانی) کے ایک قول سے شروع ہوتے ہیں: ”چنگاری یہاں عراق میں سلگ اٹھی ہے، اور اس کی روشنی پھیلتی جائے گی۔“ دوسرے شمارے کا عنوان ”طوفان“ رکھا گیا، جس میں نوٹ کی کشتی کی تصویر دی گئی اور ایک مضمون میں دولتِ اسلامیہ کی جنگ کو طوفان سے تعبیر کیا گیا۔ اس مضمون میں اسلامی خلافت کو نوٹ کی کشتی قرار دیا گیا اور دعویٰ کیا گیا کہ دنیا غرقِ اس طوفان کی لپیٹ میں آ جائے گی۔

اپنے مذہبی اور اعتقادی نظریات کے علاوہ، دابق میگزین نے دولتِ اسلامیہ کی فوجی فتوحات کو بھی بھرپور انداز میں پیش کیا۔ اسے بھرتی کے ایک مؤثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کا مواد منظم طریقے سے اس انداز میں تیار کیا جاتا کہ مختلف علاقوں میں موجود قبل اور مختلف سنی فرقوں کی حمایت حاصل کی جاسکے۔ میگزین میں شامی حکومت، خاص طور پر بشار الاسد کی حکومت کی جانب سے سنی عوام پر ڈھائے جانے والے مظالم کو نہایت مؤثر اور جذباتی انداز میں دکھایا گیا۔ ان مظالم میں عورتوں اور بچوں پر کیے گئے تشدد کو خاص طور پر اجاگر کیا گیا تاکہ سنی عوام کے دلوں میں انتقام کا جذبہ ابھاراجاسکے اور انہیں دولتِ اسلامیہ کی صفوں میں شامل ہونے پر آمادہ کیا جاسکے۔

دولتِ اسلامیہ کے سوشل میڈیا پلیٹ فارمز عموماً اس تنظیم کو ایک ”کامیاب برانڈ“ کے طور پر پیش کرتے تھے، اور نوجوان مرد و خواتین کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے تھے کہ وہ ایک ”منح یاب فریق“ کا حصہ بن رہے ہیں۔ دابق کا تیسرا شمارہ ”ہجرت کی پکار“ (A Call to Hijrah) کے عنوان سے شائع ہوا، جس میں نبی کریم ﷺ کی مکہ سے مدینہ کی ہجرت کا حوالہ دے کر مسلمانوں کو مغربی یورپی ممالک سے جلد از جلد ”خلافت“ کی جانب ہجرت کرنے کی تلقین کی گئی، اس سے پہلے کہ ”یہ دروازے بند ہو جائیں“۔

یہ میگزین نہ صرف عام رضا کاروں اور جنگجوؤں کو بلکہ علماء، قاضیوں، معالجوں، انجینئرز اور فوجی تجربہ رکھنے والے افراد کو خلافت میں شمولیت اور خدمت کی دعوت دیتا تھا۔ اس میں بیت المقدس

جیسے اہم مقامات کی ”کافروں“ سے آزادی کو مستقبل کے اہداف میں شامل بتایا گیا۔

دابق کو جدید معیار کے مطابق شائع کیا جاتا تھا، اور اس کی پیشکش انتہائی دلکش اور پُر اثر ہوتی تھی۔ اس کے مضامین کو بظاہر قرآن وحدیث سے جواز دے کر پیش کیا جاتا، تاکہ دولتِ اسلامیہ کی نظریاتی بنیادوں کو مضبوط کیا جاسکے۔ ان مضامین میں اکثر مسلمانوں کو ترغیب دی جاتی کہ وہ دولتِ اسلامیہ کے قیام و توسیع کی جنگ میں شامل ہوں۔ مثال کے طور پر، دابق کے آٹھویں شمارے کا سرخی تھی: ”شرک کی سرزمین کو چھوڑو اور اسلام کی سرزمین میں آ جاؤ“۔ اس مضمون میں پانچ احادیث دی گئی تھیں جن میں دو درج ذیل تھیں:

1 ”جو کوئی مشرک کے ساتھ جمع ہوتا ہے اور اس کے ساتھ زندگی گزارتا ہے، وہ خود بھی اسی جیسا ہے۔“

2 ”اللہ کسی بھی شخص کے عمل کو قبول نہیں کرتا جب تک وہ مشرکین سے قطع تعلق نہ کر لے اور مسلمانوں میں شامل نہ ہو جائے۔“

اس مضمون میں مغرب کے تصورِ تکثیریت (pluralism) کو رد کیا گیا اور کہا گیا کہ مغربی اسکولز ہر مذہب کے احترام کی تعلیم دیتے ہیں، جبکہ قرآن کے مطابق صرف اسلام ہی برحق دین ہے۔ حالانکہ یہ قرآن کی تعلیمات کی بالکل منہ ضد تشریح ہے، کیونکہ تاریخی طور پر پہلی اسلامی ریاست مدینہ ایسی تھی جہاں یہود و نصاریٰ، مسلمانوں کے ساتھ امن سے رہتے تھے۔ تاہم، دابق نے دولتِ اسلامیہ کی کامیابیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے اور آن لائن شدت پسندی و بھرتیوں میں کلیدی کردار ادا کیا۔ دولتِ اسلامیہ نے دیگر تمام سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کا بھی بھرپور اور ذہانت سے استعمال کیا، جو شاید دنیا کی واحد ایسی دستگاہ تنظیم تھی جو جدید ٹیکنالوجی کو اتنے مؤثر انداز میں استعمال کرنے میں کامیاب ہوئی۔ اس کی مارکیٹنگ مہمات کی وسعت اور مہارت واقعی حیران کن اور مؤثر تھیں۔

ساتبر جہادی بڑے پیمانے پر انٹرنیٹ کا استعمال مغربی حکومتوں اور اداروں پر حملوں کے لیے کرتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو ترغیب دیتے ہیں کہ وہ مغرب کی اہم ویب سائٹس کو ہیک کریں اور انہیں ”جہاد کے 39 اصول“ جیسے دستاویزات کا مطالعہ کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ جہادی فوج نہ

صرف تعداد میں بڑھ رہی ہے بلکہ تکنیکی مہارت میں بھی ترقی کر رہی ہے۔ دولت اسلامیہ سے منسلک برطانوی گروپ ”سائبر خلافت“ جس کی قیادت برطانوی ہیکرا بوحسین البریطانی کر رہے تھے، جو شام چلے گئے تھے، انہوں نے امریکہ کے سینٹرل کمانڈ (US Central Command) کے ٹوئٹر اور یوٹیوب اکاؤنٹس کو ہیک کر کے کنٹرول حاصل کر لیا تھا۔ فرانس میں 2015 کے دہشت گرد حملے کے بعد، جہادی سائبر فورس نے ملک کی تقریباً 20000 ویب سائٹس کو ہیک کیا۔

برطانیہ میں Counter Terrorism Internet Referral Unit (CTIRU) نے مختلف سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کے ساتھ مل کر 72000 سے زائد دہشتگردانہ یا انتہا پسند مواد کو ہٹایا جو خود کمپنیوں کی پالیسیوں کی خلاف ورزی پر مبنی تھے۔ اسی طرح، کئی یورپی اور عرب ممالک نے امریکہ کے ساتھ مل کر ایک اطلاعاتی اتحاد (Information Coalition) تشکیل دیا تاکہ جہادی دہشتگردی کے بڑھتے ہوئے خطرے پر قابو پایا جاسکے۔ مرحوم جمال حسینی، جو العرب نیوز چینل کے جنرل مینیجر تھے، نے اس بات کی نشاندہی کی تھی کہ دولت اسلامیہ (IS) کے عروج کا ایک بڑا سبب عرب دنیا میں انسانی حقوق کے تحفظ کی کمی، جمہوریت کی عدم موجودگی، ناکام حکومتیں، اور تعلیم و سماجی انصاف کے نظام کی خرابی ہے۔

اسامہ بن لادن اُن اولین اسلامی دہشت گردوں میں شامل تھے جنہوں نے نئی ٹیکنالوجی کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا شروع کیا، اور یہ سلسلہ 1997 میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ وہ بخوبی سمجھ چکے تھے کہ ”نئے میڈیا“ کو استعمال کر کے اپنے عالمی جہادی ایجنڈے کو مؤثر انداز میں آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔ 9/11 سے بہت پہلے ہی انہوں نے انٹرنیٹ کا استعمال شروع کر دیا تھا تاکہ اپنے پیغامات دنیا بھر میں پھیلائیں اور ممکنہ جہادی رضا کاروں کو اپنی تنظیم میں شامل کریں۔ شدت پسند تنظیمیں انٹرنیٹ کو عملی مقاصد کے لیے بھی استعمال کرتی رہیں۔

اب یہ بات عوامی سطح پر تسلیم شدہ ہے کہ 9/11 کے حملوں کی زیادہ تر منصوبہ بندی آن لائن پلیٹ فارمز کے ذریعے کی گئی تھی۔ حملہ آوروں نے ایک دوسرے سے انٹرنیٹ کے ذریعے رابطہ

رکھا اور اپنے اہداف کے بارے میں آن لائن تحقیق کی۔ القاعدہ کے رہنما یمن الظواہری نے 2005 میں کہا تھا: ”ہم جنگ میں ہیں اور اس جنگ کا آدھے سے زیادہ حصہ نئے میڈیا میں ہے۔ انٹرنیٹ کی جنگ میں ہم اُمت کے دل و دماغ جیتنے کی دوڑ میں شامل ہیں۔“

آج، دولتِ اسلامیہ (Islamic State) نے سائبر جہاد کو ایک نئے اور اعلیٰ درجے تک پہنچا دیا ہے۔ جامد ویب سائٹس، چیٹ فورمز اور آن لائن میگزینز سے لے کر، انہوں نے انٹرنیٹ کے جدید، تیز رفتار اور انٹرایکٹو سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کا مؤثر استعمال سیکھ لیا ہے۔

القاعدہ اور اس کی ذیلی تنظیمیں انٹرنیٹ کو نہ صرف معلومات پھیلانے کے لیے بلکہ ایک دوسرے سے گمنام طور پر رابطہ قائم رکھنے کے لیے بھی ایک اہم ذریعہ سمجھتی ہیں۔ شام، عراق اور دیگر مقامات پر موجود اسلامی جہادی سوشل میڈیا ایپلیکیشنز کے تمام اقسام کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ دولتِ اسلامیہ نہایت سرگرمی سے بلاگز، انسٹنٹ میسجنگ ایپس، ویڈیو شیئرنگ سائٹس، ٹوئٹر، فیس بک، انسٹاگرام اور واٹس ایپ کا استعمال کرتی ہے۔ تاہم، ٹوئٹر سب سے زیادہ استعمال ہونے والا پلیٹ فارم ہے کیونکہ یہ سستا اور موبائل فون کے لیے موزوں ہے۔ ان کے پوسٹس میں تصاویر، تحریریں اور دیگر پلیٹ فارمز کے لنکس شامل ہوتے ہیں، اور موصول ہونے والے ٹوئٹس کو پورے ایڈریس لسٹ میں موجود افراد کو فارورڈ کیا جاسکتا ہے۔ دولتِ اسلامیہ کے ویب سائٹ رضا کار بہت ہوشیار ہوتے ہیں۔ وہ اپنے مخصوص جنگجوؤں یا حامیوں کے ٹوئٹریڈز کو دیگر سوشل میڈیا پلیٹ فارمز سے مربوط کر کے اپنے پیغامات کو وسیع پیمانے پر پھیلاتے ہیں۔ اکثر اوقات یہ ویب رضا کار کسی شدت پسند کی بیوی یا اسلامی ریاست کی ہمدرد نوجوان خواتین ہوتی ہیں، جو دنیا کے کسی بھی کونے میں مقیم ہو سکتی ہیں۔

انٹرنیٹ کے ذریعے ذہن سازی

یمنی نژاد امریکی مبلغ اور شدت پسند خطیب انور العولقی، جو ایک زمانے میں یمن میں روپوش تھا، انٹرنیٹ کے ذریعے مسلم نوجوانوں کی جہادی ذہن سازی کا ایک مرکزی چہرہ بن چکا تھا۔

امریکی خفیہ ایجنسیوں نے اُسے یمن کے جنوبی علاقے شبوہ میں واقع القاعدہ کے گڑھ میں شناخت کیا، جہاں وہ نوجوان یمنیوں کو جہادی لشکر میں بھرتی کرنے کے مشن پر تھا۔ وہ عبدان نامی ایک گاؤں میں چھپا ہوا تھا، اور جب وہاں سے ایک پک اپ گاڑی میں نکلا، تو اسے نشانہ بنانے کے لیے تین بار ڈرون سے فائر کیا گیا، لیکن حیرت انگیز طور پر تینوں حملے چوک گئے اور وہ بچ نکلا۔

العولقی نے اپنی زندگی کے آخری دو سال جسمانی طور پر توروشی میں گزارے، لیکن آن لائن وہ پوری طرح سرگرم رہا۔ وہ ای میلز کے ذریعے پیغامات بھیجتا اور ویب ویڈیوز اپ لوڈ کرتا رہا۔ اس کے انگریزی خطبات کی کئی CD کلیکشنز مارکیٹ میں فروخت ہو رہی تھیں۔ یہ خطبات 1990 کی دہائی کے اواخر میں ریکارڈ کیے گئے تھے، جب وہ سان ڈیگو میں واقع مسجد الرباط الاسلامی کا قابل احترام خطیب مانا جاتا تھا۔ اس کے خطبات کا مرکزی موضوع امریکہ کی داخلی و خارجی پالیسیوں پر تنقید ہوتا تھا۔ اس کا ماننا تھا کہ امریکی پالیسیاں درحقیقت 'طافستور یہودی' لابیوں کے زیر اثر ہیں۔ وہ نوجوان مسلمانوں کا ایک انتہائی پسندیدہ کردار بن چکا تھا کیونکہ وہ اپنے خطبات میں اسلامی تاریخ کے بہادر کرداروں کو جوڑ کر گفتگو کرتا۔ وہ بلاگز لکھتا اور یوٹیوب پر ویڈیوز نشر کرتا، یہاں تک کہ اس کے چینلز بند کر دیے گئے۔ العولقی کہا کرتا تھا کہ جہاد ہر صاحب استطاعت مسلمان پر فرض ہے۔ اس کی تقاریر نے امریکہ، برطانیہ، فرانس اور کینیڈا میں درجنوں افراد کو متاثر کیا اور انہیں اپنے ہی ممالک میں تنہا دہشت گردانہ حملے کرنے پر آمادہ کیا۔

بیشتر مطالعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سوشل میڈیا نوجوان ذہنوں کو متاثر کرنے کے لیے ایک نہایت طاقتور ذریعہ بن چکا ہے، جس کے ذریعے تحریک انگیز مواد سے متاثرہ نوجوانوں کو مخصوص نظریات کی طرف مائل کیا جاسکتا ہے۔ اس عمل میں عموماً قرآن اور احادیث کی وہابی تعبیر کو استعمال کیا جاتا ہے، جس کے نتیجے میں ایک نوجوان، جو پہلے ایک عام دیندار مسلمان ہوتا ہے، دیگر مذاہب کے لیے عدم برداشت اور سخت رویے کا شکار بن جاتا ہے۔ اوپن فورمز اور چیٹ رومز ایسے پلیٹ فارمز بن چکے ہیں جہاں نوجوان اپنے موجودہ نظریات کی تصدیق اور ہم خیال افراد سے

حوصلہ افزائی حاصل کرتے ہیں۔ آج کے دور میں جہادی اور انتہا پسند نظریات کے حامی افراد بغیر کسی روک ٹوک کے سوشل میڈیا پر ویڈیوز، ہدایاتی مواد اور مذہبی شدت پسندی پر مبنی پروپیگنڈا شائع کرتے ہیں، جن کا مقصد نوجوانوں کی بھرتی اور دہشت گردی کے منصوبوں کے لیے شراکت داری قائم کرنا ہوتا ہے۔

آج کے مسلمان نوجوان، جیسے کہ دیگر لوگ، انٹرنیٹ کے ماحول میں پلتے بڑھتے ہیں اور ان کی سوشل زندگی کا بڑا حصہ آن لائن ہی گزرتا ہے۔ انتہا پسندی سے متعلق مختلف تحقیقات یہ بتاتی ہیں کہ صرف آن لائن موجود شدت پسند مواد، بذاتِ خود کسی کو مکمل طور پر شدت پسند نہیں بناتا، بلکہ یہ مواد آف لائن شدت پسند عناصر کے اثرات کو مضبوط بناتا ہے، بھرتی کے عمل کو تیز کرتا ہے، اور بالآخر دہشت گردانہ اقدام پر آمادہ کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

آج دنیا کے کسی بھی کونے میں موجود کوئی نوجوان مسلمان، جو عمر میں نوجوان ہو، اگر اسلامی ریاست کے نظریے کے بارے میں جاننے کی خواہش رکھتا ہو، تو وہ بس انٹرنیٹ کھول کر کسی جہادی عالم یا مبلغ سے رابطہ کر سکتا ہے، جو اسلامی جہاد کے فضائل پر گفتگو کرے گا۔ اگر اُسے یہ باتیں دلچسپ اور پرکشش لگیں، تو وہ آسانی سے اس راہ پر چل نکل سکتا ہے اور یہ سب کچھ اس کے والدین کو علم ہوئے بغیر ممکن ہوتا ہے، کیونکہ اکثر اوقات والدین بھی ایک منقطع اور بے خبر زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ یہ نوجوان مختلف سوشل نیٹ ورکس جیسے ASKfm پر سرگرم ہو سکتا ہے یا پھر مقامی مسجدوں سے جڑ سکتا ہے، جہاں کا علما طبقہ پہلے ہی شدت پسندی کے خیالات سے متاثر ہوتا ہے اور نوجوانوں کو اسلام کی خدمت میں جہاد کے لیے تیار کرنے کا کام انجام دیتا ہے۔

بہت سے اسکالرز کا ماننا ہے کہ آج کے دور میں، خواہ مسلمان اکثریتی ممالک میں رہتے ہوں یا مغربی جمہوریتوں جیسے اقلیت میں، وہ ایک شدید شناختی بحران کا شکار ہیں، ایسا بحران جو اسلامی تاریخ میں پہلے کبھی اس شدت سے نہیں دیکھا گیا۔ مسلمانوں کو اکثر تحقیر آمیز نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اور ان کے مذہب کی بنیاد پر کڑی جانچ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خبروں کے ذرائع مسلسل ایسے واقعات سے بھرے ہوتے ہیں جن میں خود کش بمباروں کے ذریعے کثیر الثقافتی یا کثیر

المذہب معاشروں میں تباہی مچانے کی خبریں شامل ہوتی ہیں۔ مسلم اکثریتی ممالک جیسے یمن، پاکستان، مالی اور شام میں یہ خودکش حملے اور ہلاکتیں فرقہ وارانہ بنیادوں پر انجام دی جاتی ہیں۔ ایسے حالات نے بہت سے مسلم نوجوانوں کو اندر کی طرف جھانکنے پر مجبور کر دیا ہے۔ وہ خود سے یہ سوال کرنے لگے ہیں کہ اکیسویں صدی کے گلوبلائزڈ اور باہم مربوط دنیا میں مسلمان ہونے کا مطلب کیا ہے؟ وہ دراصل اس بنیادی سوال کا بھی جواب تلاش کر رہے ہیں کہ مذہب اور ثقافت میں فرق کیا ہے؟

2011 میں عرب بہار (Arab Spring) کے بعد عرب جزیرہ نما کے کئی ممالک میں مایوسی اور غصہ ایک روزمرہ کا تجربہ بن گیا۔ مشرق وسطیٰ فرقہ وارانہ بنیادوں پر مزید تقسیم ہونے لگا۔ ان کے حکمران ایسے انتہا پسند نظریات سے متاثر ہو گئے جو سلطنت عثمانیہ کے زوال کے بعد کبھی اس شدت سے غالب نہ تھے۔ عراق، شام، یمن اور صومالیہ جیسے ممالک میں عدم استحکام اور جنگوں نے مشرق وسطیٰ کے اندر اور یورپی ممالک کی طرف بڑے پیمانے پر ہجرت کو جنم دیا۔ پناہ گزین کیمپوں میں بھرتی کرنے والے عناصر نوجوان اور کمزور ذہنوں کو نشانہ بنا رہے تھے۔ وہ عراق، چیچنیا، لیبیا اور شام کی شورشوں سے جنگجو تلاش کرتے تھے۔ مسلم دنیا میں نوجوان ناراض افراد کی کمی نہیں ہے۔ مغربی ممالک میں، داعش نے ان مسلمان تارکین وطن کو نشانہ بنایا جو کبھی مرکزی دھارے کی معاشرت میں ضم نہ ہو سکے اور اسلاموفوبیا کا سامنا کرتے رہے۔ انہیں انوث، ان کے کام کا معاوضہ، اور ایک خلافت کی پیشکش کی گئی۔

اسلامی ریاست کی تنگ نظری اور بربریت، جس کی جڑیں وہابیت میں پیوست ہیں، کوئی نئی بات نہیں تھی۔ 1744 میں جب محمد بن عبدالوہاب کے ساتھ تاریخی معاہدہ طے پایا، تو سعودی امیر ابن سعود نے اس نئے نظریہ اسلام یعنی وہابیت کو فروغ دینا شروع کیا، جس کا نام عبدالوہاب کے نام پر رکھا گیا تھا۔ نجد کے علاقوں کو عبدالوہاب کی سخت گیر سوچ اور آل سعود کے جنگجوؤں نے شدید ظلم و ستم کا نشانہ بنایا۔ تمام مسلمانوں کو صحراوی اسلام کے اس سخت اور عدم برداشت والے تصور کو قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔

28 جون 2014 کو، رمضان کے پہلے دن، اسلامی ریاست کے ترجمان ابو محمد العدنانی نے اکیسویں صدی کی خلافتِ اسلامیہ کے قیام کا اعلان کیا۔ 4 جولائی کو، اسلامی ریاست کے رہنما ابو بکر البغدادی نے خود کو خلیفہ ابراہیم کہہ کر موصل کی تاریخی نویں صدی کی النوری مسجد میں ایک اچانک خطبہ دیا، جو اب کھنڈر بن چکی ہے۔ اس نے خود کو ”خدا کے حکم سے حکمرانی کرنے والا“ قرار دیتے ہوئے ”امیر المؤمنین“ اور خلافتِ اسلامیہ کا خلیفہ متعین کیا۔ اس کے جمعہ کے خطبے کی تصاویر سب سے پہلے ٹوئٹر پر جاری کی گئیں اور پھر اس کی مکمل ویڈیو یوٹیوب پر اپلوڈ کی گئی، جس کے بعد عالمی میڈیا نے اس خبر کو بھرپور انداز میں شائع کیا۔

اسلامی ریاست کی میڈیا مہم کی نگرانی ابو عمر الشامی نے کی، جو سعودی عرب میں پیدا ہونے والا ایک شامی شہری تھا اور اس سے پہلے حلب میں اسلامی ریاست کا سربراہ رہ چکا تھا۔ اسلامی ریاست کی سوشل میڈیا کی سرگرمیوں کو غیر مرکوز انداز میں منظم کرنے کی صلاحیت ہمیشہ سے اس کی بڑی طاقت رہی ہے۔ یہی حکمتِ عملی اس کے حامیوں کو یہ اجازت دیتی ہے کہ وہ اپنی اپنی اطلاعاتی وزارتیں چلا سکیں۔ درحقیقت، غیر مرکوزیت (Decentralization) دہشت گرد تنظیموں کے رہنماؤں کی بقاء کے لیے ناگزیر ہے۔ اسلامی ریاست اب کسی مخصوص رہنما کی پہچان نہیں رہی، بلکہ اس کا نظریہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے میں پھیل چکا ہے۔ یہی اس کی غیر مرکوز ساخت کا ثبوت ہے۔ اسلامی ریاست اور اس کا نظریہ اب بالکل نیا برانڈ بن چکا ہے، اور کوئی بھی فرد اس کا حصہ بن سکتا ہے۔ اب کسی مرکزی قیادت سے ملاقات یا دعاؤں کے حصول کے لیے کسی مخصوص جگہ جانے کی ضرورت نہیں رہی۔ یہ تنظیم اب نیچے سے اوپر (bottom-up) کی سمت میں کام کر رہی ہے، جہاں ہر شخص خود سے شامل ہو سکتا ہے اور اسے تنظیمی مرکز سے براہِ راست وابستگی کی بھی ضرورت نہیں۔

کی بورڈ جنگجو

اسلامی ریاست کے سینکڑوں اور ہزاروں رضا کار دنیا بھر میں انٹرنیٹ فورمز اور سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کو اپناتے ہیں تاکہ ایک مجازی یا وائرلیس خلافت قائم کی جاسکے جو نہ صرف زمینی

دشمنوں سے برسرِ پیکار ہو بلکہ انٹرنیٹ پر بھی اپنی جنگ جاری رکھے۔ ایسے افراد کو بجا طور پر ”کی بورڈ کے جنگجو“ کہا جاسکتا ہے۔ یہ لوگ گالمِ گلوچ کرتے ہیں، دھمکیاں دیتے ہیں، اور سب سے بدتر یہ کہ وہ دوسروں پر ”تکفیز“ کرتے ہیں یعنی جوان کے خیالات سے متفق نہ ہو یا ان پر تنقید کرے، اسے کافر قرار دے دیتے ہیں۔

یہ ”کی بورڈ جنگجو“ نہایت چالاک ہوتے ہیں، جو زمین پر قدم رکھنے سے پہلے ہی خوف و دہشت کی ٹوئیس پھیلا دیتے ہیں۔ سن 2000 کی دہائی کے اوائل میں چیٹ رومز اور مباحثہ فورمز کو ان گروہوں نے وسیع پیمانے پر استعمال کیا، جبکہ آج کل بہت سی شدت پسند تنظیمیں انٹرنیٹ کی تاریک دنیا (Dark Web) میں سرگرم ہیں، جہاں رکنیت، شناختی توثیق (authentication)، اور پاس ورڈز کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان چیٹ رومز کے راستے اکثر شدت پسند گروہوں اور ان کے حامیوں کے سوشل میڈیا اکاؤنٹس سے ملتے ہیں، اور نو جوان صارفین سوشل میڈیا کے ذریعے ان فورمز تک پہنچ جاتے ہیں۔ زیادہ تر سوشل میڈیا پلیٹ فارمز صارفین کو تبصرے پوسٹ کرنے کی اجازت دیتے ہیں، جو کہ شدت پسند خیالات کے تبادلے کے لیے ایک مشترکہ جگہ فراہم کرتے ہیں۔

الفرقان داعش کا سرکاری میڈیا ونگ ہے، جو اپنی قیادت کے پیغامات، حامیوں کی ٹوئیس اور دیگر مواد شائع کرتا ہے۔ ان سوشل میڈیا پیغامات کی عالمی رسائی اور اثر پذیری حیران کن ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ سن 2020 کی پہلی سہ ماہی تک فیس بک کے ماہانہ 2.6 ارب سے زائد فعال صارفین تھے۔ یہ ایک ایسا پلیٹ فارم بن چکا ہے جہاں سے معلومات کا غیر مسرکوز طریقے سے پھیلاؤ ہوتا ہے اور اسے حمایت، احتجاج اور سبکدوشی کے اظہار کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ شام میں موجود غیر ملکی جنگجو فیس بک پیجیز کے ذریعے اپنے دوستوں کو داعش میں شامل ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ اسی طرح ٹوئٹر کو بھی اسلامی ریاست اور اس کے عالمی حامیوں نے بڑے پیمانے پر استعمال کیا ہے۔ مئی 2020 تک ٹوئٹر کے 33 کروڑ ماہانہ اور 14.5 کروڑ یومیہ فعال صارفین تھے۔ جہادی گروہ ٹوئٹر کو براہِ راست مکالمے، مباحثے، اشتعال انگیزی اور احتجاجی

مہمات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان کی ٹوئٹس اکثر اعلیٰ درجے کی انگریزی میں لکھی ہوتی ہیں، بعض اوقات دولسانی (bilingual) ہوتی ہیں، اور بعض اوقات دیگر زبانوں میں بھی دستیاب ہوتی ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ سامعین تک پہنچا جاسکے۔

اسلامی ریاست (داعش) نے ٹوئٹر پر دیگر شدت پسند گروہوں کے مقابلے میں اپنی الگ پہچان بنائی ہے۔ یہ گروہ اپنے مخصوص ہیش ٹیگز کے ذریعے اپنی شناخت قائم کرتا ہے اور کبھی کبھار مقبول اور ٹریڈنگ ٹاپکس کو بھی اپنے فائدے کے لیے ہائی جیک کر لیتا ہے۔ مثال کے طور پر، 2014 کے فٹبال ورلڈ کپ کے دوران #Brazil_2014 جیسے ہیش ٹیگز کو اپنی تشہیری مہم سے منسلک کیا گیا تاکہ زیادہ سے زیادہ ناظرین تک رسائی حاصل ہو سکے۔ داعش نے نہ صرف پیغامات کے خفیہ نظام کو پیچیدہ بنایا بلکہ اس نے اپنی مخصوص ایپلیکیشنز بھی تیار کیں، جن میں 'Dawn of Glad Tidings' نامی ایپ شامل ہے، جو گوگل پلے اسٹور پر دستیاب تھی۔ یہ ایپ ایک مرکزی نظام کو اجازت دیتی تھی کہ وہ صارفین کے ذاتی ٹوئٹر اکاؤنٹس سے اپنی مرضی کے ٹوئٹس پوسٹ کرے، جس کے ذریعے ان سب کو داعش کے حمایتی نیٹ ورک سے جوڑا جاسکتا تھا۔ یہ ٹوئٹس داعش کا سوشل میڈیا منیجر تیار کرتا تھا اور ان کے ساتھ روابط، ہیش ٹیگز اور تصاویر بھی شامل کی جاتی تھیں۔ اسمارٹ حکمت عملی کے تحت، ان مرکزی پیغامات کو مقررہ وقفوں کے ساتھ پوسٹ کیا جاتا تھا تاکہ اسپام ڈیٹیکشن الگوریتمز کو چکمہ دیا جاسکے۔ داعش کے جنگجو لڑائی کے دوران براہ راست ٹویٹ کرتے تھے، جن میں ہلاکتوں، زخمیوں اور فتح کی خبریں بھی شامل ہوتیں۔

اسلامی ریاست کے پاس متعدد اقسام کے سوشل میڈیا اکاؤنٹس موجود ہیں، جن میں سرکاری، غیر سرکاری اور علاقائی اکاؤنٹس شامل ہیں۔ ان پر مخصوص افراد اپنی علاقائی سطح سے براہ راست معلومات فراہم کرتے ہیں۔ اسلامی ریاست ایک ایسا منفرد دہشت گرد گروہ ہے، جس نے دنیا کی پہلی سوشل میڈیا جنگ چھیڑی، جس میں بعض افراد روزانہ 250 سے زائد بار پوسٹ کرتے ہیں، اور ان کی پوسٹس کو ہزاروں کی تعداد میں لوگ فالو کرتے ہیں۔

اسلامی ریاست کے گروہ ٹوئٹر جیسے سوشل نیٹ ورکنگ پلیٹ فارمز کو مکمل طور پر اپنے مفاد میں

استعمال کرتے ہیں۔ اس کے ذریعے انھیں براہ راست، بلا معاوضہ تشہیر حاصل ہوتی ہے۔ ان کے نشانے پر عمومی طور پر مغربی ادارے، الیکٹرانک میڈیا اور وہ لوگ ہوتے ہیں جو کسی بروقت شدت پسند ٹویٹ پر ردِ عمل ظاہر کرتے ہیں۔ شدت پسند ٹوئٹر کا استعمال جعلی خبروں کے پھیلاؤ کے لیے بھی کرتے ہیں تاکہ مداحوں کو بھایا جاسکے اور ان کی ہمدردیاں حاصل کی جاسکیں۔ کئی مواقع پر دیکھا گیا کہ مین اسٹریم میڈیا نے دہشت گردوں کی جانب سے کی گئی ٹوئٹس کو اصل خبروں کا ماخذ سمجھ کر نشر کر دیا۔

یہ بات عام طور پر تسلیم شدہ ہے کہ اسلامی ریاست ٹوئٹر کی دلدادہ ہے۔ کئی سالوں تک، اس کے حامیوں نے آزادی اظہار کے پردے میں اس پلیٹ فارم کو ہائی چیک کیے رکھا اور بلا روک ٹوک اپنے شدت پسندانہ مواد کی تشہیر کرتے رہے۔ حیرت انگیز طور پر، ٹوئٹر انتظامیہ کی جانب سے عدم کارروائی نے اس پلیٹ فارم پر اسلامی ریاست کی مضبوط موجودگی کو جنم دیا۔ ٹوئٹر کا موقف ہے کہ کسی بھی شدت پسند اکاؤنٹ یا مواد کو ہٹانے سے پہلے واضح شواہد درکار ہوتے ہیں۔ تاہم، سنہ 2015 کے وسط سے ٹوئٹر نے 125000 سے زائد اکاؤنٹس معطل کیے، جن پر ”دہشت گردی کو فروغ دینے“ کا الزام تھا اور جن کا تعلق زیادہ تر اسلامی ریاست سے تھا۔ ایسا جب بھی ہوتا ہے، اسلامی ریاست کو اپنے فالورز کا نیٹ ورک دوبارہ سے قائم کرنا پڑتا ہے، جس سے ان کی سرگرمیوں میں خلل واقع ہوتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس، اسلامی ریاست کی ٹوئٹس انٹیلی جنس ایجنسیوں کے لیے معلوماتی ذریعہ بھی بن سکتی ہیں، جو شدت پسندوں کی سرگرمیوں کا سراغ لگانے میں مدد دیتی ہیں۔

امریکی انٹیلی جنس اہلکاروں نے اس ویب سائٹ کو ”غیر ملکی جنگجو نیٹ ورکس کے بارے میں معلومات کا خزانہ“ قرار دیا ہے۔ درحقیقت، امریکی محکمہ خارجہ خود بھی ٹوئٹر کو شدت پسندی کے خلاف مہم کے لیے استعمال کرتا ہے، جس کا عنوان ہے: ”Think Again Turn Away“۔ اس مہم کا مقصد اسلامی ریاست کو گمراہ کرنا اور اس کی بھرتی کی کوششوں کو ناکام بنانا ہے۔ ٹوئٹر کے قواعد کے مطابق، تشدد کی دھمکی، ہراسانی اور دیگر بدسلوکی پر مبنی مواد کی ممانعت ہے،

اور سرکاری ایجنسیاں یا قانون نافذ کرنے والے ادارے اگر چاہیں تو ایسا قابل اعتراض مواد ہٹانے کی درخواست کر سکتے ہیں۔

گزشتہ برسوں میں، ٹوئٹر نے کئی ایسے اکاؤنٹس کو بند کیا ہے جنہوں نے خوفناک تصاویر یا پرتشدد ویڈیوز شیئر کی تھیں۔ اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ٹوئٹر ایک عوامی چوراہا بن چکا ہے، جہاں ہر کوئی اپنے اسمارٹ فون سے براہ راست ایک وسیع تر سامعین تک پہنچ سکتا ہے، اور اس کی نگرانی کم ہی کی جاتی ہے۔

اسلامی ریاست یوٹیوب کا بھی بھرپور استعمال کرتی ہے۔ یہ آن لائن ویڈیو شیئرنگ پلیٹ فارم نہ صرف دلکش ہے بلکہ اس کے لنکس کو دوسرے پلیٹ فارمز پر شیئر کرنا بھی نہایت آسان ہوتا ہے۔ اسے دنیا بھر میں دوا رب سے زائد انٹرنیٹ صارفین دیکھتے ہیں۔ تاہم، یوٹیوب پر ہر روز جو بے شمار ویڈیوز اپلوڈ ہوتی ہیں، ان سب کی نگرانی ممکن نہیں۔ یہ پلیٹ فارم، جو گوگل کا ذیلی ادارہ ہے، خود یہ تسلیم کرتا ہے کہ وہ تمام مواد کو فائبر نہیں کر سکتا؛ کبھی کبھار شدت پسندانہ ویڈیوز کو ہٹا بھی دیا جاتا ہے، تو فوراً نئی ویڈیوز ان کی جگہ لے لیتی ہیں۔

اسی طرح، ویڈیو گیمز بھی ایک اور ذریعہ بن چکی ہیں جہادی بھرتی کی مہم کو فروغ دینے کا۔ اسلامی ریاست نے 2012 کے مقبول ترین ویڈیو گیم ”گرینڈ تھیفٹ آؤ“ کو اپنا رنگ دے کر اس کا اپنا ورژن بنایا، تاکہ کھلاڑی اسلامی ریاست کے جنگجوؤں کے کردار میں آکر دشمنوں کے خلاف فرضی جنگ لڑ سکیں۔ تاہم، یہ ایک تلخ سچائی ہے کہ اسلامی ریاست انہی مغربی ویڈیو گیمز کو استعمال کر رہی ہے جن کے وہ شدید مخالف ہیں۔

یورپ میں انٹیلی جنس اور سیکیورٹی بائیوانفارمیٹکس پر پہلی کانفرنس 2008 میں ڈنمارک کے شہر ایس بیئرگ میں منعقد ہوئی، جس میں انکشاف کیا گیا کہ 50 فیصد جہادی ویڈیوز میں شہادت کے فضائل دکھائے گئے تھے، جب کہ 30 فیصد میں خود کش دھماکوں کے مناظر شامل تھے۔ باقی ویڈیوز میں وہابی اور سلفی لٹریچر اور مؤمنین کو جہاد کی دعوت شامل تھی۔

الحیات میڈیا سینٹر اسلامی ریاست (داعش) کا میڈیا ونگ ہے، جو ویڈیو مواد تیار کرتا ہے۔

جولائی 2014 میں، جب داعش نے موصل (جس کی آبادی 15 لاکھ تھی) پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا، اس سے پہلے ایک فلم جاری کی گئی جس کا نام ہے: ”The Clanging of the Sword“۔ یہ فلم نہایت ذہانت سے بنائی گئی تھی، جس میں سلوموشن گرافکس اور فضائی ڈرون فوٹیج شامل تھی، تاکہ عراقی فوجیوں کو خوفزدہ اور مایوس کیا جاسکے۔ فلم میں بڑے سیاہ جھنڈے لہراتے ہوئے مناظر بھی شامل کیے گئے تھے، تاکہ مخالفین پر رعب طاری ہو اور وہ بھاگنے پر مجبور ہو جائیں۔ یہ ویڈیو Justpaste.it پر اپ لوڈ کی گئی اور فوراً یوٹیوب کے کئی اکاؤنٹس پر شیئر کر دی گئی۔ الحدیث نے ایک ہی دن میں 40000 سے زائد ٹویٹس کیے، جس وقت داعش کے جنگجو موصل کی جانب پیش قدمی کر رہے تھے۔ یہ عراق کا دوسرا سب سے اہم شہر تھا، جس پر انہوں نے قبضہ کر لیا۔ میڈیا سینٹر نے بھرتی کے لیے کئی دلکش مواد بھی تیار کیے۔ اس نے ایک ایچ ڈی پروپیگنڈا سیریز Mujatweets کے نام سے نشر کی، جس میں عراق اور شام میں لڑنے والے جنگجوؤں کی روزمرہ زندگی کو نہایت حقیقت پسندانہ مگر متاثر کن انداز میں پیش کیا گیا۔ اس میں یورپی جنگجوؤں کے مثبت تاثرات بھی شامل کیے گئے تھے، جو پہلے سے وہاں موجود تھے۔

ستمبر 2014 میں، اسلامی ریاست (داعش) کے طرز پر ایک ویڈیو یکم منظر عام پر آیا۔ یہ یکم مشہور ویڈیو یکم سیریز ”گریڈ ٹھیفٹ آؤ“ پر مبنی تھا۔ اس میں کھلاڑیوں کو داعشی جنگجوؤں جیسا لباس پہنایا گیا تھا اور ان کا کام تھا کہ پولیس پر فائرنگ کریں اور فوجی اہداف کو دھماکوں سے اڑائیں۔ اسی مہینے، داعش کی طرف سے ایک طویل ویڈیو جاری کی گئی، جس میں شام کے طبقہائیز بیس پر آخری حملہ دکھایا گیا تھا۔ ویڈیو میں داعش کے جنگجو خود کار ہتھیاروں سے ان سینکڑوں شامی فوجیوں پر گولیاں برساتے نظر آتے ہیں جو کھلے میدان میں اڈے سے فرار ہو رہے تھے۔ ویڈیو کے اختتام پر، ان فوجیوں کو قہر کے ریگستان میں لے جایا جاتا ہے، جہاں ایک کھلے میدان میں انہیں قریب سے گولیاں مار کر ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ اکتوبر میں ایک اور ویڈیو جاری کی گئی، جس میں برطانوی یرغمالی ایلن ہیننگ کا سر قلم کیا گیا۔ اس ویڈیو کا عنوان ہے: Another Message to America and Its Allies (امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے نام

ایک اور پیغام)۔ ویڈیو میں ہیننگ کو داعش کا تحریری بیان پڑھتے دکھایا گیا: ”ہماری پارلیمنٹ نے اسلامی ریاست پر حملے کا فیصلہ کیا، اس لیے بطور برطانوی شہری مجھے اب اس کی قیمت چکانی ہوگی۔“ ایک پچھلی ویڈیو میں ”جہادی جان“ نامی جنگجو، برطانوی لہجے میں بولتے ہوئے نظر آتا ہے: ”ڈیوڈ ہینز کا خون تمہارے ہاتھوں پر ہے، کیمرن۔ ایلن ہیننگ بھی ذبح کیا جائے گا، لیکن اس کا خون برطانوی پارلیمنٹ کے ہاتھوں پر ہوگا۔“ یاد رہے کہ ستمبر کے آغاز میں برطانوی پارلیمنٹ نے عراق میں داعش پر فضائی حملوں کی منظوری دی تھی۔ اس کے بعد، داعش نے دو امریکی اور دو برطانوی زیرغلیوں کو بے دردی سے قتل کر کے مغربی طاقتوں کو چونکا دیا اور سوا کیا۔ انہوں نے دنیا کو مزید شرمندہ کیا جب شمالی عراق میں یزیدیوں کی بڑی تعداد کو جبراً بے دخل کیا گیا اور ساتھ ہی دیگر وسیع پیمانے پر جنگی جرائم کا ارتکاب کیا گیا، جن میں خاص طور پر یزیدی خواتین اور بچوں کے خلاف جنسی بنیاد پر کیے گئے مظالم شامل تھے۔ ان جرائم کی تصاویر اور ویڈیوز انٹرنیٹ، پرنٹ اور ٹی وی میڈیا پر مسلسل گردش کرتی رہیں۔ نوجوان یزیدی لڑکیوں کو داعش کے جنگجوؤں نے جنسی غلامی کے لیے استعمال کیا۔

داعش کے آن لائن میگزین ”دابق“ کے 12 اکتوبر 2014 کے شمارے میں یزیدیوں کو مشرک قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ انہیں غلام بنایا جاسکتا ہے، حتیٰ کہ لونڈی بھی بنایا جاسکتا ہے۔ ایک اور خوفناک ویڈیو نے سوشل میڈیا پر تہلکہ مچا دیا، جس میں داعش کے جنگجو تین بڑی گاڑیوں کو شام-عراق ہائی وے پر روک کر، ڈرائیوروں کے شناختی کارڈ چیک کرتے ہیں اور ان سے پوچھتے ہیں: ”تم سب شیعہ ہو؟“ انہوں نے جواب دیا: ”نہیں، ہم حمص سے سنی ہیں۔“ اس کے بعد ویڈیو میں دیکھا جاسکتا ہے کہ داعش کے جنگجو ان افراد کو ایک امتحان سے گزارتے ہیں تاکہ یہ تصدیق کی جاسکے کہ وہ واقعی سنی ہیں یا نہیں۔ آخر کار وہ انہیں شام سے تعلق رکھنے والے علوی شیعہ قرار دیتے ہیں اور سڑک کنارے قریب سے گولیاں مار کر قتل کر دیتے ہیں۔ یہ بے ہودہ اور سنگدلانہ مظالم اس بات کا کھلا ثبوت تھے کہ جہادی سلفیوں کو شیعوں اور دیگر مسلم مکاتب فکر سے کس قدر شدید نفرت ہے، سوائے اپنے وہابی سنی عقیدے کے۔

جہادی خواتین کی طاقت

اکتوبر 2014 میں، داعش نے ”زورہ فاؤنڈیشن“ اور ”الخنساء بریگیڈ“ قائم کیں، جن کا مقصد نوجوان خواتین رضا کاروں کو اپنی صفوں میں شامل کرنا تھا۔ ان کے لیے ایک خصوصی منشور بھی جاری کیا گیا۔ داعش نے دعویٰ کیا کہ خواتین کا تنظیم میں اہم کردار ہے، جن میں ڈاکٹر ز اور نرسز کے فرائض بھی شامل ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ خواتین خلافت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتی ہیں، کیونکہ وہ اسلام پر عمل کرتی ہیں اور اپنے شوہروں کا ساتھ دیتی ہیں، جبکہ ان کے بچوں کی پرورش کرتی ہیں۔ داعش نے خواتین کی بھرتی بھی اسی انداز میں کی جیسے مردوں کی، ایسے افراد کو نشانہ بنایا گیا جو زندگی میں راہ بھٹک چکے تھے اور شناخت و وابستگی کی تلاش میں تھے۔

انٹیلیجنس ذرائع کے مطابق 800 سے زائد خواتین عراق و شام کے داعش کے زیر قبضہ علاقوں میں اپنے شوہروں، والدین یا بعض اوقات بھائیوں کے ہمراہ پہنچیں۔ اکثر کو یہ یقین دلایا گیا کہ وہ ایک انسانی مشن کا حصہ ہیں جس کا مقصد اسلامی خلافت کا قیام ہے۔ کچھ کو مالی ترغیبات بھی دی گئیں، تاکہ اگر ان کے شوہر اسلام کی خدمت میں ہلاک ہو جائیں، تو انہیں شہید کے خاندان کی حیثیت سے معاشی امداد دی جائے گی۔ خواتین کی سب سے بڑی تعداد فرانس، برطانیہ، جرمنی، بیلجیئم اور اسپین جیسے ممالک سے آئی۔ ٹوٹر بھرتی کرنے والوں کا پسندیدہ پلیٹ فارم تھا، جہاں وہ خواتین کو ”اُم“ کے خطاب سے مخاطب کرتے تھے، جو عربی میں ”ماں“ کے لیے اعزاز کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ بھرتی کے لیے بنائے گئے ویب سائٹس میں ایک ایسا امتزاج رکھا گیا تھا جس میں نظریاتی ذہن سازی کے ساتھ ساتھ فتنہ انگیز عناصر بھی شامل تھے، تاکہ وہ جنگجو خلافت میں آکر شادی کرنا چاہتے تھے، انہیں مائل کیا جاسکے۔ یہ نیٹ ورک ز سنگ اور کھانا پکانے کے مشورے بھی دیتا تھا، تاکہ خواتین جہادی شوہروں کو خوش رکھ سکیں۔ اس کے علاوہ شریعت کے متعلق معلومات، اسلحہ چلانے کے طریقے اور سوشل میڈیا کے استعمال کے مشورے بھی دیے جاتے تھے، تاکہ خواتین مزید رضا کار بھرتی کر سکیں۔ داعش سے متاثر ہونے والی زیادہ تر لڑکیوں کی عمر 16 سے 24 سال کے درمیان تھی؛ کچھ رپورٹس کے مطابق 13 سالہ لڑکیاں بھی اس

پروپیگنڈا کا شکار ہوئیں۔ خواتین کو باور کرایا جاتا تھا کہ وہ اسلامی خلافت کو آباد کریں اور وہاں استحکام اور معمولاتِ زندگی کی مثال قائم کریں۔ یہ خواتین پر مشتمل بریگیڈ، داعش کے زیرِ قبضہ علاقوں جیسے موصل اور رقبہ میں سخت شرعی قوانین کے نفاذ کے لیے اخلاقی نگرانی بھی کرتی تھیں۔

داعش کا پروپیگنڈا اس قدر چالاکی سے تیار کیا گیا تھا کہ خواتین اور لڑکیوں کو ایک قسم کے ”بااختیار ہونے“ کا احساس دلاتا تھا۔ یہ مواد بڑی ہوشیاری سے خلافت میں نافذ سخت شرعی قوانین کو چھپاتا، جیسے کہ سر عام سنگساری، جبری لباس کے ضابطے اور معاشی سختیاں۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ داعش نے ایک شادی بیورو بھی قائم کیا تھا تاکہ وہ خواتین جو جہادی جنگجوؤں سے شادی کرنا چاہتی تھیں، ان کی ”مدد“ ہو سکے۔ مگر اسی شادی بیورو کے پردے میں خوفناک جنسی جرائم کا بازار گرم تھا، جو بظاہر صنعتی پیمانے پر انجام دیے جا رہے تھے۔ اقوام متحدہ نے اندازہ لگایا کہ اگست 2014 میں داعش نے 1500 سے زائد خواتین، نو عمر لڑکیوں اور لڑکوں کو جنسی غلامی پر مجبور کیا۔

دو امریکی خواتین کی کہانی حیران کن اور چونکا دینے والی ہے، جنہوں نے باغوز میں ایک دوسرے سے ملاقات کی اور دوستی کر لی، یہ وہ آخری علاقہ تھا جو داعش کے قبضے میں بچا تھا۔ باغوز دریائے فرات کے کنارے پر واقع ایک چھوٹا سا محاصرہ شدہ علاقہ تھا، جو کہ داعش کے زوال کا آخری پڑاؤ بن گیا۔ یاد رہے کہ 2014 میں داعش نے شام و عراق میں ایک وسیع خطے پر قبضہ کر کے ایک بڑی جہادی ریاست کے قیام کا خواب دیکھا تھا، مگر جنوری 2019 تک یہ سکڑ کر چھ مربع میل سے بھی کم رقبہ تک محدود رہ گیا تھا۔

امریکی خواتین کے سفر کا انجام باغوز کے ایک ذلت آمیز خیمے میں ہوا، مگر یہ سفر 2014 میں اُس وقت شروع ہوا جب ان کی آن لائن ذہن سازی کی گئی تاکہ دولتِ اسلامیہ کے جنگجوؤں کی ’جہادی دلہنیں‘ بن سکیں۔ متھانہ، جو یمنی تارکینِ وطن کی بیٹی تھی، ہوور، الاباما میں پیدا ہوئی اور پرورش پائی، اور یونیورسٹی آف الاباما ایٹ برمنگھم سے گریجویشن کیا۔ وہ ایک نہایت قدامت پسند گھرانے میں پلی بڑھی، نہ کوئی پارٹی، نہ دوست، نہ موبائل فون۔ جب اُس نے ہائی اسکول مکمل

کیا، تو اُس کے والد نے اُسے گریجویٹیشن پر ایک فون تحفے میں دیا، جو جلد ہی انتہا پسند اسلام کی دنیا تک اُس کی رسائی کا ذریعہ بن گیا۔

وہ سوشل میڈیا سائٹ ٹویٹر کے ذریعے دولتِ اسلامیہ کی طرف راغب ہوئی۔ 2014 میں، ایک آن لائن رابطہ کار نے اُسے دولتِ اسلامیہ میں شمولیت کے تمام مراحل سمجھائے۔ اُس نے سمسٹر سے دستبرداری اختیار کی اور اپنے والد کی جانب سے ملنے والی فیس کی رقم سے ترکی کا ٹکٹ خرید لیا۔ اُس نے والدین سے کہا کہ وہ تعلیمی مقصد کے تحت اٹلانٹا جا رہی ہے۔ نومبر 2014 میں، اُسے شام کی سرحد سے اسمگل کر کے ایک خواتین کے ڈورمیٹری لے جایا گیا، جہاں دنیا بھر سے سینکڑوں غیر شادی شدہ خواتین موجود تھیں۔ روزانہ ایک دولتِ اسلامیہ کا اہلکار اس ڈورمیٹری میں ایک فہرست لیے گھومتا، جس پر نوجوان جنگجوؤں کے نام ہوتے جو دہن کی تلاش میں ہوتے۔ ان خواتین کو اس وقت تک ڈورمیٹری سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی جب تک ان کی شادی نہ ہو جائے۔ ایک ماہ بعد، متھانہ نے ملبورن سے تعلق رکھنے والے آسٹریلیوی جنگجو سہان رحمان سے ملاقات پر رضامندی ظاہر کی۔ وہ اپنا نام ابو جہاد (یعنی 'جہاد کا باپ') استعمال کرتا تھا۔ دونوں ایک کمرے میں ایک محرم کی موجودگی میں ملے۔ مختصر گفتگو کے بعد، وہ شادی پر متفق ہو گئے اور وہ اُسے اپنے گھر لے گیا۔ متھانہ نے اپنا نام ام جہاد (یعنی 'جہاد کی ماں') رکھ لیا۔ اُس نے سوشل میڈیا پر جہاد کی فعال تبلیغ کی اور اپنے ٹویٹس کے ذریعے مغرب، خصوصاً امریکہ کے خلاف نفرت انگیزی کو ہوا دی۔

تین ماہ بعد، متھانہ کا پہلا شوہر ایک معرکے میں مارا گیا۔ اُس کا دوسرا شوہر موصول میں ہلاک ہوا اور تیسرا رقبہ میں۔ متھانہ بمباری سے بچنے میں خوش نصیب رہی اور فرات دریا کی وادی میں دولتِ اسلامیہ کے زیر قبضہ ایک سے دوسرے علاقے میں منتقل ہوتی رہی۔

کم و بیش یہی انجام کبریٰ پولین کا بھی تھا، جو ایک کینیڈین۔ امریکی خاتون تھی۔ اُس نے اسلام قبول کیا اور جلد ہی آن لائن جہادی بھرتی کرنے والوں کے رابطے میں آ گئی۔ بالآخر وہ 2005 کے اوائل میں شام میں دولتِ اسلامیہ کے نام نہاد خلافتی علاقے میں جا پہنچی۔ اُس کے

پاس نرسنگ کی بنیادی مہارتیں تھیں، چنانچہ جلد ہی اُس کی شادی ایک جنگجو سے کر دی گئی۔ 2005 تک دنیا کو دولتِ اسلامیہ کے بھیانک جرائم کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا جن میں صحافیوں کا سر قلم کرنا، یزیدی خواتین کو غلام بنانا اور اُن کے ساتھ جنسی زیادتی شامل تھے، خاص طور پر عراق کے موصل علاقے میں۔ پولیٹین نے ایک بار ان کے کیمپ سے فرار ہونے کی کوشش کی لیکن بد قسمتی سے پکڑی گئی۔ بعد میں، قید کے دوران، اسے کئی بار دولتِ اسلامیہ کے جنگجوؤں نے جنسی زیادتی کا نشانہ بنایا اور تشدد کا سامنا کرنا پڑا، یہ سب کچھ اُن خواتین کو خوفزدہ کرنے کے لیے کیا جاتا تھا جو فرار ہونے کی کوشش کرتی تھیں۔

وہ کئی بار بمباری سے بچ نکلنے میں کامیاب رہی، کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ دولتِ اسلامیہ کے زیر قبضہ علاقے بتدریج سکڑتے جا رہے تھے۔ بالآخر دونوں امریکی خواتین، متھانہ اور پولمین، دولتِ اسلامیہ کے آخری چھوٹے سے گڑھ باغوز میں پہنچ گئیں، جو جنوری 2019 میں آزاد کرایا گیا۔ امریکی افواج نے جب اس آخری چھ مربع میل کے علاقے کو گھیرے میں لے لیا تو شدید قلتِ راشن اور خوراک کا سامنا ہوا۔ جب کھانے پینے کی اشیاء دستیاب نہ رہیں، تو دونوں خواتین دیگر افراد کے ساتھ فٹ پاتھوں کی دراڑوں سے گھاس اکٹھی کرتیں، اُسے ابال کر کھاتیں۔ بالآخر، دونوں خواتین دیگر شہری خاندانوں کے ساتھ اُس آخری دولتِ اسلامیہ کے گڑھ سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئیں، اور امریکی افواج کے گھیرے میں آ گئیں۔ وہاں انہیں عام شہریوں سے الگ کر کے اُن جہادی دہنوں کے کیمپ میں منتقل کیا گیا جہاں دنیا بھر سے آئی ہوئی ایسی خواتین کو رکھا گیا تھا۔ وہیں انہوں نے اپنی ذاتی داستانیں دی نیو یارک ٹائمز کے نمائندوں کے ساتھ شیئر کیں۔

2011 میں، صدر اوباما اور اُن کی سیکورٹی ٹیم اس بات پر قائل ہو چکی تھی کہ انٹرنیٹ دہشت گرد تنظیم دولتِ اسلامیہ کے لیے ایک مؤثر ہتھیار بن چکا ہے۔ واٹس ہاؤس نے سیلیکون ویلی کی قیادت سے اس بارے میں تبادلہ خیال کیا کہ جہادی عناصر کی انٹرنیٹ تک رسائی کو کس طرح محدود کیا جائے، بغیر اس کے کہ لوگوں کی بنیادی آزادی اظہار اور شخص آزادی پر زبرد پڑے۔ اسی

سال امریکہ نے اپنی پہلی Countering Violent Extremism (CVE) یعنی پر تشدد انتہا پسندی کا مقابلہ کرنے کی حکمت عملی ترتیب دی، جس کا مرکز ایسے تمام ممکنہ دہشت گرد عناصر کی ذہن سازی کو روکنا تھا۔ اس حکمت عملی کا عملی پہلو مقامی شراکت داروں کو با اختیار بنانے کے لیے ”اسٹریٹجک ایملیمنٹیشن پلان“ پر مبنی تھا تا کہ وہ پر تشدد انتہا پسندی کی روک تھام میں مددگار بن سکیں۔ اسی برس، امریکی محکمہ خارجہ نے Center for Strategic Counter-terrorism Communications (CSCC) یعنی مرکز برائے تزویراتی انسداد دہشت گردی ابلاغ بھی قائم کیا، جس کا مقصد انٹرنیٹ پر انتہا پسند عناصر کے ساتھ براہ راست مکالمہ کر کے اُن کے دعوؤں کو چیلنج کرنا اور ممکنہ ہمدردوں کو اُن سے دور رکھنا تھا۔ اس سلسلے میں، Think Again Turn Away کے نام سے ایک ٹوئٹر اکاؤنٹ بھی شروع کیا گیا، جس کا مقصد جہادی جنگجوؤں اور اُن کے حامیوں کے ساتھ سوشل میڈیا پر مباحثہ کر کے اُن کے بیانیے کو غیر مؤثر بنانا تھا۔

اسلامی تعاون تنظیم (OIC)، جو 57 ممالک کے تقریباً 1.6 ارب مسلمانوں کی نمائندگی کرتی ہے، نے دولت اسلامیہ (IS) کے خلاف ایک قرارداد منظور کی، جس میں واضح طور پر کہا گیا کہ ”دولت اسلامیہ کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں“ اور اس نے ایسے جرائم کا ارتکاب کیا ہے جن کی نہ تو کوئی توجیہ دی جاسکتی ہے اور نہ ہی انہیں برداشت کیا جاسکتا ہے۔ 120 سے زائد ممتاز مسلم علما نے ابو بکر البغدادی کو ایک خط لکھا، جس میں انہوں نے کہا کہ اُس نے قرآن اور احادیث کے سیاق و سباق کو نظر انداز کرتے ہوئے اسلام کو غلط انداز میں پیش کیا ہے۔ دراصل، جو اسلام البغدادی نے اپنا یا تھا، وہ اٹھارہویں صدی کے شدت پسند عالم محمد بن عبدالوہاب کی تشدد تعمیر پر مبنی تھا، جسے سعودی عرب کے مذہبی ادارے آج بھی شدت سے فروغ دیتے ہیں۔

عالمی مسلم برادری کو زبردستی یا چالاکي سے اس انتہا پسند، متکبر اور تنگ نظروہابی اسلام کی پیروی پر مجبور کیا جا رہا تھا، جسے سعودی وزارت مذہبی امور نے 1979 کے بعد اپنی بے پناہ مالی طاقت کے بل پر پوری دنیا میں پھیلا یا۔ سعودی عرب کی مذہبی کونسل ”مجلس کبار العلماء“ نے بھی قرآن

مجید کی ایک نہایت سخت گیر اور پسماندہ وہابی۔ سلفی تعبیر اختیار کی، جسے مختلف ثقافتی و مذہبی اداروں کے ذریعے، پٹرول ڈالر کی طاقت سے دنیا بھر میں پھیلا یا جا رہا تھا۔

تاہم سعودی ولی عہد محمد بن سلمان (MBS) اب ایک اعتقادی اور معتدل اسلام کی طرف واپسی کے بارے میں غور کر رہے ہیں، جسے وہ اسلام کی بحالی کی ایک کوشش قرار دیتے ہیں۔ ولی عہد نے ایک ایسے معتدل اور متوازن اسلام کی پرزور وکالت کی ہے جو دنیا کے لیے اور تمام مذاہب و روایات کے لیے کشادہ ہو۔ تاہم، اس تبدیلی کو نافذ کرنا سعودی عرب کے وسیع و عریض مذہبی بیوروکریسی میں ایک بڑی اصلاح کا تقاضا کرتا ہے، جو اس خوف میں مبتلا ہے کہ مملکت اپنی صدیوں پرانی مذہبی اساس کو ترک کر رہی ہے۔

سعودی علما طویل عرصے سے شاہی خاندان کے تابع رہے ہیں، مگر نوجوان شہزادے کے ابھار نے ان کی خود مختاری کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ محمد بن سلمان نے دو ٹوک انداز میں کہا ہے کہ: ”سلفیت کے ان بد صورت پہلوؤں کو جڑ سے ختم کرنے کے لیے سخت اقدامات کیے جائیں گے، جو دنیا بھر میں اسلام میں سرایت کر گئے ہیں؛ یہ امن و خوشحالی کا ایک نیا دور لا سکتا ہے۔“ حقیقتاً، جو کام وہ کر رہے ہیں، وہ وہابیت کو ایک کم سخت، کم جارحانہ اسلام سے تبدیل کرنے کی کوشش ہے، جو سیکولر سعودی قوم پرستی کو قبول کرے، لیکن ایران، فارس اور شیعہ عقائد کے خلاف سخت لہجے کو برقرار رکھے۔ تاہم، اگر ولی عہد نے ایران اور قطر مخالف موقف کو اسی شدت سے جاری رکھا، تو بعید نہیں کہ جلد ہی وہ ایک نہایت پیچیدہ اور مشکل صورتحال سے دوچار ہوں۔

مجازی خلافت

’مجازی خلافت‘ (Virtual Caliphate) کی اصطلاح رفتہ رفتہ مقبول ہوتی جا رہی ہے، اور اس سے مراد اسلامی ریاست (داعش) کی آئندہ حکمت عملی اور رخ ہے۔ عراق اور شام میں داعش کی جسمانی شکست بلاشبہ اہم تھی، کیونکہ اس نے مسلم دنیا میں وہابی سلفیت جیسے تیزی سے پھیلتے عفریت پر کچھ حد تک قابو پانے میں مدد دی۔ تاہم، جنگ کے آخری ایام میں شام کی

فرات وادی سے فرار ہونے والے کئی عرب جنگجو اب یمن اور لیبیا میں پناہ لے چکے ہیں۔ اطلاعات ہیں کہ کچھ جنگجو، جو پہلے شام میں زیر زمین ہو گئے تھے، اب دوبارہ نمودار ہو رہے ہیں اور خفیہ نیٹ ورکس (sleeper cells) تشکیل دے کر جنگ کو نئے سرے سے شروع کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ 'مجازی خلافت' سے مراد ایسے مسلمانوں کی ایک درجہ بند (stratified) برادری ہے، جو شریعت کے قانون پر ایمان رکھتے ہیں اور سائبر اسپیس کے عالمی دائرے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ خلافت اب جغرافیائی ریاست کی بجائے آن لائن نظریاتی ریاست کے طور پر فروغ پا رہی ہے، جہاں پیروکار فاصلے، سرحدوں اور قومیتوں سے آزاد ہو کر محض عقیدے کے رشتے میں بندھے ہوتے ہیں۔

انتہا پسندی کی طرف مائل ہونے کا عمل اکثر کئی برسوں پر محیط ہوتا ہے، لیکن بعض نوجوانوں میں یہ تبدیلی نہایت مختصر عرصے میں بھی رونما ہو جاتی ہے۔ حالیہ برسوں میں مغربی دنیا میں ہونے والے کئی 'تہا حملہ آوروں' (lone wolf) یا 'مجازی بھیڑیوں کے غول' (virtual pack of wolves) کے حملے اس سوال کو جنم دیتے ہیں کہ آیا یہ صرف سوشل میڈیا تک آزادانہ رسائی کی وجہ سے ممکن ہوئے ہیں؟ درحقیقت، جو کوئی اپنے نظریات کی توثیق کا خواہاں ہو، اسے انٹرنیٹ ایسے خیالات کی بازگشت (echo-chamber) کے طور پر میسر آتا ہے، جو پہلے سے اس کے ذہن میں موجود ہوتے ہیں۔

آج کے نوجوان، جو ٹیکنالوجی سے بخوبی واقف اور انگریزی زبان پر عبور رکھتے ہیں، انٹرنیٹ کی بدولت بہت تیزی سے انتہا پسند بن سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دہشت گرد تنظیمیں، بالخصوص اسلامی ریاست (داعش)، سوشل میڈیا کو بہت ہوشیاری سے استعمال کر رہی ہیں تاکہ حساس نوجوانوں کو اپنے دام میں پھنسا یا جاسکے۔ یہ تنظیمیں خوبصورت ویڈیوز، چالاک پیغامات اور ہمدردی پیدا کرنے والے بیانات کے ذریعے نوجوان ذہنوں کو اپنے نظریے کی طرف راغب کرتی ہیں۔ سوشل میڈیا کا استعمال صرف پروپیگنڈے تک محدود نہیں، بلکہ 'لائبر پورٹنگ' کے ذریعے تہا حملوں کی لمحہ بہ لمحہ تفصیلات بھی نشر کی جاتی ہیں۔ جو دہشت گرد اپنے مقصد کے لیے جان

دیتے ہیں، انہیں شہید قرار دے کر سوشل میڈیا پر خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے، اور ان کی کہانیاں وسیع پیمانے پر پھیلائی جاتی ہیں، تاکہ دوسرے نوجوان بھی متاثر ہو کر اسی راہ پر چسل پڑیں۔

انتہا پسندی کی طرف وہ افراد زیادہ مائل ہوتے ہیں جو خود کو نظام سے کٹا ہوا محسوس کرتے ہیں یا سماج کی طرف سے کسی نہ کسی وجہ سے امتیازی سلوک کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ رجحان خاص طور پر مغربی ممالک میں مسلمانوں کے درمیان زیادہ پایا جاتا ہے، جہاں وہ ایک تنہا، محدود اور ثقافتی طور پر الگ تھلگ زندگی گزارتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایسے افراد مظلوموں کے لیے ہمدردی رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ اظہارِ یکجہتی کا جذبہ رکھتے ہیں۔ ان کی ذہنی کیفیت میں مایوسی، ذلت اور نا انصافی کے خلاف شدید غصہ پایا جاتا ہے، لیکن وہ تبدیلی کے لیے کوئی مؤثر راستہ نہیں دیکھ پاتے۔ ایسی ہی ایک مختصر مگر جذباتی لمحہ، مثلاً کسی معصوم مسلمان پر ظلم کی ویڈیو دیکھنا ان کے اندر پر تشدد اقدام کا شعلہ بھڑکا سکتا ہے۔ جب کوئی فرد اس راہ پر قدم رکھتا ہے، تو اس کا اگلا مرحلہ اکثر مختلف جہادی ویب سائٹس کو براؤز کرنا اور اسلام کی ایسی تعبیرات کی تلاش ہوتا ہے جو ان کے نظریے کو مزید جواز فراہم کرے۔ اکثر یہ تلاش انہیں سلفی لٹریچر تک لے جاتی ہے، جو جہاد کے تصور کو سخت گیر انداز میں پیش کرتا ہے۔ جہادی تنظیمیں کسی فرد کی آن لائن سرگرمیوں سے اسے آسانی سے نشانے پر لے لیتی ہیں چاہے وہ تھوڑی سی مالی امداد دے، کوئی شدت پسند لٹریچر ڈاؤنلوڈ کرے، کسی جہادی چیٹ روم میں داخل ہو یا فیس بک پر کوئی شدت پسند صفحہ دیکھے۔ جدید ٹیکنالوجی کی بدولت انتہا پسند عناصر تمام تر تنظیمی اور نظریاتی کام آن لائن ہی مکمل کر لیتے ہیں۔ فیس بک کا موقف ہے کہ وہ ایسے تمام پروفائلز، صفحات یا گروپس کو فوری بند کر دیتا ہے جو کسی جہادی تنظیم سے تعلق رکھتے ہوں یا اسلامی جہاد کی تعریف کرتے ہوں۔ ان کے ترجمان کا کہنا ہے کہ: ”دہشت گردوں کے لیے فیس بک پر کوئی جگہ نہیں ہے۔“ اب تک دیکھا گیا ہے کہ فیس بک عمومی طور پر اس پالیسی پر عمل بھی کر رہا ہے، کیونکہ وہ شدت پسند مواد کو جلد از جلد ہٹا دیتا ہے۔

انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کی جو بنیادی خصوصیات ہیں، وہی اس بات کی وضاحت کرتی ہیں کہ

یہ پلیٹ فارمز دہشت گرد تنظیموں کے لیے اتنے مؤثر کیوں ثابت ہوتے ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ یہ نہایت کم خرچ اور آسان استعمال کے قابل ذرائع ہیں۔ کوئی بھی فرد جعلی شناخت کے پیچھے چھپ کر، گمنام انداز میں اپنا پیغام ایک بڑی تعداد تک پہنچا سکتا ہے۔ یہ پیغام رسانی ایک فرد سے دوسرے فرد تک بھی ہو سکتی ہے اور ایک سے کئی افراد تک بھی، اور ساتھ ہی ساتھ یہ انتہائی انٹرایکٹو بھی ہوتی ہے، یعنی جواب اور مکالمے کی گنجائش بھی موجود رہتی ہے۔ دہشت گرد تنظیمیں ان پلیٹ فارمز کو 'نیر وکاسٹنگ' (narrowcasting) کے لیے بھی استعمال کرتی ہیں، یعنی مخصوص ہدفی گروہوں تک پیغام رسانی، جیسا کہ الشباب تنظیم نے ستمبر 2013 میں نیروبی کے ویسٹ گیٹ شاپنگ مال پر حملے کے دوران مؤثر طور پر کیا۔ آنے والی نسل کے کمپیوٹرز اور مصنوعی ذہانت سے لیس ٹیکنالوجی کے امکانات کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مستقبل میں انٹرنیٹ کا یہی مؤثر اور تیز رفتار استعمال دہشت گرد گروہوں کے لیے اپنا دائرہ اثر بڑھانے اور دنیا کے مختلف حصوں میں حملے کرنے کو اور بھی آسان بنا دے گا۔

آن لائن انتہا پسندی کی روک تھام

ٹیکنالوجی کمپنیوں اور سوشل میڈیا پلیٹ فارمز نے بالآخر آن لائن انتہا پسندی کو روکنے کے لیے اقدامات اٹھانے شروع کر دیے ہیں۔ آن لائن انتہا پسندی کے ماہرین کا کہنا ہے کہ مخصوص اکاؤنٹس یا مواد کو بلاک کر ناوقتی طور پر انتہا پسند گروہوں کو متاثر تو کر سکتا ہے، لیکن اس کے نتیجے میں وہ زیر زمین چلے جاتے ہیں اور مزید خفیہ انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ مسئلے کی جڑ سوشل میڈیا کی عالمی نوعیت، یوزر پر مبنی خود نگرانی کے نظام، اور یہ حقیقت ہے کہ بند کیے گئے اکاؤنٹس دوبارہ نئے ناموں سے کھل جاتے ہیں اور وہی نفرت انگیز مواد دوبارہ پھیلا نا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر سوشل میڈیا پلیٹ فارمز تشدد پر اکسانے والے مواد پر مکمل پابندی لگا دیں، تو اس سے اظہارِ رائے کی آزادی پر سوالات کھڑے ہو سکتے ہیں، کیونکہ جو کسی کے لیے نفرت انگیز پروپیگنڈا ہو، وہ کسی دوسرے کے لیے ”آزادی اظہار“ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ ایک نہایت نازک توازن ہے: انتہا پسندی اور دہشت گردی کی روک تھام اور جمہوری اقدار و آزادیوں کے تحفظ کے درمیان۔ یہی

توازن برقرار رکھنا آج کے ڈیجیٹل دور کی سب سے بڑی اخلاقی اور عملی آزمائش بن چکا ہے۔ اسلامی ریاست کی صرف جغرافیائی شکست کافی نہیں ہے۔ مشرق وسطیٰ میں امریکی فوجی آپریشنز کے سربراہ کے مطابق، اسلامی ریاست کا علاقہ چھن جانا اس بات کی علامت نہیں کہ اس کی نظریاتی بنیادیں ختم ہو چکی ہیں۔ یہ گروہ اب بھی انٹرنیٹ پر موجود اپنے ”مجازی خلافت“ کے ذریعے حملوں کی منصوبہ بندی اور تحریک جاری رکھے ہوئے ہے۔ ٹویٹر نے 2015 سے اب تک 635000 سے زائد ایسے اکاؤنٹس معطل کیے ہیں جو اسلامی ریاست سے وابستہ تھے۔ فیس بک، یوٹیوب اور دیگر سوشل میڈیا کمپنیاں بھی باقاعدگی سے جہادی مواد کو ہٹانے کا کام انجام دیتی ہیں۔ تاہم، بین الاقوامی سطح پر بڑھتی نگرانی کے باوجود، اسلامی ریاست آج بھی دس زبانوں میں اپنی ماہانہ آن لائن میگزینز شائع کر رہی ہے۔ اسلامی ریاست سے منسلک ایک نیوز ایجنسی اعماق (Amaq) نیوز ایجنسی آج بھی ویڈیوز نشر کرتی ہے، جو وسیع پیمانے پر ٹویٹر، ٹیلیگرام اور دیگر پلیٹ فارمز پر شیئر کی جاتی ہیں۔

اسلامی ریاست (داعش) بیرون ملک پیدا ہونے والے افراد کو وسیع پیمانے پر آن لائن ابلاغ کے لیے استعمال کرتی ہے تاکہ وہ دنیا بھر میں موجود مکمل ہمدردوں سے رابطہ قائم کر سکیں۔ ابتدائی گفتگو کے بعد، یہ افراد تحفظ یافتہ (encrypted) میسجنگ ایپس جیسے ٹیلیگرام پر منتقل ہو جاتے ہیں تاکہ قانون نافذ کرنے والے اداروں سے بچا جاسکے۔ پیرس میں ایک حالیہ مثال میں، ایک جہادی نے اپنے ٹیلیگرام چینل Sabre de Lumiere (جس کا مطلب ہے ”نور کی تلوار“) کے ذریعے فرانسیسی اسلامی ریاست کے ہمدردوں سے رابطہ کیا۔ فرانسیسی پولیس نے چار مسلم خواتین کو گرفتار کیا، جو مبینہ طور پر اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ایک Peugeot کار کو گیس سلنڈروں اور پٹرول سے بھر کر مصروف مقام پر کھڑا کرنا چاہتی تھیں تاکہ بعد میں آگ لگادی جائے۔ خوش قسمتی سے، یہ کارنوترے ڈیم کی تھیڈرل کے قریب پارک ہونے کے باوجود نہ پھٹ سکی۔

2015 کے پیرس حملے میں اپنی بیٹی نوہمی گونزالیز کی موت کے بعد، متاثرہ کے والد رینالڈو گونزالیز نے تین بڑی سوشل میڈیا کمپنیوں ’گوگل‘، ’فیس بک‘ اور ’ٹویٹر‘ کے خلاف مقدمہ دائر کیا۔

ان پر الزام تھا کہ انہوں نے دہشت گردوں کو اپنے پلیٹ فارمز پر غیر قانونی معلومات کے تبادلے اور رابطے کی سہولت فراہم کی۔ اس مقدمے کے بعد، سوشل میڈیا کمپنیوں پر جہادی مواد کو ہٹانے کے لیے دباؤ بڑھا۔ تاہم، کمپنیوں کے لیے یہ ہمیشہ ایک مشکل توازن ہوتا ہے، ایک طرف قابل اعتراض مواد کو محدود کرنا اور دوسری طرف آزادی اظہار کو یقینی بنانا۔ امریکی قانون کے تحت، انٹرنیٹ کمپنیاں صارفین کی جانب سے پوسٹ کیے گئے مواد کی ذمہ دار نہیں ہوتیں۔ اس کے باوجود، جہادی گروہ نئے طریقے اور حکمت عملیاں اختیار کر کے سوشل میڈیا پر اپنی موجودگی برقرار رکھتے ہیں۔

روسی پیغام رسانی کی ایپ ٹیلیگرام، جو اپنے صارفین کو مکمل گمنامی فراہم کرتی ہے اور کلائنٹ 'سروس' سروسز کلائنٹ خفیہ کاری پر انحصار کرتی ہے، کو کئی انتہا پسند تنظیموں کی پسندیدہ ایپ کہا جاتا ہے۔

اسلامی ریاست کی ٹوئٹر مہم کی کامیابی کو اس کے ایک 'انتہا پسند بازگشت کے کمرے' کے طور پر استعمال سے منسوب کیا جاتا ہے، یعنی ایسا حلقہ جہاں جہادی پروپیگنڈا مسلسل اس کے حامیوں یا ممکنہ حامیوں تک پہنچایا اور پھیلا یا جاتا ہے۔ یہ حلقہ تین اقسام کے صارفین پر مشتمل ہوتا ہے: نوڈز، ایمپلی فائرز اور شاؤٹ آؤٹس، جو ایک درجہ بندی والے نظام کی صورت میں کام کرتے ہیں۔ پہلا درجہ نوڈز پر مشتمل ہوتا ہے، جو سوشل میڈیا پر جہادی دنیا کی سب سے بلند اور مقتدر آوازیں ہیں اور ویڈیوز، خبریں اور مضامین نشر کرتے ہیں۔ پھر ایمپلی فائرز اس مواد کو مسنید پھیلانے کے لیے ری ٹویٹ کرتے ہیں، گوکہ وہ خود کوئی نیا مواد فراہم نہیں کرتے۔ ایک عام اسلامی ریاست کے ٹوئٹر اکاؤنٹ کے تقریباً 1000 فالوورز ہوتے ہیں اور یہی بازگشت کا عمل ان اکاؤنٹس کی مسلسل کامیابی کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامی ریاست کو عراق اور شام میں جسمانی طور پر فیصلہ کن شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے، جس نے اسے ایک ورچوئل محفوظ پناہ گاہ میں پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا، جہاں سے وہ حقیقی دنیا میں حملوں کی ترغیب اور ربط قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے لیے حمایتی بنیاد تعمیر کرنے کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہے۔ اس تنظیم کے یہ ورچوئل جنگجو سب سے کم پیش گوئی کے قابل

لوگ ہوتے ہیں۔ یہ وہ افراد ہوتے ہیں جو آئن انٹہا پسندی کا شکار ہو کر مختلف قسم کی شکایات یا ذاتی عناد کو دل میں پالتے ہیں، جن کا تنظیم کی قیادت سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا، مگر اسلامی ریاست ان افراد کو فوراً 'سپاہی' خلافت' قرار دینے میں دیر نہیں لگاتی۔

یہ بات غیر یقینی ہے کہ اسلامی ریاست یا اس جیسا کوئی دوسرا گروہ اس کے انجام کے بعد دوبارہ جنم لے گا یا اس کے مرکز میں زندہ رہے گا۔ یہ کئی عوامل پر منحصر ہے، جیسے عراق کے سنی-شیعہ خلیج کو کس طرح سنبھالا جاتا ہے اور سنی مساجد سے سلفی ازم کو کس حد تک ختم کیا جاتا ہے۔ اسلامی ریاست کو فرقہ وارانہ کشیدگی کو استعمال کر کے کمیونٹیز کو دہشت زدہ کرنے میں مہارت حاصل ہے۔ عراق کی حکومتی قیادت کو اپنے فرقہ وارانہ اور نسلی ہم آہنگی کے اقدامات میں غیر معمولی محنت کرنا ہو گی۔ ان تمام قوتوں کو، جن میں امریکہ بھی شامل ہے، جو انتہا پسند عناصر کے خلاف برسرِ پیکار ہیں، یہ جان لینا چاہیے کہ اگرچہ فرقہ، موصول اور دیگر علاقوں میں اسلامی ریاست کا جھنڈا پاش پاش ہو چکا ہے، مگر دہشت پھیلانے اور ان علاقوں میں، جو غیر منظم یا بے حکومتی کا شکار ہیں، موجود نسلی اور فرقہ وارانہ نفرت کو استعمال کرنے کی اس کی صلاحیت مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی ہے۔

باب ہفتم

عراق اور شام میں اسلامی ریاست کا ارتقا اور توسیع

احمد فضل النزال الخلالیہ، جو عام طور پر ابو مصعب الزرقاوی کے نام سے مشہور ہے، اسلامی ریاست کا بانی اور روح رواں تھا۔ 1999 میں، اُسے اردن کی حراست سے ابو محمد المقدسی کے ساتھ رہا کیا گیا، جو ایک عرب جنگجو نظریہ ساز تھے۔ الزرقاوی نے المقدسی سے راہیں جدا کیں اور افغانستان کا سفر کیا، جس کے لیے لندن میں مقیم ایک جہادی ابوقنادہ^{الفلسطینی} نے اُسے القاعدہ کی قیادت سے رابطہ کرنے کا مشورہ دیا۔ اُسے ایک خصوصی گرانٹ کے طور پر دو لاکھ امریکی ڈالر دیے گئے تاکہ وہ ایران کی مغربی سرحد کے قریب افغان شہر ہرات میں ایک جہادی تربیتی مرکز قائم کر سکے۔

الزرقاوی نے ملا عمر کی حکومت کی جانب سے دی گئی زمین پر تربیتی کیمپ قائم کیا۔ جب کیمپ کا قیام مکمل ہوا تو اُس نے اردن سے کئی جہادی تربیت یافتگان کو وہاں لایا اور ایک تنظیم قائم کی جسے جماعت التوحید والجمہاد (JTWJ) کا نام دیا گیا۔ اس تنظیم کو اُس وقت بین الاقوامی میڈیا کی توجہ حاصل ہوئی جب الزرقاوی کے تربیت یافتہ جنگجوؤں نے اردن میں ریڈیسن ہوٹل اور دیگر مقبول سیاحتی مقامات پر حملے کیے۔ امریکہ نے اس تنظیم کو دہشت گرد قرار دیا اور اقوام متحدہ کی 1267 کمیٹی کے تحت القاعدہ سے روابط کی بنا پر عالمی پابندیوں کی فہرست میں شامل کر لیا۔

اس گروہ کا بنیادی مقصد عراق میں ایک آزاد اور کثرت پسند ریاست کے قیام کو ناکام بنانا اور وہاں فرقہ وارانہ جنگ بھڑکانا تھا۔

نائن الیون کے بعد امریکہ کے افغانستان پر حملے نے الزرقاوی اور اس کے گروہ کو ہرات میں قائم اپنی تربیتی سہولت ترک کرنے پر مجبور کر دیا، جس کے بعد وہ ایران فرار ہو گئے۔ ایران میں ان کو جہادی تنظیم حزب اسلامی گلبدین کی جانب سے پناہ دی گئی۔ سنہ 2002 کے آس پاس الزرقاوی اور اس کے ساتھیوں نے ایران چھوڑا اور شمالی عراق میں کرد اکثریتی علاقے میں ایک نیا کیمپ قائم کیا۔ یہاں الزرقاوی کی ملاقات ایک اور جہادی تنظیم انصار الاسلام سے ہوئی، جو سخت گیر سلفی نظریات پر کار بند تھی۔ یہ تنظیم کرد بغاوت والے خطے میں سرگرم تھی اور صدام حسین کی حکومت کی طرف سے بالواسطہ طور پر اس کی پشت پناہی کی جا رہی تھی تاکہ کرد علاقوں کی سیاسی حرکیات پر قابو پایا جاسکے۔

الزرقاوی کے القاعدہ سے مضبوط روابط نے اسے انصار الاسلام کی قیادت کے مرکزی حلقے میں جگہ حاصل کرنے میں آسانی فراہم کی۔ اس پیش رفت کے نتیجے میں امریکی انٹیلیجنس نے غلط طور پر یہ فرض کر لیا کہ صدام حسین کا القاعدہ سے تعلق ہے، اور واشنگٹن ڈی سی میں سازشی نظریہ سازوں نے نائن الیون کے حملوں کو صدام سے جوڑنے کی کوشش کی۔ 2002 میں انصار الاسلام کرد ملیشیا کے ساتھ سرگرم جنگ میں مصروف تھی۔ صدام حسین اس تنظیم کے اعلیٰ عملی ڈھانچے سے خفیہ معلومات حاصل کرتا تھا، جو اس کے لیے نہایت قیمتی تھیں۔ اگرچہ صدام ایک غیر مذہبی بعضی سیکولر نظریہ رکھنے والا رہنما تھا، لیکن اس نے اسلامی قدامت پسندی کو انخوان المسلمون کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کا توازن قائم رکھنے کے لیے ایک حکمت عملی کے طور پر استعمال کیا تھا۔

اسلامی ریاست کا عروج

اسلامی ریاست عراق و شام - (Islamic State of Iraq and the Levant)
(ISIL، جسے اسلامی ریاست عراق و سوریه (ISIS) یا صرف ”اسلامی ریاست“ (IS) بھی کہا

جاتا ہے، عربی میں ”داعش“ کے نام سے معروف ہے۔ یہ ایک عسکریت پسند تنظیم ہے جو سنی اسلام کے سلفی جہادی نظریات پر عمل کرتی ہے۔ سنہ 2004 کے آخر میں، ابو مصعب الزرقاوی نے القاعدہ سے بیعت کی اور عراق میں القاعدہ (AQI- Al-Qaeda in Iraq) قائم کی۔ اُس کی اپنی تنظیم ”جماعت التوحید والجهاد“ (JTJW) نے شمالی عراق کے صوبہ سلیمانہ میں ایک جہادی تربیتی کیمپ بھی قائم کیا تھا۔ یہی وہ کیمپ تھا جسے امریکہ نے عراق پر حملے کے ابتدائی دنوں میں نشانہ بنایا۔ اس کے نتیجے میں الزرقاوی اور امریکہ کے درمیان براہ راست تصادم پیدا ہوا، جو بعد میں اس کی نظریاتی سمت کا تعین کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

عراق پر حملے کے ابتدائی مہینوں میں ہی الزرقاوی کی جماعت التوحید والجهاد (JTJW) نے اپنے عزائم کا واضح مظاہرہ کیا۔ ایک پیشہ ورانہ اور منظم طریقے سے الزرقاوی نے بغداد شہر میں کئی اہم اہداف پر کاربم دھماکے اور خودکش حملے کر کے زیادہ سے زیادہ جانی نقصان پہنچایا۔ اُس نے اپنے دہشت گردانہ منصوبے کو انتہائی باریک بینی سے تیار کیا تھا تاکہ اردن کے مفادات، بین الاقوامی برادری اور اس کی حمایتی تنصیبات، اور شیعہ مسلمانوں کو نشانہ بنایا جاسکے۔ ایک اہم شیعہ مذہبی علامت کو جنوبی شہر نجف میں نشانہ بنایا گیا، جہاں امام علی مسجد پر ایک کاربم حملہ کیا گیا۔ اس حملے میں 90 سے زائد نمازی شہید ہوئے، جن میں معروف عراقی شیعہ عالم آیت اللہ محمد باقر الحکیم بھی شامل تھے۔

الزرقاوی نے جماعت التوحید والجهاد (JTJW) کو پورے عراق میں وسعت دی اور 22 فروری 2006 کو سامرہ کی سنہری مسجد کو ایک خودکش بمبار کے ذریعے تباہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ مسجد شیعہ اسلامی روایت کے چند مقدس ترین اماموں کی قبروں پر مشتمل تھی، جن میں نویں صدی کے امام حسن العسکریؑ بھی شامل تھے، جو امام غائب کے والد ہیں۔ ایسی مقدس مسجد، جو مگولوں جیسے خونریز فاتحین کے حملوں میں بھی محفوظ رہی، صرف وہی شخص تباہ کر سکتا تھا جس کے دل میں شیعہ مسلمانوں کے لیے شدید نفرت ہو۔ الزرقاوی نے شام میں بھی ایک مضبوط نیٹ ورک قائم کیا تاکہ خود کو اہل سنت کے وقار اور برتری کا محافظ ظاہر کر سکے۔ وہ عراق اور شام دونوں میں اس

کو ایک شیعہ مخالف انقلاب میں تبدیل کرنے پر مٹا ہوا تھا۔ اُس وقت الزرقاوی خلافت اور اس پر شریعت کے نفاذ کے ساتھ داعش کے قیام کی سمت بڑھ رہا تھا۔

2004 سے 2006 کے درمیان، الزرقاوی عراق کے شہری علاقوں میں اتحادی افواج کے خلاف مسلسل برسرِ پیکار رہا۔ اس نے دیہی علاقوں میں مقامی سنی برادریوں میں رسوخ حاصل کیا اور قبائلی قیادت کو متاثر کیا۔ الزرقاوی امریکیوں کو اغوا کرنے اور ان کے سر قلم کرنے کی ویڈیوز یوٹیوب پر ڈالنے کے لیے بدنام ہوا۔ سر قلمی کے مناظر اور خود کش بمباروں کی قطاروں نے جماعت التوحید والجمہاد (JTWJ) کو اپنے وقت کی سب سے سفاک دہشت گرد تنظیم بنا دیا تھا۔ الزرقاوی نہایت چالاک اور حکمت عملی سے کام لینے والا شخص تھا۔ اُس نے جان بوجھ کر القاعدہ یا افغانستان کی طالبان قیادت سے کبھی بیعت نہیں کی تھی۔ 2004 میں، القاعدہ کی مرکزی قیادت نے مذاکرات کے ذریعے JTWJ کو اپنے دائرے میں لانے کی کوشش کی۔ اوسامہ بن لادن، ایمن الظواہری اور الزرقاوی کے درمیان طویل مذاکرات کے بعد JTWJ کا نام تبدیل کر کے القاعدہ فی بلاد الرافدین یا سادہ الفاظ میں 'عراق میں القاعدہ' (AQI) رکھ دیا گیا۔ AQI کی فرقہ وارانہ حکمت عملی، کئی پہلوؤں سے، القاعدہ کی مرکزی قیادت کے موقف سے مختلف تھی۔ معصوم شہریوں کی عوامی مقامات پر مسلسل خود کش حملوں کے ذریعے ہلاکتیں اور سفاکانہ ویڈیوز نے القاعدہ کی قیادت کو تشویش میں ڈال دیا تھا۔ الزرقاوی کی قیادت میں AQI نے القاعدہ کی مرکزی ہدایت سے ہٹ کر عراق کے لیے اپنی راہ خود طے کی۔ جنوری 2006 میں، طویل گفت و شنید کے بعد پانچ چھوٹی جہادی تنظیمیں AQI میں ضم ہو گئیں اور 'مجلس شوریۃ المجاہدین' (MSM) کے نام سے ایک نیا اتحاد قائم کیا گیا۔ اس وسیع تر اتحاد کے ذریعے الزرقاوی نے عراق کے سنی اکثریتی علاقوں کو یکجا کرنے اور اسلامی ریاست کے قیام کی زمین ہموار کرنے کا کام شروع کیا۔

بظاہر الزرقاوی خود کو سنی وقار اور بالادستی کا محافظ ثابت کرنا چاہتا تھا۔ امریکہ کی قیادت میں اتحادی افواج کو عراق سے نکال باہر کرنے اور ایک فرقہ وارانہ خانہ جنگی کو ہوا دے کر، وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ عراق میں دوبارہ سنی قیادت برسرِ اقتدار آجائے گی۔ الزرقاوی کا آخری ہدف

یہ تھا کہ ایک اسلامی ریاست قائم کی جائے جو پہلے عراق اور پھر شام میں جڑیں پکڑے۔ صدام کے دور میں بھی عراقی معاشرہ گہرے فرقہ وارانہ تعصبات میں جکڑا ہوا تھا۔ تمام وہ تنظیمیں جو بعد میں اسلامی ریاست کی بنیاد بنیں، ابتدا ہی سے شیعہ مخالف تھیں، اور خود الزرقاوی کا شیعہ مذہب کے ساتھ ذاتی بغض اس پورے سنی-شیعہ منظر نامے کو مزید پر تشدد بنا رہا تھا۔ اس کے عوامی بیانات اور ذاتی تحریریں شیعہ عقائد کے خلاف شدید نفرت پر مبنی تھیں۔ ایک تقریر میں اس نے کہا تھا: ”مسلمانوں یا سنیوں کو یہودیوں اور عیسائیوں جیسے جارح کافروں پر فتح اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ ان کے نیچے رہنے والے مرتد ایجنٹوں، جن کی قیادت رافضی [شیعہ] کر رہے ہیں، کا مکمل صفایا نہ کر دیا جائے۔“ الزرقاوی کی موت کے چھ سال بعد بھی اسلامی ریاست کی حکمت عملی اور اس کا طریقہ کار فرقہ وارانہ منافرت اور شیعہ دشمنی سے معمور رہا۔ سنی حلقوں میں شیعوں کے تئیں نفرت پر مبنی اس کی سوچ ہی سب سے طاقتور بیانیے کی شکل اختیار کر گئی۔

الزرقاوی کا بنیادی سیاسی مقصد فرقہ وارانہ تھا: سنی اسلام کو طاقت دینا اور شیعہ اسلام پر تشدد حملے کرنا، اسے دبانے اور جڑ سے اکھاڑ پھینکنا۔ اگرچہ شیعہ مخالفت ایک دیرینہ قدامت پسند سنی رجحان رہی ہے، لیکن یہ دشمنی 1997 میں خمینی تحریک کے ذریعے شیعیت کے احیاء اور اس کے خلاف وہابی-سلفی رد عمل کے بعد مزید شدید ہو گئی۔ الزرقاوی کی شیعہ دشمنی انتہا پسندی، جنونیت اور شیعوں کو شیطان صفت قرار دینے جیسے رجحانات پر مبنی تھی، اس حد تک کہ وہ انہیں امریکیوں سے بھی زیادہ خطرناک تصور کرتا تھا۔

الزرقاوی کی شناخت شدت پسند فرقہ واریت، غیر مصالحتی تشدد، اور اسلامی خلافت کی واپسی کے لیے فوری طور پر ایک اسلامی ریاست کے قیام پر مرکوز سوچ سے ہوئی۔ اُس نے اس تصور کو مقبول بنایا کہ شیعہ، سنیوں کے وجود کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہیں۔ اپنی رائے کو تقویت دینے کے لیے اُس نے شیعوں کو اجتماعی قاتل قرار دیا جو بڑے پیمانے پر مظالم میں ملوث ہیں، اور اُن کے خلاف نسل کشی پر مبنی آخری حل کے نظریے کو بھی بیان کیا۔ مشرق وسطیٰ کے ماہرین کے

مطابق الزرقاوی نے اپنی پوری زندگی میں ایک اسلامی ریاست کے بنیادی تصور کو قائم رکھا۔ عالمی جہادی حلقوں میں سوشل میڈیا کو درندگی کے مظاہرے، جیسے کہ سر قلم کرنے، دہشت زدہ کرنے والی دھمکیوں اور وحشیانہ تشدد کے دیگر مناظر کی نمائش کے لیے استعمال کرنے کا وحشیانہ رجحان سب سے پہلے اسی نے متعارف کرایا۔

تاہم، الزرقاوی کی مستقل شیعہ مخالف تقریر و تحریر نے اس کے اردنی مرشد ابو محمد المقدسی کو پریشان کر دیا، جنہوں نے ہر برائی کا الزام شیعہ مسلمانوں پر ڈالنے اور انہیں نشانہ بنانے پر سوالات اٹھائے۔ المقدسی نے اپنی ویب سائٹ www.almaqdese.com اور مختلف ٹی وی چینلز پر انٹرویوز کے ذریعے الزرقاوی کے اقدامات پر تنقید کی اور کہا کہ وہ عام شیعہ افراد کو غیر مسلم نہیں سمجھتے اور انہیں امریکیوں کے برابر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ المقدسی نے عام مسلمانوں اور عبادت گاہوں پر حملوں کی سخت مخالفت کی۔ افغانستان میں القاعدہ کے کئی سینئر رہنماؤں نے بھی اس رائے کا اظہار کیا کہ عراق اور شام میں الزرقاوی کے اقدامات نے اسلام کی ساکھ کو شدید نقصان پہنچایا۔

عراق میں امریکہ کی سنگین غلطیاں

عراق میں امریکی قیادت والی عبوری اتحادی انتظامیہ (Coalition Provisional Authority) (CPA) کے سربراہ پال بریمر کے ایک غیر مدبرانہ فیصلے کے نتیجے میں پورے عراقی فوجی، سلامتی اور انٹیلی جنس ڈھانچے کو تحلیل کر دیا گیا، جس کا مطلب یہ تھا کہ عراق کی 4 لاکھ سکیورٹی فورسز کا ایک غیر فعال ہو گئیں۔ امریکی سیاسی ماہر اور قانونی اسکا لری جیمز پی۔ فففر نے 2010 میں جریدہ Intelligence and National Security میں شائع ایک مضمون میں عراق میں امریکی غلطیوں کو نہایت اختصار کے ساتھ درج کیا ہے۔ ان کے مطابق، اس فیصلے نے بغاوت کو ہوا دی، ہزاروں عام عراقیوں کو بیگانہ کر دیا جو اب اپنے خاندانوں کی کفالت کے قابل نہ رہے۔ اس اقدام نے معاشرتی اور اقتصادی سرگرمیوں کو درہم برہم کر دیا۔ عوام میں عدم تحفظ اور امریکہ کے خلاف شدید غصے کا جذبہ پیدا ہوا، خاص طور پر ان لوگوں میں جو ہتھیاروں

سے لیس اور ان کے استعمال میں ماہر تھے۔ برطانوی اور امریکی خصوصی آپریشن فورسز کی گشت محدود ہو کر صرف شہری علاقوں تک رہ گئی۔ اس تحلیل نے ہزاروں افراد کو بے روزگار اور بے سروسامان بنادیا، جو امریکی قابضین کے ہاتھوں خود کو فریب خوردہ اور ذلیل محسوس کرنے لگے۔

ستم ظریفی یہ تھی کہ پال بریمر کو نہ تو عسکری امور کا کوئی تجربہ تھا اور نہ ہی مشرق وسطیٰ کی سیاست یا انتظامی ڈھانچے سے کوئی واقفیت۔ عراق میں ان کی یہ پہلی تعیناتی تھی اور جب انہوں نے یہ حکم نامہ جاری کیا، تب انہیں عراق آئے ہوئے محض دس دن ہی ہوئے تھے۔ اتحادی عبوری انتظامیہ (CPA) کے یہ احکامات بعد ازاں ریٹائرڈ فوجی افسران، سیاست دانوں اور سابق منتظمین کے درمیان شدید بحث و مباحثے، غور و خوض اور تنازعات کا سبب بنے۔ صدر جارج بلش نے بعد میں اپنے سوانح نگار رابرڈ ریپر کو بتایا تھا کہ ”پالیسی یہی تھی کہ عراقی فوج کو برقرار رکھا جائے۔ یہ فیصلہ کیسے بدل گیا، یہ میرے لیے بھی ایک معمہ ہے۔“

یہ ممکن ہے کہ بریمر نے یہ فیصلہ خود سے کر لیا ہو، لیکن یہ ماننا مشکل ہے کہ بلش یا وائٹ ہاؤس نے اسے بغیر منظوری کے ایسا کرنے دیا ہوگا۔ ایک موقع پر جب بریمر کی ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل جے گارز سے تلخ کلامی ہوئی تو انہوں نے کہا کہ وہ صرف صدر کے احکامات کی تعمیل کر رہے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس انتشار کے پیچھے وزیر دفاع رمز فیلڈ کا ہاتھ ہو۔ تاہم، یہ ایک فیصلہ شدت پسند گروہوں، خاص طور پر اسلامی ریاست (داعش) اور دیگر جہادی تنظیموں کے لیے سنہری موقع ثابت ہوا۔ عراق کی بے روزگار فوجی افسران کو ان گروہوں میں شامل کرنے کی راہ ہموار ہو گئی۔ 2003 سے 2005 کے درمیان، عراق کے سنی اکثریتی علاقوں اور مشرقی شام میں متعدد خود مختار بھرتی مراکز قائم ہوئے، جن کا مقصد غیر ملکی جنگجوؤں اور عراقی فوج کے تجربہ کار سابق اہلکاروں کو انتہا پسند نیٹ ورکس میں شامل کرنا تھا۔

یہ ایک نوجوان عراقی تھا، ابو غادیہ، جو موصل سے تعلق رکھتا تھا اور جسے القاعدہ کے عراق میں نمائندے، الزرقاوی نے رسد (لاجسٹکس) کا سربراہ مقرر کیا تھا۔ اس کے ذمے شام کے راستے عراق میں فنڈز، ہتھیاروں اور جنگجوؤں کی ترسیل کی نگرانی تھی۔ اس نے دمشق میں ایک دفتر قائم

کیا جہاں ہوائی راستے سے دمشق انٹرنیشنل ایئر پورٹ اور زمینی راستوں سے اردن (جنوب)، لبنان (مغرب) اور ترکی (شمال) سے آنے والے غیر ملکی جنگجوؤں کے لیے پاسپورٹ فراہم کیے جاتے تھے۔ دمشق کا یہ دفتر، جو تیز رفتار انٹرنیٹ سے جڑے لیپ ٹاپس سے لیس تھا، غنیمت کی جنگجوؤں کا ڈیٹا بیس بھی سنبھالتا تھا۔ رضا کار نئے آنے والوں کو بریفنگ دیتے اور ان کی رہائش، سفر، اور عراق میں سنی اکثریتی علاقوں میں کن افراد سے رابطہ کرنا ہے، اس تمام معلومات پر مشتمل کاغذی مواد بھی فراہم کرتے تھے۔

پہلے تمام شامی یعنی، عراقی یعنی اور القاعدہ کے جنگجو ایک ساتھ ہو گئے تھے کیونکہ ان سب کا عقیدہ اور طرز عمل ایک جیسا تھا یعنی سنی، وہابی اور سلفی نظریے پر مبنی، اور وہ شیعہ مسلمانوں کو گمراہ و بدعتی سمجھتے تھے۔ تاہم شام میں اس اسٹریٹجک توازن میں بتدریج تبدیلی آئی، جب امریکہ اور بین الاقوامی سفارتی دباؤ کے نتیجے میں شام پر یہ دباؤ بڑھا کہ وہ اپنی سرزمین پر سرگرم غیر ملکی جنگجو بھرتی مراکز کو بند کرے۔ 2005 کے آغاز تک، شامی سکیورٹی اداروں نے اپنا پہلے والا نرم موقف ترک کر دیا اور حلب، دمشق اور دیر الزور میں القاعدہ سے منسلک درمیانے درجے کے سہولت کاروں کو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ اس کے نتیجے میں شام کے راستے آنے والے غیر ملکی جنگجوؤں کی تعداد میں نمایاں کمی واقع ہوئی، اور پھر یہ جنگجو ترکی اور لبنان کے راستوں کو اختیار کرنے لگے۔

اسلامی ریاست عراق (ISI) کی تمام پیش رو تنظیمیں گہرے فرقہ وارانہ رجحانات کی حامل تھیں، اور یہ ابھرتی ہوئی سنی-شیعہ تقسیم سے متعلق اسٹریٹجک بیانیے کا حصہ تھا۔ یہی پس منظر ابو مصعب الزرقاوی کی ذاتی شیعہ دشمنی کو مزید تقویت دیتا رہا، کیونکہ وہ سعودی سلفی نظریات پر پروان چڑھاتا تھا، جو شیعہ اور صوفی مسلمانوں کو مرتد اور گمراہ تصور کرتا ہے۔ اس کی نفرت اس حد تک شدید تھی کہ اُس نے اپنے سسر کو نجف میں واقع شیعہ مزار پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا۔ 7 جون 2006 کو امریکی بمباری میں مارے جانے سے قبل اس کا آخری عوامی خطاب بھی اس شدید نفرت کی گواہی دیتا ہے۔ الزرقاوی کی موت کے پانچ روز بعد القاعدہ عراق (AQI) نے

ابوایوب المصری کو اپنا نیا امیر نامزد کیا، جس نے 15 اکتوبر 2006 کو AQI کا نام بدل کر ”اسلامی ریاست عراق“ (ISI) رکھ دیا۔ کچھ ہی عرصے بعد، ابو عمر البغدادی کو اس نئی تنظیم کا سربراہ مقرر کر دیا گیا۔

AQI کی جانب سے اگلے ہی روز انٹرنیٹ پر اپلوڈ کی گئی ایک ویڈیو میں دعویٰ کیا گیا کہ مجوزہ ”ریاست“ عراق کے موجودہ صوبوں ’بغداد، انبار، کرکوک، صلاح الدین اور بابل کے کچھ حصوں‘ پر مشتمل ہوگی اور اس کا نظام شریعت اسلامی کے تحت چلایا جائے گا۔ اسلامی ریاست عراق (ISI) کے قیام کے اعلامیے میں ابو عمر البغدادی کو خلیفہ نامزد کیا گیا، جسے ”امیر المؤمنین“ کا خطاب دیا گیا، یہ لقب عموماً اسلام کے پہلے چار خلفاء کے لیے مخصوص سمجھا جاتا ہے۔ ابو عمر قریش قبیلے سے تعلق رکھتے تھے، جس سے اسلامی روایت کے مطابق اگلا خلیفہ آنا تھا۔ تاہم، اپریل 2010 میں ایک امریکی حملے کے دوران ابو عمر اور AQI کے سربراہ ابو حمزہ المہاجر مارے گئے۔ ان کی جگہ فوراً اسی قبیلے سے تعلق رکھنے والے ایک اور نمایاں ISI امیر، ابو بکر البغدادی کو خلیفہ مقرر کر دیا گیا۔

سنہ 2012-13 سے لے کر 2020 کے درمیان، اسلامی ریاست کے جنگجوؤں نے امریکہ کی زیر انتظام فوجی جیلوں پر حملے شروع کیے۔ انہوں نے کئی بم دھماکے کیے اور آٹھ جیلوں سے جہادیوں کو چھڑانے میں کامیابی حاصل کی۔ 2011 میں امریکی افواج کے انخلا کے بعد، تمام جہادی تنظیمیں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئیں تاکہ اپنے خواب کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ سلفی نظریے سے لبریز اور عراق میں سنی اسلام کے کھوئے ہوئے اثر و رسوخ کو دوبارہ حاصل کرنے کے جذبے سے سرشار اس گروہ نے اپنی جہادی یلغار کا آغاز کیا۔ عرب بہار کے پھیلاؤ سے پیدا ہونے والی سیاسی مایوسیوں اور امریکی عبوری حکومت کے تحت قائم کردہ شیعہ غالب حکومت کی جانب سے سنیوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے امتیازی سلوک کو اس گروہ نے بخوبی استعمال کیا۔ 2014 کی گرمیوں تک، عراق اور شام بکھرے ہوئے دہانے پر پہنچ چکے تھے، کیونکہ ان کے متنوع

طبقات بی شیعہ، سنی، کرد، علوی اور عیسائی۔ اپنے اپنے وجود کی جنگ لڑنے پر مجبور ہو چکے تھے۔ اسلامی ریاست نے حملوں کی شدت میں اضافہ کیا اور عراق کے جنوبی شیعہ علاقوں اور کرد آبادی والے شمالی حصوں کو نشانہ بنانا شروع کیا۔ اسی دوران، اعلیٰ کمانڈروں کو شام بھیجا گیا تاکہ القاعدہ کی شامی شاخ، النصرہ فرنٹ، کے ساتھ مشترکہ محاذ قائم کیا جاسکے۔ اسلامی ریاست کی قیادت عراق کی شیعہ حکومت پر دباؤ ڈالنے پر مرکوز تھی تاکہ سنی برادریوں کے خلاف ہونے والے جبر کو روکا جاسکے، چنانچہ بغداد اور دیگر اہم مقامات پر مرمی بوط خودکش حملے اور کار بم دھماکے کیے گئے۔ ان دھماکوں کا سلسلہ تقریباً روزانہ کی بنیاد پر جاری رہا اور بغداد میں گولیوں کی آوازیں معمول کا پس منظر بن چکی تھیں۔ عام شہریوں کی بڑھتی ہوئی ہلاکتوں اور پھیلنے ہوئے انتشار نے عراقی مرکزی حکومت کو ہلا کر رکھ دیا اور سکیورٹی فورسز کے حوصلے بھی بری طرح پست ہو گئے۔

2012 سے 2014 اور بعد کے برسوں کے درمیان، اسلامی ریاست نے اپنے عملیاتی نیٹ ورک کو کافی وسعت دی۔ اس نے مقامی برادری کی حرکیات اور مسلح سکیورٹی افواج سے متعلق معلومات جمع کیں۔ اسلامی ریاست عراق (ISI) نے شہروں کے سکیورٹی افسران کو ہدف بنا کر قتل کرنے کی کارروائیاں تیز کر دیں۔ ایک ”جہادی تھنک ٹینک“ کی جانب سے ایک مطالعہ بھی کیا گیا تاکہ عراقی سکیورٹی نظام کی مزاحمتی صلاحیت کو جانچا جاسکے اور ان کمزوریوں کی نشاندہی ہو سکے جن سے فائدہ اٹھا کر اسلامی ریاست نرمی سے داخل ہو سکے۔ سنی قبائلی قیادت کو بھی اسلامی ریاست کے منصوبے میں شامل کیا گیا تاکہ شیعہ حکومت اگر سنی برادریوں سے مفاہمت کی کوشش کرے تو اسے ناکام بنایا جاسکے۔

غیر ملکی جنگجوؤں کا کردار

اسلامی ریاست عراق (ISI) پر غیر ملکی جنگجوؤں کا گہرا اثر پڑ چکا تھا، جن میں اکثریت عرب ممالک سے تعلق رکھنے والے افراد کی تھی۔ تیونس، سعودی اور اردنی جنگجو دیگر غیر ملکیوں کے مقابلے میں نمایاں طور پر زیادہ تھے۔ اس حقیقت سے یہ عیندیہ ملتا ہے کہ ان جنگجوؤں کے اسلامی

ریاست میں شمولیت کے پیچھے کچھ مضبوط مذہبی محرکات کا فرما تھے۔ ابتدا میں زیادہ تر غیر ملکی جنگجو شام کا رخ کرتے تھے، تاہم مارچ 2003 میں جب امریکہ کی قیادت میں اتحادی افواج نے عراق پر حملہ کیا، تو صورتحال تبدیل ہو گئی۔ حلب، درعا اور دیگر مقامات پر موجود امریکی مخالف جہادیوں نے کھلے عام اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ عراق کی جنگ نے شامی جہادیوں کو موقع فراہم کیا کہ وہ خود کو منظم کریں اور اتحادی افواج کے خلاف مزاحمت کا آغاز کریں۔ جنگ کے ابتدائی دنوں میں درجنوں بسیں شامی جہادیوں کو لے کر مشرقی شہر دیر الزور پہنچیں، جہاں سرحدی محافظوں نے انہیں 'کھلے دروازوں' سے عراق جانے کی اجازت دے دی۔ متعدد رپورٹس کے مطابق، جنگ شروع ہونے کے صرف 11 دن کے اندر 5000 سے زائد رضا کار شام کے راستے عراق میں داخل ہو چکے تھے۔

اسلامی جہاد و موومنٹ آف فلسطین نے 1000 سے زائد رضا کار عراق بھیجے، جن میں سے بہت سے خود کش حملہ آور بننے کے لیے تیار تھے۔ برطانوی اسپیشل ایئر سروسز (SAS) کے کمانڈوز نے ایسی چار بسوں کے قافلے کو حراست میں لیا جن میں شامی پاسپورٹ رکھنے والے ممکنہ خود کش بمبار سوار تھے، اور جن کا رخ عراق کے سنی اکثریتی مغربی صوبہ انبار کی طرف تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب شامی اور دیگر غیر ملکی جنگجو بڑی تعداد میں عراق جانے لگے تاکہ امریکی قیادت میں اتحادی افواج کے خلاف لڑ سکیں۔ حیران کن طور پر، یہ نقل و حرکت شامی سکیورٹی فورسز کی سرپرستی میں ہو رہی تھی، حالانکہ صدر بشار الاسد نے 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' میں امریکی صدر کو غیر مشروط حمایت دینے کا اعلان کیا تھا۔ مشرقی شام کی عراق کے ساتھ 605 کلومیٹر طویل سرحد قبائلی، ویران اور کم آبادی والی ہے۔ عراق پر حملے کے بعد عالمی جہادیوں نے اس نیم محفوظ اور غیر منظم سرحد کو عراق میں داخل ہونے کے لیے راہداری کے طور پر استعمال کیا۔ عراقی بھرتی کنندگان یورپی اور عرب جنگجوؤں کو دیر الزور کے سرحدی راستے سے عراق لاتے تھے۔

سنہ 2012 کے آخر میں جب شام کے انقلاب کی صورت حال تیزی سے بدل رہی تھی، عوامی بیداری کا جھکاؤ اپوزیشن کے حق میں ہوتا جا رہا تھا اور حکومتی کنٹرول والے علاقے تیزی سے

سکڑنے لگے تھے۔ سرحدی چوکیوں پر سے حکومتی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی تو حکومت کو مجبوراً اپنی افواج کو محاذی علاقوں میں دوبارہ تعینات کرنا پڑا۔ درجنوں کی تعداد میں فوج، سکیورٹی اور پولیس افسران حکومت سے بغاوت کر رہے تھے اور اب سینئر افسران بھی مستعفی ہونے لگے تھے۔ اس تیزی سے بدلتے تنازعے کے دوران، چھوٹے جہادی گروہ النصرہ نے حال ہی میں حاصل کردہ مہارت کی بنیاد پر شام کے مختلف علاقوں میں اپنی فعال موجودگی قائم کر لی، اور مسلسل وچپییدہ گوریلا طرز کی کارروائیاں کرنے لگا۔ یہ گروہ حکومت کے خلاف اپوزیشن کو مضبوط بنانے میں کامیاب ہو رہا تھا، لیکن کچھ حلقے اسے حکومت کا پیدا کردہ ایک ایجنٹ گروپ بھی سمجھتے تھے۔ یہ محض تاثر تھا، زمینی حقیقت نہیں۔ موسم سرما 2012-13 میں شمالی شامی بغاوت کے بتدریج اسلامی رنگ اختیار کرنے کی راہ ہموار ہوئی، جس کے نتیجے میں اسلامی دھڑوں اور آزاد شامی فوج (FSA) سے وابستہ گروپوں کے درمیان کشیدگی بھی بڑھنے لگی۔

ابوبکر البغدادی، جو عراق میں دولت اسلامیہ (اسلامک اسٹیٹ) کا سربراہ تھا، نے باضابطہ طور پر النصرہ کے ساتھ تعلقات کی منظوری دی تاکہ شامی حکومت کی افواج کے خلاف متحدہ محاذ قائم کیا جاسکے۔ تاہم، پاکستان میں مقیم القاعدہ کے رہنما ایمن الظواہری اس پیش رفت سے خوش نہیں تھے، کیونکہ ان کی خواہش تھی کہ القاعدہ کی شناخت شام کی النصرہ تنظیم سے الگ رکھی جائے۔ وہ ابوبکر البغدادی کی ابھرتی ہوئی قیادت سے بھی نالاں تھے۔ ایمن الظواہری نے داعش پر الزام لگایا کہ اس نے شام میں ایک ”سیاسی تباہی“ کو جنم دیا ہے، کیونکہ دیرالزور جیسے تیل کے اہم شہر میں لڑائی شدت اختیار کر رہی تھی اور رقتہ شہر داعش کا عملی دارالحکومت بن جا رہا تھا۔ جہادی دھڑوں کے درمیان تعلقات انتہائی پست سطح پہنچ چکے تھے، اور داعش کے جنگجو اب النصرہ اور دیگر چھوٹے شامی جہادی گروپوں کو نشانہ بنانے لگے تھے۔ رفتہ رفتہ طاقت کا توازن داعش کے حق میں جھکنے لگا اور خبر رساں ادارے رائٹرز کے مطابق، داعش ہر ہفتے النصرہ کے زیادہ جنگجوؤں کو مار رہی تھی بنسبت حکومت حامی افواج کے۔ ان حالات پر ایمن الظواہری سخت برہم ہوئے، انہوں نے خود کو داعش سے لاقابل قرار دیا اور اس پر شام میں مجاہدین کے درمیان تفریق

پیدا کرنے کا الزام عائد کیا۔ انہوں نے ابو بکر البغدادی پر سخت تنقید کی اور یہاں تک کہ کہا کہ وہ القاعدہ عراق کا حصہ نہیں ہے۔

مہینوں تک جاری رہنے والے الزامات کے بعد، جو شام کے تنازع میں ان کے کردار کے گرد گھومتے تھے، ایران، حزب اللہ اور دیگر غیر ملکی ملیشیاؤں نے رفتہ رفتہ شام کی طاقت کی جنگ میں سرگرم فریق کے طور پر اپنی موجودگی ظاہر کرنا شروع کی۔ انہوں نے حکومت کی حمایت میں افواج کو مشورے دینے، تربیت فراہم کرنے اور عملی مدد پہنچانے کا سلسلہ شروع کیا۔ ایرانی فوجی مشیران اور حزب اللہ کے جنگجوؤں کو افغانستان، عراق اور پاکستان سے تعلق رکھنے والے دیگر شیعہ جنگجوؤں کی کمک بھی حاصل ہوئی۔ ان کا ابتدائی مقصد شیعہ مقدس مقامات کا دفاع کرنا تھا، کیونکہ ان کا ماننا تھا کہ اگر بشار الاسد کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا تو سنی گروہ ان مقامات کو مسما کر دیں گے۔ شام عرب دنیا میں ایران کا سب سے قریبی حلیف ہے، اور تہران نے اس تنازع میں اس خوف کے تحت مداخلت کی کہ اگر شام میں سنی اکثریتی آبادی کی قیادت میں کوئی نئی حکومت قائم ہوئی تو وہ یقیناً سعودی عرب کے ساتھ اتحاد قائم کر لے گی۔

ملک گیر سطح پر ایک نیم فوجی دستے کے قیام کا فیصلہ کیا گیا، جسے نیشنل ڈیفنس فورس (National Defense Force) کا نام دیا گیا۔ شامی جہادی گروہوں اور غیر ملکی جنگجوؤں نے مختلف اتحاد قائم کرنے کے بعد بغاوتی کارروائیوں میں اپنا کردار مزید بڑھا دیا۔ اس کے نتیجے میں شامی جہادی گروہ دو بڑے محاذوں میں یکجا ہو گئے: سیرین اسلامک لبریشن فرنٹ (SILF) اور وہ گروہ جن پر وہابی نظریات کا گہرا اثر تھا، انہوں نے سیرین اسلامک فرنٹ (SIF) تشکیل دی۔ اطلاعات کے مطابق 2013 کے اوائل میں کم از کم 3000 غیر ملکی جنگجو شام کی جنگ میں شامل ہو گئے، جن میں سے بعض سابقہ گوانتانامو بے کے قیدی بھی تھے۔ مارچ 2013 میں، جہادیوں نے فرات دریا کے کنارے واقع کئی چھوٹے دیہاتوں اور قصبوں کے ساتھ ساتھ شمالی شہر رقبہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ شمالی شام اور دمشق میں بین الاقوامی رجحان رکھنے والے یورپی اور شمالی امریکی سلفی جہادیوں کی حیثیت اور اثر و رسوخ میں اضافہ ہو رہا تھا۔

دوسری جانب ایک نیا فریق اسلامی انقلابی گارڈ کور (Islamic Revolutionary Guard Corps) کی صورت میں ابھر کر سامنے آیا، جو حزب اللہ اور دیگر شیعہ ملیشیاؤں کے ساتھ مل کر اسد حکومت کے حق میں لڑنے کے لیے تیار تھا۔ شامی حکومت نے حزب اختلاف اور اس کے عام حامیوں سے نمٹنے کے لیے ہیلی کاپٹر گن شپ اور لڑاکا طیارے استعمال کرنا شروع کر دیے تھے۔ حتیٰ کہ شامی فوج نے کم فاصلے تک مار کرنے والے بغیر رہنمائی والے اسکڈ بیلٹک میزائل بھی رہائشی علاقوں پر داغے۔ فلسطینی اور کرد جنگجو بھی منظرِ عام پر آ گئے، جس سے صورت حال مزید پیچیدہ ہو گئی۔ فری سیرین آرمی (FSA)، جس کی قیادت ترکی میں مقیم تھی، بطور تنظیم تقریباً ختم ہو چکی تھی، اور اس کی جگہ پورے شام میں چھوٹے چھوٹے خود مختار بغاٹی یونٹوں نے لے لی تھی۔ 2013 کی سردیوں کے دوران، وہابی۔ سلفی جہادیوں کی قیادت میں اپوزیشن گروہوں نے کئی قصبے فتح کر لیے اور ان پر سخت شریعت نافذ کر کے وہاں تباہی مچادی۔ یہ پہلا موقع تھا جب صدر اسد کی حکومت کو حقیقی خطرہ لاحق ہوا، کیونکہ حکومتی افواج کی لڑنے کی صلاحیت تیزی سے گھٹ رہی تھی۔ مگر جلد ہی شام میں ایک نئی حقیقت ابھرنے والی تھی۔

ایرانی حمایت یافتہ نیم فوجی گروہوں اور حکومت نواز ملیشیاؤں کی نمایاں موجودگی 2013 کے ابتدائی مہینوں میں شام میں ایک ممکنہ اسٹریٹجک توازن نو کی علامت بننے لگی تھی۔ حکومت اور اس کی حامی افواج نے دمشق، جنوبی شہر حمص اور علویوں کے مرکز میں کچھ علاقوں کو مستحکم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ ایران اور حزب اللہ کی جانب سے حکومت کو دی جانے والی مدد نے صدر اور اس کے جنگجوؤں کو تقویت بخشی، جنہوں نے براہ راست اپوزیشن سے محاذ آرائی کی۔ تاہم شمالی شام میں اپوزیشن گروپوں کا غلبہ بڑھتا جا رہا تھا، اور وہ جہادیوں کی محفوظ پناہ گاہوں میں بدلتا جا رہا تھا۔ دیرالزور میں مختلف قبائل نے جہتہ النصرہ کے ساتھ ایک عملی تعلق قائم کیا اور وہاں کے تیل کے کنوؤں اور تنصیبات پر قبضہ کر لیا۔

2006 میں ایک نمایاں عراقی قبائلی رہنما شیخ ریشاوی نے انباراویکننگ کونسل کے قیام کا اعلان کیا، جس کا مقصد مغربی سنی اکثریتی علاقوں میں داعش کے علاقائی کنٹرول کو محدود کرنا تھا۔

یہ پہلی سطح سے اُبھرنے والا قبائلی اقدام امریکی افواج کی ایما پر، ان کے دیے گئے وسائل اور اسلحے کے ساتھ سامنے آیا۔ درحقیقت، یہ اقدام داعش کی جانب سے سخت شرعی قوانین کے نفاذ کے رد عمل میں سامنے آیا، جن میں خواتین کو مبینہ طور پر جنسی ترغیب دینے والے کھیرے خریدنے سے روکنا اور انس کریم کی تیاری و فروخت پر پابندی عائد کرنا شامل تھا، کیونکہ اسے ”امریکی سامراج“ کی نمائندہ شے سمجھا جاتا تھا۔

سنہ 2007 میں شامی انتظامیہ عالمی سطح پر تنقید کی زد میں آئی جب امریکی انٹیلی جنس نے وائٹ ہاؤس کو اطلاع دی کہ تقریباً 90 فیصد غیر ملکی جنگجو شام کے راستے عراق میں داخل ہو رہے ہیں۔ شبہ ظاہر کیا گیا کہ شامی سکیورٹی اداروں کا ایک حصہ جہادی عناصر سے ساز باز میں ملوث ہے۔ ادھر عراق میں، اسلامی ریاست عراق (ISI) کو شدید باؤ کا سامنا تھا، عراقی سکیورٹی فورسز، اتحادی افواج اور خود سنی عراقی معاشرہ، سب مل کر ISI کو شکست دینے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ امریکی وزیر خارجہ کوئٹہ لیزہ رائس نے شامی وزارت خارجہ سے مطالبہ کیا کہ وہ غیر ملکی جنگجوؤں کے سرچہ دار نیٹ ورک کو بند کرے۔ ISI کی عراق میں سرگرمیوں میں شامی حمایت کا انکشاف اُس وقت ہوا جب ایک سعودی جنگجو نے اعتراف کیا کہ اس نے ایک ایسے تربیتی کیمپ سے تربیت حاصل کی تھی جسے القاعدہ چلا رہی تھی اور جسے شامی انٹیلی جنس کی پشت پناہی حاصل تھی۔ یہ کیمپ شامی انٹیلی جنس کے علم میں تھا۔ ISI کے شدت پسندوں نے شام سے انبار صوبے کے سرحدی علاقوں پر کئی جری حملے کیے۔ 2009-10 میں ISI کے خود کش حملہ آور آزادانہ کارروائیاں کر رہے تھے، اور عراق میں بے مثال تباہی مچا رکھی تھی۔ اکثر اوقات ان کے اہداف یا تو عراقی شیعہ شہری ہوتے یا سکیورٹی فورسز، جو شیعہ اکثریت پر مشتمل تھیں۔

عراق اور شام کے ساتھ غیر ملکی جنگجوؤں کا جہادی رومانس واقعی ایک عالمی رجحان تھا۔ کم از کم 86 ممالک سے رضا کار شام گئے تاکہ اسلامی ریاست کے ساتھ مل کر لڑ سکیں۔ اس کی سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کی بھرتی کی طاقت حیران کن تھی۔ صرف چار یورپی ممالک فرانس، برطانیہ، جرمنی اور بیلجیم سے 5000 سے زائد جنگجو اس تنظیم میں شامل ہوئے۔ یورپی دارالحکومتوں میں ان

کی مکمل واپسی کے سیکیورٹی اثرات پر شدید تشویش پائی جاتی تھی۔ شمالی افریقی ممالک جیسے لیبیا اور تیونس میں غیر ملکی جنگجوؤں کے مراکز بہت متحرک تھے۔ لیبیا کے شہر بنغازی اور درسنہ ایسے مقامات تھے جہاں بھرتی کے لیے وہ اکٹھا ہوتے تھے۔ تیونس میں شہر بن گردان نے سب سے زیادہ جنگجو فراہم کیے۔ وہاں جہاد کی روایت اتنی مضبوط تھی کہ ایک موقع پر الزرقاوی نے یہاں تک کہا تھا: ”اگر بن گردان فلوچہ کے ساتھ واقع ہوتا، تو ہم آسانی سے عراق کو آزاد کرالیتے۔“ جنوبی ایشیائی ممالک، خاص طور پر انڈونیشیا اور فلپینا، سے تقریباً 600 جنگجو شامل ہوئے۔ جو سعودی عرب میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، وہ بھی اس تنظیم کا حصہ بن گئے۔ امریکی تحقیقاتی ادارے ایف بی آئی کے ڈائریکٹر جیمز کومی کے مطابق ستمبر 2015 تک 150 سے زیادہ امریکی اور اتنے ہی کینیڈین شام چکے تھے۔

تاریخی طور پر دیکھا جائے تو سعودی عرب نے گزشتہ کئی دہائیوں کے دوران دنیا کے مختلف حصوں سے جنگجوؤں کی بھرتی کو ممکن بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ 1980 کی دہائی کے اوائل سے ہی، مملکت نے اپنی تیل کی بے پناہ دولت کو استعمال کرتے ہوئے قرآن اور حدیث کی حرف بہ حرف اور بنیاد پرستانہ تعبیر پر مبنی وہابی سلفی ازم کے نہایت تنگ نظر، متعصب اور رجعت پسند نظریے کو پوری دنیا میں پھیلا یا۔ اس نظریے کی جارحانہ برآمد کو مملکت کے مختلف سماجی، ثقافتی اور مذہبی اداروں کے ذریعے ممکن بنایا گیا، جن میں مسلم ورلڈ لیگ (رابطۃ العالم الاسلامی) بھی شامل ہے۔

2014 میں، داعش نے غیر ملکی جنگجوؤں کی ایک ویڈیو جاری کی جس میں وہ اپنے پاسپورٹ نذر آتش کر رہے تھے تاکہ خلافت اسلامیہ اور جہاد کے مقصد سے اپنی دائمی وابستگی کا مظاہرہ کر سکیں۔ یہ ویڈیو پیشہ ورانہ انداز میں فلمائی گئی تھی، جس میں ہر جنگجو اپنے پاسپورٹ کو پھاڑ کر آگ میں پھینکتا ہے اور اپنے ایمان کا اعلان کرتے ہوئے ملک کے حکمرانوں کے خلاف جنگ کا عہد کرتا ہے۔ ویڈیو میں ایک کینیڈین جنگجو کو انگریزی میں مختصر تقریر کرتے ہوئے دکھایا گیا، جو بعد میں عربی زبان میں امریکہ اور کینیڈا کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے: ”ہم آرہے ہیں اور تمہیں تباہ کر دیں گے۔“ ویڈیو میں سعودی عرب، مصر، اردن اور چین جیسے ممالک کے جنگجو بھی نظر آتے

ہیں، جو داعش کے ساتھ اپنی عمر بھر کی وفاداری کا اعلان کرتے ہیں۔ 2015 تک، عراق کے مغربی علاقے، شام کے مشرقی حصے اور ترکی کی سرحد تک پھیلا ہوا دریائے فرات کا پورا وادی علاقہ داعش کے قبضے میں تھا۔ اس پورے علاقے کا تخمینہ برطانیہ کے برابر لگایا گیا۔ شام اور عراق کی سرحد تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ عراق میں تمام سنی اکثریتی علاقے، جو ملک کا تقریباً چوتھائی حصہ تھے، ایک وقت میں داعش کے قبضے میں تھے۔

ایک مراکشی۔ سوڈن شہری، ابو قصورہ المغرب، جس نے پہلے افغانستان میں جہادی تربیت حاصل کی تھی، کو موصل شہر کے امور سنبھالنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ 2008 میں اس کی ہلاکت کے بعد، ایک شامی شہری، ابو محمد الجولانی کو یہ ذمہ داری دی گئی۔ 2009 میں، امریکی اسپیشل فورسز نے داعش پر اپنے حملے تیز کر دیے اور تنظیم کے کئی سینئر رہنما مارے گئے۔ تاہم، امریکی قیادت میں اتحادی افواج کی جانب سے حاصل کی گئی برتری اس وقت کمزور پڑ گئی جب وسط 2009 سے لے کر اگست 2010 تک انخلاء کا عمل شروع ہوا۔ صدر اوباما نے جنگی مشن ختم کرنے اور بغداد میں نوری المالکی کی شیعہ حکومت کے ساتھ ایک پروٹوکول طے کرنے کی سنجیدہ کوششیں کیں۔ انہوں نے دسمبر 2010 کے بعد ملک کے اندرونی امن و امان کو یقینی بنانے کے لیے 150000 امریکی فوجیوں کے ساتھ امریکی اڈے برقرار رکھنے کی تجویز پیش کی۔ تاہم، عراقی پارلیمان نے ایرانی دباؤ کے تحت اس امریکی تجویز کو مسترد کر دیا اور داعش کی قیادت میں ابھرنے والی سنی بغاوت کو نظر انداز کر دیا۔ بعد میں، صدر اوباما نے اس انکار کو معمولی قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ عراق کا اپنے مستقبل کی تشکیل کا عمل ہے۔

شامی سکیورٹی فورسز نے ملک میں عرب بہار کے دوران ہونے والی بغاوتوں اور احتجاج کو انتہائی بے رحمی سے پکڑ دیا، جس میں سڑکوں پر نو جوانوں، بوڑھوں اور بچوں کو قتل کیا گیا۔ اس ظلم پر پورے شام میں عام شہری شدید متاثر ہوئے۔ انہوں نے انٹرنیٹ کا استعمال کرتے ہوئے سکیورٹی فورسز کے مظالم کی ویڈیوز اپلوڈ کیں، ہجوم کو متحرک کیا اور احتجاج میں شدت پیدا کی، یوں رفتہ رفتہ ایک انقلابی تحریک نے جنم لیا۔ ابتدائی مرحلے میں لوگ آزادی، بنیادی حقوق،

کرپشن کے خلاف آواز اور حکمرانی میں عوامی شرکت جیسے مسائل اٹھا رہے تھے۔ پورے خاندان، دادا دادی سے لے کر پوتے پوتیوں تک، پُر امن مارچوں میں حصہ لیتے تھے، اس امید پر کہ یہ عوامی تحریک بشار الاسد حکومت سے کچھ رعایت حاصل کر لے گی۔ مگر سیکورٹی فورسز کے مسلسل اور سخت ردِ عمل نے تمام اپوزیشن گروہوں کو ایک ساتھ لاکھڑا کیا، جنہوں نے کئی خود ساختہ تحفظاتی ملیشیاں قائم کیں، جو 2011 کی گرمیوں تک 'فری سیرین آرمی' (FSA) کی شکل اختیار کر گئیں۔ اسی دوران، مارچ سے جیلوں سے رہا ہونے والے جہادی بھی ایک دوسرے سے جُڑ کر قدرے زیادہ اسلام پسند مزاج کی مزاحمتی فورس تشکیل دینے لگے۔

1990 کی دہائی کے اواخر میں، حافظ الاسد جو بشار الاسد کے والد تھے، نے ایک شعوری فیصلہ کیا کہ شام میں وہابی سلفی ازم کی زیادہ کھلے عام تبلیغ کی اجازت دی جائے۔ اس کے نتیجے میں ملک بھر میں درجنوں نئی مساجد، اسلامی اسکول اور قرآنی مراکز قائم کیے گئے، جن کی مالی معاونت سعودی عرب کی مسلم ورلڈ لیگ نے کی۔ وہابی-سلفی نظریات پر مبنی اسلامی لٹریچر اور قرآن کی تشریحات کو تمام سنی مساجد اور مدارس میں متعارف کرایا گیا، جس کے ذریعے شام کے سنی مسلمانوں میں رائج حنفی صوفی روایت کو پس منظر میں دھکیل دیا گیا۔ یہ ادارے سخت گیر، عدم برداشت پر مبنی، سلفی اسلام کے گڑھ بن گئے۔ صوفی سنی روایات سے پیدا ہونے والی اعتدال پسندی کا اثر پورے شام میں زوال پذیر ہونے لگا۔ افسوسناک طور پر، بشار الاسد نے بھی اپنی حکمرانی کے ابتدائی برسوں میں ان جہادی عناصر کی حمایت کی، اس غلط فہمی کے تحت کہ یہ عناصر ان کی حکومت کو سہارا دیں گے۔ مگر اس کے برعکس، وہابی اثر و رسوخ آہستہ آہستہ مضبوط ہوتا گیا اور ان کی موجودگی سنی اکثریتی جنوبی شہر درعا اور شمالی شہر حلب میں نمایاں ہونے لگی۔

ایک اہم مبلغ محمود اول الغاسی تھے، جو حلب کی مسجد السحور سے اپنے نظریات کی تبلیغ کر رہے تھے۔ اس وقت فلسطین کا مسئلہ اور اس سے جڑی تازہ جھڑپیں خبروں میں چھائی ہوئی رہتی تھیں۔ ابھرتے ہوئے شامی جنگجوؤں کے لیے امریکہ میں پیش آنے والے 11 ستمبر کے واقعات ایک زبردست تحریک کا باعث بنے، اور تمام وہابی سنی جنگجو اسامہ بن لادن اور اس کی تنظیم القاعدہ کی

”فتح“ کا جشن مناتے نظر آئے۔ شامی معاشرے کا ایک طبقہ ہمیشہ سے امریکہ اور اسرائیل مخالف بیانے کا پیروکار رہا تھا۔ لہذا یہ حیرت کی بات نہ تھی کہ 9/11 کے بعد ملک کے مختلف حصوں میں تنہائی میں جشن منائے گئے۔ بعث پارٹی اور حافظ الاسد کی جانب سے تعمیر کردہ طاقتور سکیورٹی نظام نے ان عناصر کو گرفتار کر کے امریکہ کو جہادیوں کے خلاف جنگ میں غیر مبہم حمایت فراہم کی۔ حلب، جو روایتی طور پر سنی اکثریتی اسلامی شہری مرکز تھا، آہستہ آہستہ وہابی۔ سلفی اسلام کے مرکز میں بدلنے لگا، جس کی طرف شام کے دیگر حصوں سے بھی کئی جنگجو متوجہ ہوئے۔ ابو القعقاع کی تحریک غرباء الشام (Ghuraba al-Sham) تیزی سے طاقت حاصل کر رہی تھی، اور جلد ہی وہ حلب میں غالب آ گئی۔ یہاں تک کہ سکیورٹی فورسز بھی اسے روکنے سے قاصر ہو گئیں۔ جلد ہی ایک ہزار سے زائد رضا کاروں نے حلب کے مضافاتی رہائشی علاقوں میں سخت شریعت نافذ کرنے کی کوشش کی۔ رات کے وقت، جہادی ”اخلاقی پولیس“ گشت پر نکلنے لگی اور ان شہریوں کو خوفزدہ کرنے لگی جو شام کی روایتی آزاد طرز زندگی کے عادی تھے۔

آسٹریا کی وزارت داخلہ کے مطابق 230 شناخت شدہ افراد شام اور عراق کا رخ کر چکے تھے تاکہ داعش میں شامل ہو سکیں۔ یہ جانے والے آسٹریائی شہری زیادہ تر چیچن، ترک اور بلقان نژاد تھے، جو کہ دوسری یا تیسری نسل کے تارکین وطن تھے اور ان کی عمریں 18 سے 35 برس کے درمیان تھیں۔ سرکاری ذرائع سے حاصل شدہ تازہ ترین اندازوں کے مطابق، نیٹو کے 515 جہادی روانہ ہوئے، جن میں 47 خواتین شامل تھیں۔ ڈینش سکیورٹی وائیلینس سروس (PET) کے مطابق، کم از کم 125 افراد ڈنمارک سے شام اور عراق گئے۔ فرانسیسی سکیورٹی ایجنسیوں کے مطابق، فرانس سے 900 سے زائد افراد شام اور عراق گئے، جو یورپی جہادیوں میں سب سے بڑی تعداد ہے۔ ان میں اکثریت مراکش، تیونس، الجزائر اور سینیگال کے دوسرے یا تیسرے نسل کے تارکین وطن کی تھی، جن میں تقریباً 23 فیصد نو مسلم تھے۔ جرمنی کے وفاقی پراسیکیوٹر کے ذرائع کے مطابق، 20 سے 30 سال کی عمر کے 750 افراد ملک سے جہاد کے لیے روانہ ہوئے۔ اس گروہ میں تقریباً 12 فیصد نو مسلم تھے اور زیادہ تر کم اجرت والی ہنرمند ملازمتوں میں مصروف

تھے۔ سرکاری ریکارڈ کے مطابق، نیدرلینڈز سے 25 سال سے کم عمر کے تقریباً 220 جہادی داعش میں شامل ہونے کے لیے گئے، جن میں اکثریت کا تعلق نچلے درمیانے طبقے سے تھا اور ان کے نسلی پس منظر میں مراکشی، صومالی، انٹیلیائی (جزائر غرب الہند) اور ترک شامل تھے۔ ان میں سے اکثر اپنی سماجی حیثیت سے شدید مایوس تھے یا نسل کی بنیاد پر امتیازی سلوک کا سامنا کر رہے تھے۔

اسپین، جو یورپ کا ایک اور ایسا ملک ہے جہاں مسلمانوں کی معقول تعداد موجود ہے، سے تقریباً 139 جہادی جنگجو، جن کی عمریں عموماً پچیس برس کے لگ بھگ تھیں، شام اور عراق گئے۔ یہ مغربی ممالک سے ہونے والی جارحانہ جہادی تحریک کا حصہ تھے۔ برطانیہ کے دفتر سلامتی و انسداد دہشت گردی (OSCT) کے مطابق، تقریباً 700 برطانوی نژاد نوجوان، جن کی عمریں 18 سے 30 برس کے درمیان تھیں، جہاد کے لیے روانہ ہوئے۔ ان میں اکثریت عرب، جنوبی ایشیائی نسلی گروہوں اور افریقی نو مسلموں پر مشتمل تھی۔ داعش کی بھرتی کی ویڈیوز اور سوشل میڈیا پیغامات اتنے مؤثر تھے کہ کروشیا، چیک ریپبلک، ایٹونیا، فن لینڈ، آئرلینڈ، اٹلی، لاطویا، لکسمبرگ، مالٹا، پولینڈ، پرتگال، رومانیہ، سلوواکیا، سلوونیہ اور ڈنمارک جیسے ممالک سے بھی جنگجو اس میں شامل ہوئے۔ 2016 کے اوائل تک اندازاً 43000 سے زائد ایسے جہادی، جن کی عمریں 35 برس سے کم تھیں، یورپ سے داعش میں شامل ہونے کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ نیدرلینڈز میں قائم بین الاقوامی مرکز برائے انسداد دہشت گردی (CCT) کی رپورٹ کے مطابق، سال 2015 میں یورپی یونین سے شام و عراق جانے والے مسلمان جہادیوں کی سب سے بڑی نقل مکانی دیکھی گئی۔ اس کی ایک بڑی وجہ، رپورٹ کے مطابق، شام میں اسلامی خلافت کے جلد قائم ہونے کے اعلان کو قرار دیا گیا۔

صدر بشار الاسد نے 2010 تک شام میں اقتدار کے دس برس مکمل کر لیے تھے۔ سیاست میں وہ اپنے والد حافظ الاسد کی حکمت عملی کو ہی آگے بڑھا رہے تھے۔ اگست 2011 تک دمشق اور شمالی شام میں متعدد جنگجو گروہ قائم ہو چکے تھے، جن میں داعش نے بھی ایک اعلیٰ کمانڈر کو شام بھیجا تاکہ وہاں تنظیم کا شاخہ قائم کیا جاسکے۔ جیسے جیسے سال کے اختتام تک پورے ملک میں پرتشدد

جھڑپیں بڑھنے لگیں، داعش نے دمشق میں شام کی فوجی انٹیلی جنس کی تنصیبات کے باہر پہلا خودکش حملہ کیا۔ جب حمص، حلب، دمشق، دیر الزور اور رقبہ میں حکومت مخالف احتجاج شدت اختیار کر گئے، تو شامی سکیورٹی فورسز نے ہوائی بمباری سمیت بدترین جبر سے ان کو کچل دیا۔ صدر بشار الاسد نے ان ہنگاموں کو بیرونی سازش قرار دیا۔ لڑائی میں شدت آگئی تھی۔ شامی فوج کے متعدد سنی افسران بغاوت کر کے داعش کی قیادت میں لڑنے والے غیر ملکی جنگجو محاذ میں شامل ہو رہے تھے۔ جیسے جیسے ان منحرف افسران کی خبریں پھیلیں، شامی فوج کا مورال زمین بوس ہو گیا۔ افسران بے گناہ شہریوں پر فائرنگ کے احکامات ماننے سے انکار کر رہے تھے۔ حیرت انگیز طور پر، اسی دوران صدر الاسد نے ایک حکم نامے پر دستخط کیے، جس کے تحت انخوان المسلمون اور دیگر سیاسی قیدیوں کو عام معافی دے دی گئی۔ اس فیصلے کے نتیجے میں بڑی تعداد میں جنگجو قیدی رہا ہو گئے، جن میں سے کئی نے جاری بغاوت میں سرگرم کردار ادا کیا۔ حمص اور حلب میں جاری فضائی بمباری اور شہریوں کے قتل عام نے تجزیہ کاروں کو اس نتیجے پر پہنچنے پر مجبور کر دیا کہ صدر الاسد نے انقلاب کا حل صرف سکیورٹی کی سخت حکمت عملی میں تلاش کیا ہے۔

محمد الجولانی، جو گولان کی پہاڑیوں کے علاقے سے تعلق رکھنے والا ایک شامی نژاد جہادی تھا، امریکی قبضے کے دوران عراق گیا اور وہاں القاعدہ میں شامل ہو گیا۔ ابو بکر البغدادی نے اُسے ہدایت دی کہ وہ واپس شام جا کر داعش سے منسلک سیلر منظم کرے۔ 2008 میں وہ موصل میں متعین رہا اور 2006 میں الزرقاوی کی ہلاکت کے بعد تنظیم میں ترقی حاصل کی۔ اکتوبر 2011 میں جہبۃ النصرہ کی تشکیل عمل میں آئی، جسے عراق میں قائم داعش نے مالی معاونت فراہم کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔ ابتدائی ملاقاتوں میں، الجولانی اور دیگر رہنماؤں نے اس تنظیم کی نظریاتی بنیادیں اور مذہبی و سیاسی مقاصد نہایت واضح طور پر طے کیے۔ جلد ہی داعش کے دیگر نمایاں جنگجو بھی اس میں شامل ہو گئے۔ جہبۃ النصرہ نے اپنی موجودگی کا باضابطہ اعلان 2012 کے اوائل تک نہیں کیا، کیونکہ اس کا بنیادی ہدف شام پر مرکوز تھا۔ اگرچہ النصرہ کے مرکزی اراکین کے داعش سے مضبوط روابط تھے، لیکن انہوں نے کبھی اس کا علانیہ اظہار نہیں کیا۔ طے شدہ حکمت عملی

کے تحت النصرہ نے حلب اور حمص میں ایسے اہداف پر حملے کیے، جن سے اسد حکومت کی سیکورٹی فورسز کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچے۔ اس کے بعد اطلاعات آئیں کہ سنی اکثریتی علاقوں میں مبینہ طور پر حکومت نواز ملیشیاؤں نے عام شہریوں کا قتل عام کیا ہے۔

دیگر عرب ممالک کا کردار

سعودی عرب اور قطر کی حکومتیں شام میں سیاسی و عسکری بغاوت کی ابتدائی حامی تھیں، تاہم کویت سے تعلق رکھنے والے افراد اور اداروں کی نجی مالی معاونت نے اس بغاوت کو برقرار رکھنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ خاص طور پر کویتی سلفیوں کی جانب سے اسلامی ورثہ سوسائٹی (Islamic Heritage Society) کے تحت کی جانے والی چندہ جمع کرنے کی کوششیں قابل ذکر تھیں۔ اس وقت اکثریتی فنڈ زان گروپوں کو بھیجے جا رہے تھے جو فری سیرین آر می (FSA) سے وابستہ تھے۔ 2012 کے اوائل میں، القاعدہ کے رہنما ایمن الظواہری نے شام میں حکومت کے خلاف جہاد کی اپیل کی اور تمام جہادیوں سے مطالبہ کیا کہ وہ شام کا رخ کریں اور اسلامی انقلاب کی حمایت کریں۔ وسط 2012 تک شام تیزی سے خانہ جنگی کی طرف بڑھ رہا تھا کیونکہ غیر ملکی جنگجو منظم طریقے سے وہاں پہنچ رہے تھے۔ جولائی کے اختتام تک، مسلح بغاوت کی صفوں میں النصرہ اور ایف ایس اے کے جھنڈے تلے سینکڑوں غیر شامی جنگجو شامل ہو چکے تھے۔

سعودی عرب مشرق وسطیٰ میں صرف اپنی بے پناہ تیل کی دولت کی وجہ سے اہم نہیں تھا، بلکہ اس کی اصل اہمیت اس بات میں تھی کہ یہ وہ عالمی مرکز تھا جہاں سے وہابی سلفی ازم کی نہایت سخت گیر اور بنیاد پرست نظریاتی تعبیر دنیا بھر میں پھیلانی جا رہی تھی۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں سے اسلام کا ایک خوفناک تصور برآمد ہو رہا تھا، جو سخت شریعت، غیر سنی مسالک اور غیر مسلموں کے لیے شدید نفرت پر مبنی تھا۔ وہابی اسلام کی طرف سے فروغ دی جانے والی یہ مذہبی عدم برداشت اور سیاسی آمرانہ روش، جس میں تشدد کو بلا دربلغ اختیار کیا جاتا ہے، 1930 کی دہائی کے یورپی فاشزم سے کئی حوالوں سے مشابہت رکھتی ہے۔ حیرت انگیز طور پر، حالیہ دہائیوں میں وہابیت نے عالمی سطح پر مرکزی دھارے کے سنی اسلام پر تقریباً مکمل غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ سعودی عرب نے ایک کے

بعد دوسرے ملک میں وہابی ازم کے فروغ کے لیے بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کی، جس میں اماموں کی تربیت، مساجد کی تعمیر اور اسلامی مطالعاتی مراکز کا قیام شامل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سنی اور شیعہ کے درمیان فرقہ وارانہ کشمکش نے شدت اختیار کر لی کہ لاس اینجلس سے لے کر ٹوکیو تک، الاسکا سے لے کر کیپ ٹاؤن تک شیعہ مسلک کے ماننے والے خود کو ایک بے مثال شدت اور سفاکی کے ساتھ نشانہ بننا ہوا پانے لگے۔

فرقہ واریت آج بھی چھوٹے بڑے ہر مسلم معاشرے میں مختلف مسالک کے تعلقات کو زہر آلود کر رہی ہے۔ نیویارک میں ایک مسلم دوست نے کہا: ”کسی بھی سنی یا شیعہ فرد کی ایڈریس بک دیکھ لیجیے، آپ کو اُن کے اپنے مسلک سے باہر کے افراد کے نام بہت کم ملیں گے۔“ حقیقت یہ ہے کہ خود سعودی عرب، اردن اور ترکی بھی اُس عفریت سے خوفزدہ ہیں جسے انہوں نے وہابی سلفیت کو فروغ دے کر خود ہی پیدا کیا ہے۔ یہ بات بہت سوں کے لیے ناقابل فہم ہے کہ امریکہ اور اُس کے مغربی اتحادی آج بھی سعودی عرب جیسی تھوکر ٹیک مطلق العنان بادشاہت کے ساتھ کھڑے ہیں، جو کہ وہابیت کو عالمی سطح پر پھیلانے والا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ القاعدہ اور داعش جیسے گروہ دوبارہ ابھر رہے ہیں کیونکہ عدم برداشت اور خارجیت پر مبنی سلفی نظریات نے وقت کے ساتھ مسلم معاشروں میں گہری جڑیں پکڑ لی ہیں۔ اور یہ سب کسی اور کی نہیں بلکہ خود سعودی عرب کی بدولت ممکن ہوا ہے، جس نے نہایت ہوشیاری سے دنیا بھر میں مسلمانوں کے ایک طبقے کو داعش کے لیے عالمی سطح پر منظم اور مسلح کر دیا ہے۔

1979 کے بعد وہابیت کے عالمی پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ، ایک اور اہم عنصر جو مسلم برادری میں انتہا پسندی کو فروغ دے رہا ہے، وہ مغربی ممالک کی مشرق وسطیٰ سے متعلق پالیسی ہے، جو غالب، استحصالی اور سماجی و مذہبی حساسیت سے عاری ہے۔ یورپی معاشروں میں مسلم برادری کا عدم انضمام انہیں ہمیشہ مرکزی دھارے سے دور رکھتا ہے۔ ان کے ارد گرد کا سماجی ڈھانچہ اور ان کے خاندانوں کا سلفی طرز زندگی پر سختی سے عمل کرنے کا اصرار انہیں تنہا کر دیتا ہے، اور وہ زیادہ تر وقت انٹرنیٹ پر گزراتے ہیں۔ یہ تنہائی انہیں مایوس، پڑمرده اور میزبان ملک کی تہذیبی حقیقتوں

سے بیگانہ کر دیتی ہے، جس کے نتیجے میں وہ جہادی اماموں کی اشتعال انگیز تقاریر اور انٹرنیٹ پر جاری آن لائن انتہا پسندی کا آسان شکار بن جاتے ہیں۔

2014 کے خزاں تک، اسلامی ریاست (داعش) 15 برسوں سے زائد کی ارتقائی منزلیں طے کر چکی تھی، اور اس نے افغانستان پر امریکی یلغار اور عراق میں اس کی عسکری قوت کے باوجود اپنی بقا قائم رکھی۔ اگر جہادی تحریک کو اپنی تصوراتی ریاست کو حقیقت کا روپ دینا تھا، تو سب سے پہلے اسے کسی مقام پر ایک قابل عمل ریاست قائم کرنی تھی، اور پھر اس میں عملی نظام کار کو دانش مندی سے شامل کر کے اسے خود مختار حیثیت میں کھڑا کرنے کا موقع دینا تھا۔ 2014 کا موسم گرما داعش اور عالمی جہادی تحریک کے لیے ایک فیصلہ کن موڑ تھا۔ عراق میں پیش آنے والے واقعات۔ براہ راست شامی تنازعے کے مستقبل پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ داعش کی فوجی کامیابی، جس کے نتیجے میں اس نے شام اور عراق کے 670 کلومیٹر کے علاقے پر قبضہ کر لیا، ایک انقلابی پیش رفت تھی، جو دنیا بھر میں جہادی عسکریت کی سمت کو یکسر بد کرنے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

موصل پر قبضہ

9 جون 2014 تک، داعش نے شہر کے کئی اہم مقامات پر قبضہ کر لیا تھا، جیسے کہ فیڈرل پولیس ڈویژن کا صدر دفتر، بین الاقوامی ہوائی اڈہ، اور صوبائی کونسل کی عمارتیں۔ خود کش بمباروں کو فوجی گوداموں اور دیگر مزاحمتی مقامات پر مؤثر حملوں کے لیے استعمال کیا گیا۔ 10 جون کو داعش نے چھ دن کی شدید لڑائی کے بعد 30000 عراقی فوجیوں اور 30000 فیڈرل پولیس اہلکاروں پر مشتمل فورس کو شکست دے کر موصل پر مکمل قبضہ کر لیا۔ اس قبضے کے دوران داعش کو بھاری مقدار میں اسلحہ، مختلف فوجی گاڑیاں، اور بڑی تعداد میں ہمز (Humvees) حاصل ہوئیں۔ شہر کے مقامی بینکوں میں بہت بڑی نقدی موجود تھی، جہاں سے داعش نے تقریباً 2 ارب امریکی ڈالر نکال لیے۔ موصل پر حملے سے قبل وہ رقبہ اور دیر الزور کے کچھ حصوں پر عملی کنٹرول حاصل کر چکے تھے۔ شہر کی مرکزی جیل 'بادوش' کو خالی کرایا گیا اور 15000 سے زائد قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔ امریکی حملے کے بعد بھرتی کیے گئے 600 سے زائد شیعہ عراقی فوجیوں کو قریبی صحرائی گھاٹی میں قتل کر دیا

گیا۔ موصل میں اپنی انتہائی مستحکم کرنے کے بعد، داعش نے فلو جہ جیسے دیگر سنی اکثریتی علاقوں پر بھی قبضہ کیا۔ بعد ازاں، انہوں نے کرکوک، زاب، نینوی، رشاد، اور حویجہ پر بھی کنٹرول حاصل کیا۔ پھر وہ سیدھے ہائی وے کے راستے صلاح الدین کے شمالی شہر کی طرف بڑھے۔ داعش کے جنگجوؤں نے تکریت کا محاصرہ کیا، جس سے وہاں کے ایئر اکیڈمی میں زبردست خوف و ہراس پھیل گیا۔ خوف کے مارے 3000 فوجیوں نے اپنی وردیاں اتار کر پیدل فرار اختیار کیا۔

داعش جنگجو تنہا نہیں تھے۔ حقیقت میں، کئی سنی مسلح ملیشیا گروہوں کے افراد، جو مختلف تنظیموں سے تعلق رکھتے تھے، اس مسلح بغاوت میں شریک تھے۔ قیدیوں کی گرفتاری اور بعد ازاں سیکڑوں افراد (اکثر شیعہ) کے قتل کے علاوہ، داعش نے موصل کے باہر کئی ترک ٹرک ڈرائیوروں کو اغوا کیا اور شہر میں ترک قونصل خانوں پر حملے کیے۔ سنی انتہا پسند شمال کی طرف کرد علاقوں میں بڑھنے لگے، لیکن وہاں انہیں پیشمرگہ فورسز اور کرد فوج کی طرف سے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ عراق تیزی سے فرقہ وارانہ اور نسلی بنیادوں پر تقسیم ہو رہا تھا۔ کرد شمال میں اپنی خود مختاری قائم کرنے کے لیے کوشاں تھے، اور سنیوں کی ایک بڑی اکثریت انقلاب کی حمایت کر رہی تھی۔ ادھر شیعہ اکثریتی نوری المالکی حکومت سنی آبادی کے جائز مطالبات کو مسلسل نظر انداز کر رہی تھی۔ حکومتی افواج سخت مشکلات کا شکار تھیں، اور وہ تیزی سے اپنا علاقہ، رسد اور انسانی وسائل کھورہی تھیں۔

عراقی افواج کی پسپائی خود ان کے کمانڈنگ افسران کی قیادت میں ہوئی۔ نیجی کے قصبے میں، جو عراق کی سب سے بڑی آئل ریفاہنری کا مرکز ہے، انہوں نے کسی مزاحمت کے بغیر ہتھیار ڈال دیے، جیسا کہ تکریت میں بھی ہوا۔ دونوں جگہوں پر کمانڈنگ افسران کو ہیلی کاپٹروں کے ذریعے نکالا گیا۔ تکریت میں، جن سپاہیوں نے ہتھیار ڈالے، انہیں سنی اور شیعہ گروہوں میں تقسیم کیا گیا، اور تمام شیعہ سپاہیوں کو ایک خندق کے سامنے کھڑا کر کے مشین گن سے بھون دیا گیا۔ اس قتل عام کی ویڈیو ریکارڈ کی گئی تاکہ عراقی سکیورٹی فورسز کے باقی یونٹوں کو خوفزدہ کیا جاسکے۔ امریکہ کی رپورٹ کے مطابق موصل اور شمالی عراق کے دیگر علاقوں کے سقوط کے دوران 18 میں سے 5 فوجی اور پولیس ڈویژنز بکھر گئیں۔ یہ شکست زیادہ تر حکومت کے اعلیٰ حلقوں میں بے یقینی اور

گھبراہٹ کا نتیجہ تھی، کیونکہ بیشتر کمانڈنگ افسران خود وزیراعظم کے منتخب کردہ تھے۔ سیکورٹی فورسز کی اس ذلت آمیز ہتھیار ڈالنے نے عوام کو شدید خوف میں مبتلا کر دیا۔ افواہیں گردش کرنے لگیں کہ داعش جلد ہی بغداد پر حملہ کرے گی، جو تکریت اور فلوجہ سے صرف ایک گھنٹے کی ڈرائیو پر واقع تھا۔ بغداد کے سنی محلے، جیسے دجلہ کے مشرقی کنارے پر واقع الاعظمیہ، سنسان دکھائی دینے لگے۔ داعش بیتاب تھی کہ وہ بغداد کے کچھ حصے بھی قبضے میں لے، کیونکہ یہ شہر نہ صرف ایک عظیم عرب دارالحکومت رہا ہے بلکہ خلافت کا قدیم مرکز بھی۔ اس پر قبضہ عالمی میڈیا کی توجہ حاصل کرتا اور داعش کے نئے اسلامی ریاست کے قیام کے دعوے کو زبردست سا کھراہم کرتا۔

موصل کے سقوط نے عراق کی تین بڑی کمیونٹیز، شیعہ، سنی اور کرد کے درمیان طاقت کے توازن کو بدل کر رکھ دیا۔ غیر شیعہ علاقوں میں شیعہ حکمرانی کو ایسا دھچکا لگا جس سے سنبھلنا مشکل ہو گیا؛ جبکہ کردوں کا اثر و رسوخ ان علاقوں تک پھیل گیا جہاں کرد اور عرب آبادی ملی جلی تھی؛ اور 50 سے 60 لاکھ کے درمیان سنی عرب اب کبھی بھی حاشیے پر نہیں ڈالے جاسکیں گے۔ طاقت کا یہ توازن صرف عراق ہی میں نہیں بدل رہا تھا، بلکہ اس کا دائرہ شام تک وسیع ہو چکا تھا۔ عراق اور شام کی سرحد عملی طور پر ختم ہو چکی تھی۔ شام میں داعش کی قوت بڑھ رہی تھی، کیونکہ عراق میں مستح کیے گئے علاقوں سے حاصل ہونے والا اسلحہ اور دولت اب اس کی پشت پر تھی۔

بگڑتی ہوئی صورت حال کو سنبھالنے کے لیے، عراق کے سرکردہ شیعہ عالم، آیت اللہ العظمیٰ علی السیستانی کو 13 جون 2014 کے جمعہ خطبے میں ایک پر جوش اپیل کرنی پڑی کہ تمام جسمانی طور پر تندرست عراقی شہری آگے بڑھیں اور داعش کے دہشت گردوں سے اپنی مقدس سرزمین کا دفاع کریں۔ اُسی شام، ہزاروں شیعہ رضا کار تاجی میں جمع ہو گئے تاکہ سنی بغاوت کے خلاف لڑنے کے لیے ابتدائی تربیت حاصل کر سکیں، یہ بغاوت عراق اور شام میں ایک سونامی کی طرح پھیل رہی تھی۔ اطلاعات آ رہی تھیں کہ سنی اکثریتی صوبہ انبار، جس کی آبادی 15 لاکھ کے قریب تھی، مکمل طور پر سقوط کا شکار ہو چکا ہے۔ ایسے میں امریکہ اس فرقہ وارانہ جنگ کے انتشار زدہ منظر نامے میں داخل ہوا، جب صدر اوباما نے 275 فوجی اہلکاروں کو عراق بھیجنے کی منظوری دی۔

داعش عراق میں قصبہ در قصبہ فتح کرتا جا رہا تھا اور سپاہیوں کو قتل کر رہا تھا۔ اس کی غیر معمولی کامیابی نے دنیا بھر کے عرب تجزیہ کاروں کو حیران کر دیا تھا۔ موصل پر قبضے کے بعد داعش نے بھاری مقدار میں اسلحہ، گولہ بارود اور ہموی گاڑیاں مشرقی شام منتقل کیں تاکہ وہاں اپنے حملوں کو تقویت دے سکے۔ داعش کے میڈیا ونگ، ”الحدیث میڈیا سینٹر“، نے 19 جون 2014 کو ایک ایچ ڈی ویڈیو جاری کی جس کا عنوان تھا ”جہاد کے بغیر زندگی نہیں“، جس میں مغربی ممالک کے انگریزی بولنے والے مسلمانوں کو جہاد کے لیے بلایا گیا تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ آسٹریلیا، برطانیہ، امریکہ اور کینیڈا سے بڑی تعداد میں بھرتیاں ہوئیں، اور صرف آسٹریلیا اور برطانیہ سے 700 سے زائد جنگجو داعش میں شامل ہو گئے۔ عراق اور شام میں داعش کی قیادت اپنی شاندار کامیابیوں سے نہایت پرجوش ہو چکی تھی، کیونکہ وہ شمالی عراق اور مشرقی شام کے بڑے رقبے پر قابض ہو چکی تھی۔ عراق اور شام کی سرحد پر موجود چیک پوسٹیں اب مکمل طور پر داعش کے جنگجوؤں کے کنٹرول میں تھیں۔

عراق کے لیے، ابوبکر البغدادی کی جانب سے ایک نئی خلافت کے قیام کا اعلان، جو کہ 1924 میں مصطفیٰ کمال اتاترک نے ترکی میں ختم کر دی تھی، عملاً اعلانِ جنگ تھا۔ بغداد کے عوام کے لیے، جو کہ سات ملین کی آبادی پر مشتمل ایک شیعہ اکثریتی شہر ہے، اسلامی ریاست (داعش) کی توسیع ایک بھیانک خواب بن چکی تھی۔ ابوبکر البغدادی موصل میں ایک قافلے کے ساتھ داخل ہوا، بالکل ایک ریاستی سربراہ کی طرح۔ قافلے کی قیادت گھوڑے کر رہے تھے جن پر داعش کے جھنڈے لہرا رہے تھے، جبکہ چھچھاتی SUVs کے دونوں اطراف چار چار موٹر سائیکل سوار تھے۔ اسی قسم کا جلوس شام میں داعش کے عملی دار الحکومت رقبہ میں بھی نکالا گیا۔ البغدادی نے 1 جولائی 2014 کو ایک ویڈیو جاری کی، جس میں اس نے اپنی تنظیم کی اسلامی اقدار اور خلافت کے قیام کے نظریے پر زور دیا۔ ایک ایسا تصور جسے تمام مسلمانوں کو مضبوطی سے اپنانا اور مستحکم کرنا چاہیے۔ اُس کے بقول، خلافت کا قیام دنیا بھر میں سنی مسلمانوں کی عظمت اور طاقت کی بحالی کا ذریعہ تھا۔ اسلامی ریاست (داعش) کی ساخت ایک اہرام کی مانند تھی، جس کی چوٹی پر ابوبکر البغدادی

”امیر المؤمنین“ (مسلمانوں کا سربراہ) کے طور پر موجود تھا۔ اس کے تحت دو نائبین تھے۔ ایک شام کے لیے اور ایک عراق کے لیے۔ اس درجہ کے نیچے دس وزراء پر مشتمل ایک کابینہ، اس کے بعد والیوں (گورنروں) کی ایک صف، اور بارہ ارکان پر مشتمل ایک عسکری کونسل موجود تھی۔ اگرچہ انہوں نے رسمی طور پر اسے ”ریاست“ نہیں کہا، لیکن ان کا طرز عمل مکمل طور پر ریاست جیسا تھا، اور اس کی داخلی ساخت بھی اسی بنیاد پر ترتیب دی گئی تھی۔ جب 2010 میں البغدادی نے تنظیم کی قیادت سنبھالی اور تیزی سے بااثر شخصیت بن کر ابھرا، تو داعش میں ”عراقی کاری“ (Iraqization) کا عمل شروع ہوا، جس کے تحت اعلیٰ عہدے ان افراد کو دیے گئے جو صدام حسین کی بعث پارٹی کی حکومت میں اہم عہدوں پر فائز رہ چکے تھے۔ اسلامی ریاست کی کل آمدنی کا تخمینہ ماہانہ 10 لاکھ سے 30 لاکھ امریکی ڈالر کے درمیان تھا، جس نے اسے دنیا کی سب سے مالدار دہشت گرد تنظیم بنا دیا تھا۔ یہ فنڈز نہ صرف تنخواہیں ادا کرنے کے لیے استعمال ہوتے تھے بلکہ زیر قبضہ علاقوں میں مقامی حکومتیں چلانے کے لیے بھی۔ کچھ ڈالر قبائلی وفاداریاں خریدنے میں بھی استعمال کیے جاتے تھے۔ داعش کی حکمرانی سخت شریعت قوانین پر مبنی تھی، جس کے تحت جرائم پر نہایت سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ ساخت کے اعتبار سے، اسلامی ریاست ہمیشہ ایک جہادی تنظیم رہی، جس کی بنیاد سلفی نظریات پر استوار تھی۔ یہ تنظیم انتشار کے ماحول میں پھلتی پھولتی ہے اور شدید دباؤ کے باوجود زندہ رہ کر دوبارہ لڑنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

عراق اور شام کے وسیع علاقوں پر قبضہ کر کے اور وہاں حکومت قائم کر کے داعش نے یہ ظاہر کیا کہ اس کی انتظامیہ نظریاتی طور پر پائیدار ہو سکتی ہے۔ تاہم یہ بھی سچ ہے کہ اگر بغداد میں شیعہ اکثریتی نوری المالکی حکومت سنی برادری کے مسائل کے حوالے سے زیادہ حساس اور ذمہ دار ہوتی، تو اسلامی ریاست کی سلفی نظریات پر مبنی حکمرانی کو وہ مقبولیت حاصل نہ ہوتی۔ ایک اور اہم عنصر جس نے عوام کو حکومتی نظام کے خلاف کر دیا، وہ شام میں انقلاب کے ابتدائی مرحلے کے دوران عوامی بغاوت کو حکومت کی جانب سے انتہائی بے رحمی سے کچلنا تھا۔ اس ریاستی جبر نے عوامی غم و غصے کو بھڑکایا اور داعش جیسے گروہوں کے لیے زمین ہموار کی۔

عراق اور شام کے وسیع علاقوں پر قبضہ کر کے اور وہاں حکومت قائم کر کے داعش نے یہ ظاہر کیا کہ اس کی انتظامیہ نظریاتی طور پر پائیدار ہو سکتی ہے۔ تاہم یہ بھی سچ ہے کہ اگر بغداد میں شیعہ اکثریتی نوری المالکی حکومت سنی برادری کے مسائل کے حوالے سے زیادہ حساس اور ذمہ دار ہوتی، تو اسلامی ریاست کی سلفی نظریات پر مبنی حکمرانی کو وہ مقبولیت حاصل نہ ہوتی۔ ایک اور اہم عنصر جس نے عوام کو حکومتی نظام کے خلاف کر دیا، وہ شام میں انقلاب کے ابتدائی مرحلے کے دوران عوامی بغاوت کو حکومت کی جانب سے انتہائی بے رحمی سے کچلنا تھا۔ اس ریاستی جبر نے عوامی غم و غصے کو بھڑکایا اور داعش جیسے گروہوں کے لیے زمین ہموار کی۔

داعش کی عسکری کامیابیاں صرف اس کے دشمنوں کی نااہلی کی وجہ سے نہیں ہوئیں بلکہ ان کے باہمی اختلافات نے بھی اس میں کلیدی کردار ادا کیا۔ جب شام میں امریکی فضائی حملے شروع ہوئے، تو صدر اوباما نے اعلان کیا کہ سعودی عرب، اردن، متحدہ عرب امارات، قطر، بحرین اور ترکی، یہ سب امریکہ کے ساتھ داعش کے خلاف فوجی شراکت دار بن رہے ہیں۔ مگر جیسا کہ امریکی حکام بخوبی جانتے تھے، یہ تمام ممالک سنی ریاستیں تھیں اور سلفی ازم کے پرچارک، جنہوں نے تاریخی طور پر شام اور عراق میں جہادی عناصر کی پرورش میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ یہی بات امریکی سکیورٹی اداروں کے لیے ایک سنگین سیاسی مسئلہ تھی۔ امریکہ کے نائب صدر جو بائیڈن نے ہارورڈ یونیورسٹی کے کینیڈی اسکول میں ایک لیکچر کے دوران کہا تھا کہ ترکی، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات نے شام میں ایک ”پراکسی سنی-شیعہ جنگ“ کو ہوا دی، اور بشار الاسد کے خلاف لڑنے والے کسی بھی گروہ کو کروڑوں ڈالر اور ہزاروں ہتھیار فراہم کیے۔ ان ہتھیاروں اور فنڈز تک رسائی جہادی تنظیموں جیسے النصرہ فرنٹ اور القاعدہ کو بھی حاصل ہوئی۔

ترکی نے 2011 میں بشار الاسد کے خلاف پہلی بغاوت کے بعد اپنا مؤقف بدل لیا۔ جب بشار الاسد نے لیبیا کے عمر قذافی کی طرح اقتدار چھوڑنے سے انکار کر دیا اور اپنی پوزیشن پر ڈٹا رہا، تو ترکی نے فیصلہ کیا کہ وہ داعش کی قیادت میں سرگرم جہادی گروہوں کی بھرپور حمایت کرے گا بالکل ویسے ہی جیسے 9/11 سے پہلے پاکستان نے افغانستان میں طالبان کی حمایت کی تھی۔

2012 سے 2013 کے دوران، یورپ، مشرق وسطیٰ، شمالی افریقہ اور شمالی امریکہ سے آنے والے 12000 سے زائد غیر ملکی جہادی جنگجو ترکی کے راستے شام کی سرحد تک پہنچے؛ بین الاقوامی میڈیا نے اسے ”جہادی ہائی وے“ کا نام دیا۔ امریکہ نے اس صورت حال پر تشویش کا اظہار کیا اور ترکی پر دباؤ ڈالا کہ وہ شام کے ساتھ اپنی سرحد بند کرے۔ بعد میں ترکی نے دباؤ کے تحت سرحدی نگرانی سخت کر دی، جس کے نتیجے میں جنگجوؤں کا یہ بہاؤ بہت کم ہو گیا۔

ترک انٹیلی جنس اداروں اور داعش کے درمیان تعلقات مبہم رہے، تاہم ترکی نے رقبہ مسین یرغمال بنائے گئے اپنے قونصل خانے کے عملے کی رہائی اس شرط پر ممکن بنائی کہ ترکی میں قید داعش کے جنگجوؤں کو رہا کیا جائے۔ وقت کے ساتھ ساتھ موصل اور دیگر داعش کے زیر قبضہ علاقوں سے خبریں آنا شروع ہوئیں کہ وہاں سنی عربوں کے لیے بھی زندگی جہنم بن چکی ہے۔ داعش کے جنگجوؤں نے شہر کی تمام وہ مساجد تباہ کر دیں جو حنفی صوفی سنی یا شیعہ مسالک سے تعلق رکھتی تھیں، کیونکہ داعش نے انہیں عبادت گاہیں نہیں بلکہ ”ارتداد کے اڈے“ قرار دیا تھا۔ یزیدیوں کا مذہب، جو ایک غریب اقلیت کی صورت میں ان علاقوں میں آباد تھا، مختلف مذاہب کا امتزاج ہے، جس میں آتش پرستی (زرشتیت) سے آگ کا تقدس، مسیحیت سے بپتسمہ، اور اسلام سے ختنہ شامل ہے۔ داعش کے حملوں کے دوران، بڑی تعداد میں یزیدیوں کو قتل، زیادتی اور جبری بے دخلی کا سامنا کرنا پڑا۔ عراق اور شام کے زیر قبضہ علاقوں میں، داعش کے جنگجو بجلی کی سی تیوی سے حملے کرتے، تاکہ دشمن کو سنہلنے کا موقع نہ ملے۔ وہ امریکی ساختہ ہتھیائے گئے ہموں گاڑیوں اور ٹرکوں میں سوار ہو کر آتے، جن پر جھولتے سیاہ پرچم لہرا رہے ہوتے۔ اپنے دشمنوں کو پہلی گولی چلنے سے پہلے ہی خوفزدہ کرنے کی حکمت عملی کے تحت، داعش کے جہادی سوشل میڈیا ماہرین ان کے مظالم کی ایچ ڈی ویڈیوز انٹرنیٹ پر اپ لوڈ کر دیتے تھے۔ خودکش حملہ آوروں کے استعمال میں وہ ماہر تھے، چاہے وہ پیدل ہوں یا گاڑیوں میں سوار۔

2015 میں حیدر العبادی کی حکومت برسرِ اقتدار آئی، جو اپنے پیش رونقوری الماکی کی حکومت کے مقابلے میں زیادہ جامع (inclusive) تھی۔ اس وقت تک سنی عرب بھی داعش کے مظالم

اور سخت شرعی قوانین کے نفاذ سے مکمل طور پر تھک چکے تھے۔ بین الاقوامی برادری نے نئی حکومت کے غیر فرقہ وارانہ رویے کو سراہا، اور عرب سنیوں کی امید بندھی کہ اب روزمرہ کی سطح پر انہیں کم جبر و استحصال کا سامنا کرنا پڑے گا۔

جولائی 2017 میں موصل اور اکتوبر 2017 میں رقہ کی آزادی کے بعد، داعش ایک عسکری خطرے کے طور پر شدید کمزور ہو چکی تھی۔ موصل اور رقہ دونوں داعش کی خود ساختہ خلافت کی علامتی بستانیاں بن چکی تھیں۔ یہی وہ مراکز تھے جہاں سے اس کی کارروائیاں چلتی تھیں اور دنیا بھر سے غیر ملکی بھرتیوں کی منزل تھیں۔ امریکہ کی قیادت میں قائم فوجی اتحاد کی فضائی بمباری نے ان دونوں شہروں کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ جب شامی ڈیموکریٹک فورسز نے رقہ کی آزادی کا اعلان کیا، تو یہ داعش کے عالمی مرکز کے خاتمے کی علامت بن گیا۔ یہی وہ مقام تھا جہاں داعش نے پہلی بار کسی شہری آبادی پر مکمل اور منظم کنٹرول حاصل کیا تھا، اور وہیں سے عراق کی سرحد عبور کر کے موصل پر قبضہ کیا، یہاں تک کہ بغداد کے قریب پہنچ گئی۔

ابوبکر البغدادی نے دعویٰ کیا تھا کہ اس کی خلافت عملاً دنیا بھر کے سنی مسلمانوں پر محیط ہے۔ تاہم انجام کار، 8000 سے زائد جنگجو میدان جنگ سے فرار ہو کر مقامی آبادی میں چھپ گئے یا لیبیا، صومالیہ، یمن اور افغانستان جیسے ناکام ریاستوں میں منتقل ہو گئے۔ وہ اپنے پیچھے پورا خطہ بلے کا ڈھیر بنا کر چھوڑ گئے جن میں موصل، حلب، حمص جیسے عظیم شہر اور پالمیرا جیسے عالمی ثقافتی ورثے بھی شامل تھے۔ یہ مناظر دوسری عالمی جنگ کے بعد فرینکفرٹ اور جرمنی کی تباہی کی یاد دلاتے تھے۔

اسی دوران، داعش مخالف اتحاد پھر سے اختلافات کا شکار ہو گیا، جس نے فرقہ وارانہ دراڑیں تازہ کر دیں اور جہادیوں کو از سر نو مجتمع ہونے کا موقع دیا۔ داعش نے شمالی عراق میں نیم خود مختار کرد خطے کی آزادی کے مسئلے پر پیشمرگہ اور عراقی سرکاری افواج کے مابین کشیدگی سے فائدہ اٹھانے کا منصوبہ بنایا۔ اسی طرح، مغربی شام میں امریکہ کی حمایت یافتہ کرد فورسز بھی داعش سے برسرِ پیکار تھیں، لیکن ان کا مقصد ایک علیحدہ کرد ریاست کا قیام تھا۔ امریکی سکیورٹی اداروں اور

محکمہ خارجہ کے پاس نہ تو صورتحال کو مستحکم کرنے کا کوئی منصوبہ تھا، نہ ہی عسکری کامیابی سے سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوئی حکمت عملی۔ کردستان کا نیم خود مختار علاقہ، جو کچھ وقت پہلے تک عراق کا ستون سمجھا جاتا تھا، اب ایک بڑا مسئلہ بن چکا تھا۔ اس کی حیثیت بطور متحدہ عراق کے مستقبل پر سوالیہ نشان بن گئی تھی۔ امریکہ، ترکی اور ایران جو کردوں کے اہم حامی سمجھے جاتے تھے، سبھی نے ستمبر 2017 میں ہونے والے آزادی کے ریفرنڈم کو ناپسند کیا، کیونکہ اس سے داعش مخالف اتحاد کی وحدت کو نقصان پہنچتا۔ امریکہ نے عراقی حکومت پر دباؤ ڈالا کہ وہ کردوں کے ساتھ تیل کی آمدنی کا بیڑا جاری رکھے اور ان کے نیم خود مختار درجے کو برقرار رکھے۔ دوسری جانب، روس اور ایران نے خطے میں اپنا اثر و رسوخ بڑھایا۔ ایران، چونکہ ایک شیعہ اکثریتی ملک ہے، اسے شیعہ حکمرانی والے عراق پر فطری اثر حاصل ہے، اور وہ شام میں سرگرم شیعہ ملیشیاؤں سے بھی قریبی تعلقات رکھتا ہے۔ ایران نے روسی لڑاکا طیاروں کے ساتھ ساتھ اپنے فوجی اور اسلحہ فراہم کیے اور بشار الاسد کی حکومت کو برقرار رکھا۔ اس کے بدلے میں، ایران کو تہران سے لے کر دمشق اور لبنان میں موجود اپنی حمایتی جماعت حزب اللہ تک ایک زمینی راہداری قائم کرنے میں مدد ملی، جو اس کی دیرینہ حکمت عملی کا حصہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ شامی افواج، امریکی حمایت یافتہ قوتوں کے مقابلے میں باقی ماندہ داعش کے زیر قبضہ علاقوں پر کنٹرول حاصل کرنے کی دوڑ میں تھیں، تاکہ مستقبل میں شام کے سیاسی حل پر ہونے والے مذاکرات میں اپنے موقف کو مضبوط بنا سکیں۔

جب لڑائی ختم ہو گئی، تو روس اور ایران کو شام سے نکلنے پر مجبور کرنا ممکن نہ رہا۔ لیکن امریکہ نے چالاکी سے ایک ایسا راستہ نکالا جس کے ذریعے ان دونوں ممالک کی طاقت کی حدود پر بعد از جنگ شام میں مذاکرات کیے جاسکیں۔ ایک اور بڑا چیلنج وہی پرانا تھا: عراق میں شیعہ قیادت والی حکومت کو یہ قائل کرنا کہ وہ سنی اقلیت کو بھی حکومتی ڈھانچے میں شامل کرے، تاکہ سنی برادری کو بھی ملک کے مستقبل میں اپنا حصہ محسوس ہو۔ سنیوں کے ساتھ مسلسل بدسلوکی نے ہمیشہ داعش جیسے گروہوں کے بھرتی کاروں کے لیے زرخیز زمین فراہم کی۔

22 نومبر 2017 کو ترکی، ایران اور روس کے رہنماؤں نے بحیرہ اسود کے تفریحی مقام سوچی

میں ملاقات کی، اور اس بات کو اجاگر کیا کہ شام کی جنگ کے نتائج کا تعین کرنے میں روس کا کردار فیصلہ کن رہا ہے۔ اس ملاقات کا مقصد امریکہ اور دنیا کو یہ تاثر دینا تھا کہ مشرق وسطیٰ میں روس اب ایک نیا (power broker) بن چکا ہے، اور وہ شام کی ریاست کے مستقبل کے ڈھانچے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرے گا۔

امریکہ کا شام اور عراق سے کسی جامع بحالی منصوبے کے بغیر نکل جانا، جس میں تعمیر نو، سلامتی اور بہتر طرز حکمرانی شامل ہو، ایسے حالات پیدا کر رہا تھا جن سے داعش کے دوبارہ ابھرنے کا خطرہ بڑھ رہا تھا۔ وہی سرزمین جس پر کبھی داعش نے خلافت قائم کی تھی اور جسے تباہ کر کے رکھ دیا گیا، اب امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے لیے لازم تھا کہ وہ نہ صرف شدت پسندوں بلکہ مشرق وسطیٰ کی اکثریتی نو جوان آبادی کو بھی یہ یقین دلائیں کہ مستقبل انتہا پسندوں کے ساتھ نہیں بلکہ اُن لوگوں کے ساتھ ہے جو امن اور خوشحالی کو اپنا شعار بناتے ہیں۔

2017 میں جب داعش کے جنگجو عراق اور شام کے قصبوں اور دیہاتوں سے پسپا ہو گئے، تو شامی فوج سے منسلک ایک میڈیا ادارے نے رپورٹ کیا کہ ابو بکر البغدادی کی قیادت میں اسلامی ریاست (داعش) کا مکمل طور پر آخری گڑھ شام کے مشرقی قصبہ بوکمال میں باقی رہ گیا ہے، جو عراقی سرحد کے قریب واقع تھا۔ تاہم، شامی حکومت کے حامی میڈیا نے بعد میں اطلاع دی کہ یہ قصبہ آزاد کرالیا گیا ہے۔ عربی نیوز چینل الاخباریہ کے ایک صحافی نے خوشی سے جھومتے ہوئے براہ راست نشریات میں اعلان کیا: ”داعش کا خاتمہ ہو گیا۔“

تاہم کئی واقعات، جیسے کہ 25 نومبر 2017 کو مصر کے سینائی علاقے میں واقع صوفی مسجد الروضہ پر ہونے والا وحشیانہ حملہ، یہ ظاہر کرتے تھے کہ داعش کا خاتمہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ داعش کے جنگجو اسلام کی طرح منتقل ہونے کے قابل (portable) ہیں۔ رقبہ اور موصل کے سقوط کے بعد، وہ سینائی صحرا میں پہلے سے موجود داعش کے خفیہ گروہوں سے جا ملے۔ مصر نے عشروں سے سینائی کو ایک فوجی زوایے سے دیکھا ہے، جہاں ریاست نے ایک الگ تھلگ مقامی کمیونٹی کے خلاف جارحانہ طریقہ عمل اختیار کیا۔ فوج نے نہ صرف ماورائے عدالت ہلاکتیں کیں بلکہ پورے

پورے دیہاتوں اور ان کی مقامی قیادت کو مٹا دیا۔ یہ علاقہ شدید سماجی و اقتصادی مسائل کا شکار رہا ہے مسلسل بے روزگاری، ناخواندگی، اور صحت کی سہولیات تک عدم رسائی جیسے مسائل نے اسے مزید غیر مستحکم کر دیا۔ یہی انتشار زدہ خطاب فرار شدہ داعش جنگجوؤں کے لیے ایک مثالی پناہ گاہ بن چکا ہے۔ سینائی ایک وسیع و عریض علاقہ ہے، جہاں صحرا اور پہاڑ ہیں، طویل ساحلی پٹی ہے، اور اس کے نیم محفوظ عقب میں غرہ کی سرحد ہے، جو کہ حماس کے کنٹرول میں ہے یہ تمام عوامل داعش کے باقی ماندہ عناصر کو چھپنے، منظم ہونے، اور پھر سے ابھرنے کا موقع دیتے ہیں۔

2011 میں لیبیا کے انہدام اور عمر قذافی کی ہلاکت کے بعد سے خطے میں اسلحے کی مسلسل ترسیل یقینی ہو گئی۔ جب شام اور عراق میں داعش کی خلافت کا خاتمہ ہوا، تو راقہ اور موصل سے بڑی تعداد میں بعض اندازوں کے مطابق آٹھ ہزار سے زائد اسلامی جنگجو دیگر علاقوں میں منتقل ہو گئے۔ مصر میں صوفی مسجد پر حالیہ حملہ ممکنہ طور پر اسی سلسلے کی ایک کڑی تھتا، جو سلفی نظریات پر مبنی صوفی سنی اور شیعہ اسلام سے نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے باوجود، مصر میں اسلام کا سب سے مقبول نظریہ اخوان المسلمون کا ہے، جو سعودی عرب کے وہابی سلفی ازم کے خلاف کھڑا ہے۔ صدر السیسی اس حملے، جس میں 300 سے زائد صوفی سنی مسلمان جاں بحق ہوئے، کو صرف ایک اقتصادی اور امن وامان کا مسئلہ ظاہر کرتے ہیں، جب کہ درحقیقت یہ ایک گہرا اور پیچیدہ اسلامی نظریاتی مسئلہ ہے، جس کے اثرات اسلام کے مستقبل اور عالمی امن تک پہنچتے ہیں۔

داعش کے بعد کے منظر نامے میں، واشنگٹن شام میں کرد ملیشیا اور ترکی کے درمیان، اور عراق میں عراقی حکومت اور کردستان ریجنل گورنمنٹ کے مابین بڑھتے ہوئے تناؤ کو کم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شام میں، امریکی آپریشنل فورسز نے شامی ڈیموکریٹک فورسز کے تحت کرد ملیشیا کے ساتھ مل کر داعش کے خلاف جنگ لڑی اور اسے مکمل طور پر شکست دی۔ عراق میں، پیشمرگہ فورسز اور عراقی فوج کی مشترکہ قوت نے امریکی فضائی طاقت کی مدد سے داعش کو شکست دی اور موصل سمیت دیگر شہروں کو آزاد کرایا۔

شام کا ایک چھوٹا سا دریائی قصبہ باغوز، جو عراق کی سرحد کے قریب خوبصورت فرات وادی

میں واقع ہے، داعش کا آخری مضبوط گڑھ تھا، جب راقہ کو بالآخر 23 مارچ 2019 کو آزاد کرایا گیا۔ شامی ڈیموکریٹک فورسز (SDF) نے امریکی فضائی مدد کے ساتھ شدید لڑائی کے بعد باغوز کو داعش کے قبضے سے آزاد کرالیا۔ ہزاروں غیر ملکی جنگجوؤں نے ہتھیار ڈال دیے، جنہیں SDF اور امریکی اسپیشل فورسز کے ساتھ کیمپوں میں رکھا گیا۔ تقریباً 10000 جہادی دہنیں جوان جنگجوؤں سے منسلک تھیں اور ان کے بچے بھی پکڑے گئے اور شمالی شام کے علیحدہ کیمپوں میں رکھے گئے۔ یہ لمحہ پوری دنیا کے لیے ایک بڑی علامت تھا کہ داعش کا باب اب بند ہو چکا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ داعش ایک عالمی مظہر (global phenomenon) ہے، جس کی شاخیں اب بھی دنیا کے مختلف حصوں میں سرگرم ہیں، جیسے افغانستان، فلپائن، نائیجیر یا اور بنگلہ دیش۔ اس کے علاوہ، یہ تنظیم ورچوئل سطح پر بھی موجود ہے، بغیر چہرے والے بغاوتی عناصر کے طور پر، جو سائبر دنیا میں ہزاروں پیروکاروں کو کنٹرول کرتے ہیں۔ یہ عناصر وقتاً فوقتاً اپنی موجودگی ظاہر کرتے ہیں شیعوں، صوفی سنیوں اور افغانستان جیسے ممالک میں سکھوں جیسی مذہبی اقلیتوں پر حملے کر کے۔ یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ داعش کا بغدادی دور اُس وقت اختتام کو پہنچا جب وہ 26 اکتوبر 2019 کو شمالی شام میں ایک امریکی کارروائی میں مارا گیا۔ لیکن داعش اب بھی ایک ایسے بیج کی مانند ہے جو ہوا کے سپرد ہو چکا ہے جہاں سازگار ماحول میسر آیا، وہ دوبارہ نمودار ہو سکتا ہے۔

صرف دہشت گردوں کو مار دینا کافی نہیں ہے؛ ان کے پیچھے موجود نظریے کو شکست دینا اور اس کی ساکھ ختم کرنا اس سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ وہابی نظریہ، جو کہ زیادہ تر اسلامی انتہا پسندی کی بنیاد ہے، کو دنیا بھر کے مسلمانوں اور دیگر مذاہب کے پیروکاروں کی مربوط کوششوں سے بے نقاب اور مسترد کرنا ہوگا۔ سب سے پہلے، سعودی عرب کے ایما پروہابی۔ سلفی نقطہ نظر سے قرآن و حدیث کی تفسیریں اور لٹریچر تیار کیا گیا ہے، انہیں مکمل طور پر ممنوع قرار دینا چاہیے۔ اس کے علاوہ، ان سنی مساجد سے اُن تمام علما اور خطیبوں کو ہٹانے کی بھی سنجیدہ کوششیں ہونی چاہئیں جو وہابی۔ سلفی طرز فکر کی نمائندگی کرتے ہیں، اگر دنیا میں دیر پا امن قائم رکھنا مقصود ہے۔

باب ہشتم

اسلامی دنیا میں امن کی بحالی کے لیے صوفی روایات کا احیا

مشہور امریکی ماہر تعلیم اور عوامی دانشور سیمونل ہسٹنگٹن نے 1993 میں ”تہذیبوں کے تصادم“ کے نظریے پر لکھا۔ اُن کا ماننا تھا کہ دنیا ثقافتی بنیادوں پر تقسیم ہے جیسے کہ عیسائی، مسلمان، بدھ مت، ہندو وغیرہ اور انہوں نے دلیل دی کہ آئندہ کی جنگیں ملکوں کے درمیان نہیں بلکہ تہذیبوں کے درمیان ہوں گی۔ لیکن جو بات شاید اُن کی نظروں سے اوجھل رہی، وہ یہ تھی کہ ایک آفاقی تہذیب یا عالمی ثقافت بھی موجود ہے، جو ذات، مذہب، رنگ اور نسل کے اختلافات کے باوجود انسانوں کو جوڑتی ہے۔ یہ آفاقی زبان، جو محبت، امن، رواداری اور باہمی یگانگت پر مبنی ہے، وہی ہے جس کی نمائندگی تصوف صدیوں سے کرتا آ رہا ہے۔

تصوف کے ماخذ کے بارے میں خود مذہبی علما اور صوفیوں کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ روایتی نقطہ نظر یہ ہے کہ تصوف اسلام کا باطنی پہلو یا روحانی صورت ہے، جس کی ابتداء نبی کریم ﷺ کی زندگی کے بعد کے ابتدائی صدیوں میں ہوئی۔ اسلام قبول کرنے والے ابتدائی پیروکاروں اور نبی ﷺ کے قریبی صحابہ میں سے بعض کا رجحان بھی خدا سے محبت کے گہرے

روحانی اظہار اور اُس کے کامل حصول کی جانب تھا۔

صوفیانہ عمل کی بنیاد جس ہدایت پر ہے، وہ قرآن اور نبی کریم ﷺ کی تعلیمات میں موجود ہے۔ مثلاً خاموشی سے ذکر الہی کرنے کا عمل خود نبی ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کو اس وقت سکھایا جب وہ دونوں ہجرت کے دوران مکہ سے مدینہ جاتے ہوئے ایک غار میں پناہ گزین تھے۔ نبی کریم ﷺ کا مشہور واقعہ معراج یعنی شبِ معراج، صوفیوں کے لیے ایک طویل عرصے سے روحانی سفر کی علامت کے طور پر تحریک کا ذریعہ رہا ہے۔ اس واقعے میں اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو جسمانی طور پر مکہ سے بیت المقدس، پھر وہاں سے سات آسمانوں تک اور بالآخر اپنی قربت میں ”دو کمانوں کے فاصلے“ تک پہنچایا۔ صوفی طالب علم اسی قسم کے روحانی سفر پر نکلتے ہیں تاکہ وقت اور مکان کی مادی حدود سے بلند ہو کر خدا کے قریب ہو سکیں۔ ایسے کئی واقعات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی زندگی میں ایک گہرا روحانی اور باطنی عنصر موجود تھا حتیٰ کہ وہ خود پہلے صوفی دکھائی دیتے ہیں، جو براہِ راست خدا سے ہم کلام ہوتے تھے۔

تصوف اسلام کی وہ شاخ ہے جو مقامی روایات و ثقافت کو اپنے دائرے میں سمو لیتی ہے اور ایمان لانے والوں کے لیے دین کو ثقافتی طور پر قابلِ فہم اور مربوط بنادیتی ہے، بغیر اس کے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں سے انحراف کرے۔ تصوف ایک داعی (missional) طرزِ عمل بھی رکھتا ہے، جو دنیا بھر کے لوگوں کو اسلام کی جانب راغب کرتا ہے۔ یونیورسٹی آف مشی گن کے پروفیسر اور تصوف کے ماہر الیگزینڈر ڈکنیش تصوف کو ایک ”نہایت وسیع اور غیر مرکوز تحریک“ قرار دیتے ہیں، جو سنی اور شیعہ دونوں روایات میں رائج ہے۔ تصوف نے صدیوں تک اسلامی ادب و فن پر گہرے اثرات مرتب کیے، اور حقیقتاً، اسلام کا سنہری دور آٹھویں سے تیرہویں صدی کے درمیان صوفی فکر ہی کے زیرِ اثر پروان چڑھا۔ جدید دور میں، صوفی اسلام کو عام طور پر محبت، امن اور رواداری کا علمبردار تصور کیا جاتا ہے۔ یہی احساسات امام فیصل عبدالرؤف جیسے افراد نے بھی اجاگر کیے جو مصری نژاد امریکی صوفی عالم ہیں، کئی برسوں تک نیویارک میں خطابت کرتے رہے، اور کورڈوبا ہاؤس کے بانی ہیں، جس کا مقصد مغرب میں اسلام کی معتدل اور پرامن شکیہ کو فروغ دینا ہے۔

تصوف کا حاشیہ پر جانا

تصوف، جسے روح کا علم (science of soul) سمجھا جاتا ہے، ہمیشہ سے روایتی اسلام کا لازمی جز تصور کیا گیا ہے۔ چودھویں صدی کے شامی حنبلی فقیہ ابن تیمیہ کو سلفیت کا بانی مانا جاتا ہے۔ انہوں نے سلفی نظریے پر عمل اس وقت شروع کیا جب مکہ اور مدینہ کے مقدس شہروں میں نبی کریم ﷺ کے صحابہ کے مزارات کے گرد تعمیر ہونے والی قبروں اور ڈھانچوں کو منہدم کرنا شروع کیا۔ اس کے باوجود، ابن تیمیہ نے تصوف میں شریعت کی بالادستی کو سب سے درست روایت قرار دیا۔ اٹھارہویں صدی کے اصلاح پسند عالم محمد بن عبدالوہاب، جو ابن تیمیہ سے گہرے طور پر متاثر تھے، نے بھی صوفی بزرگوں جیسے شیخ عبدالقادر جیلانی سے غیر معمولی عقیدت رکھی۔ انہوں نے جیلانی کی معروف تصنیف فتوح الغیب پر اپنی شرح میں تصوف کے موضوع پر فصیح انداز میں اظہار خیال کیا اور تصوف کو اسلامی معاشرے کی زندگی کے لیے لازمی عنصر قرار دیا۔

تصوف کو حاشیہ پر دھکیلنے کی بنیادی وجہ اٹھارہویں صدی میں نجد کے علاقے میں وہابی سلفیت کا ظہور ہے، جو بعد ازاں سعودی عرب کا سرکاری مذہب بن گیا۔ عبدالوہاب کے اصلاحی مکتب فکر، جسے وہابی سلفیت کہا جاتا ہے، نے ابتدائی اسلامی مصادر کی نئی تعبیر و تشریح کرتے ہوئے صوفی طریقوں کے خلاف تبلیغ کی۔ انتہائی قدامت پسند وہابی تحریک، جو دینی علم کا زیادہ تر انحصار اسلامی متون کے ظاہری اور لفظی مفہوم پر کرتی تھی، نے اپنے بیشتر اعتراضات کا رخ صوفی سلسلوں کی جانب کیا، جنہیں وہ اسلامی تعلیمات کو بگاڑنے کا مرتکب سمجھتے تھے۔ دیگر قدامت پسند فرقوں کی طرح، وہابی سلفی بھی صوفی روایات کی کئی شکلوں کو سختی سے رد کرتے تھے جن میں صوفی مزارات کی زیارت، قرآن کی ماورائی (metaphysical) تشریح، اور صوفیانہ رسوم و عبادات شامل ہیں۔

سلفیت کے مطابق، اس قسم کے صوفی اعمال شرک کے مترادف ہیں یا انہیں عمومی طور پر اسلامی اصطلاح میں بدعت کہا جاتا ہے، ایسا گناہ جس کی سزا نہایت سنگین سمجھی جاتی ہے۔ سلفیوں نے جدیدیت کی تمام سماجی صورتوں کو مسترد کر دیا ہے۔ وہ صوفی افکار و اعمال کو نئی ایجادات قرار دیتے

ہیں اور انہیں تو بہین دین کا مرتکب سمجھتے ہیں، جو اکثر تکفیر یعنی کسی کو دائرہ اسلام سے خارج کرنے کے عمل تک جا پہنچتی ہے، صرف اس بنیاد پر کہ وہ سلفی تصور اسلام سے ہٹ کر کسی اور روحانی تعبیر کو اختیار کرتے ہیں۔

صوفی سنی روایات جن میں مابعد الطبیعات (metaphysics)، اخلاقی تربیت، عباداتی اعمال، موسیقی، شاعری اور روحانی تجربات شامل ہیں سلفیت کے مطابق اسلام کے دائرے میں قابل قبول نہیں، کیونکہ سلفی فکر ان تمام عقائد و اعمال کو دین سے خارج کرنے کی کوشش کرتی ہے جن کا قرآن یا حدیث میں صریح ذکر موجود نہ ہو۔ چودھویں اور پندرہویں صدی کے دوران، کئی شامی اور ہندوستانی علما، جیسے شاہ ولی اللہ، نے روایتی تصوف کو سلفی روح کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ تبلیغی جماعت، جو کہ ایک سنی اسلامی تبلیغی تحریک ہے، کے بیشتر بانی اور ابتدائی رہنما مختلف صوفی سلسلوں سے خاندانی تعلق رکھتے تھے۔ وہ نجی طور پر بعض صوفی عبادات بھی انجام دیتے تھے، لیکن جماعت کے نظریاتی ڈھانچے نے جنوبی ایشیا میں رائج صوفی ازم، بالخصوص اولیاء کرام کی تعظیم اور زیارت کو سختی سے رد کر دیا۔

صوفی ازم، جسے عرب دنیا میں تصوف کہا جاتا ہے، اسلامی روحانیت کی ایک ایسی صورت ہے جو خود احتسابی اور الہی قربت پر زور دیتی ہے۔ یہ کوئی فرقہ نہیں بلکہ اسلام کی مرکزی دھارے میں جڑا ہوا ایک روحانی رُخ ہے، جو ہمیشہ دین کے باطنی پہلو سے وابستہ رہا ہے۔ تاریخ میں ہمیشہ ایسے افراد رہے ہیں جن کی باطنی تڑپ اور قلبی بے چینی نے انہیں غور و فکر، مراقبہ اور عبادت میں مشغول رہنے پر آمادہ کیا۔ تصوف کا مرکزی محور عام طور پر دنیاوی وابستگیوں سے بے رغبتی، نفس کا تزکیہ، اور ذات باری تعالیٰ کے عرفانی مراقبہ پر ہوتا ہے۔ ایسا ہی ایک شخص خود نبی کریم ﷺ تھے، جو نبوت ملنے سے پہلے اکثر مکہ کے باہر ایک غار میں خلوت نشین ہو کر اللہ کی عبادت کیا کرتے تھے۔

سن 622 سے 632 کے درمیان، نبی کریم ﷺ نے مدینہ میں ایک ایسی برادری قائم کی جو عدل، مساوات، تقویٰ اور حساس قیادت جیسے اسلامی اصولوں پر مبنی تھی۔ آپ ﷺ کی وفات

کے بعد، پہلے چار خلفائے راشدین نے آپ کی تعلیمات کی سختی سے پیروی کی، اور تیزی سے پھیلنے ہوئے اسلامی علاقوں میں قرآن اور سنت کی روشنی میں منصفانہ حکمرانی قائم کی۔ نبی کریم ﷺ سے بیعت کرنے والے صحابہ کرام نے خود کو خدمتِ الہی کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اسلامی عقیدے کے مطابق، نبی کریم ﷺ سے بیعت دراصل اللہ تعالیٰ سے بیعت کے مترادف ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی سورۃ الفتح (آیت 10) میں فرمایا گیا ہے:

”بے شک جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں، وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔ پھر جو کوئی اس بیعت کو توڑے گا، وہ اپنے ہی نقصان کے لیے توڑے گا، اور جو کوئی اللہ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کرے گا، اللہ اسے بڑا انعام عطا کرے گا۔“

صوفیہ کا عقیدہ ہے کہ جب کوئی سالک (روحانی طالب) کسی مستند صوفی شیخ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے، تو وہ دراصل نبی کریم ﷺ سے بیعت کر رہا ہوتا ہے، اور اس طرح اُس سالک اور نبی ﷺ کے درمیان ایک روحانی ربط قائم ہو جاتا ہے۔ صوفیہ کے نزدیک، نبی کریم ﷺ ہی وہ ذریعہ ہیں جن کے ذریعے اللہ کی معرفت، قرب اور فہم حاصل کیا جاسکتا ہے۔ حضرت علیؓ کو صحابہ کرام میں ایک مرکزی روحانی شخصیت سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ صحابہ نے براہِ راست نبی کریم ﷺ سے بیعت کی تھی، اس لیے صوفیہ کا ماننا ہے کہ حضرت علیؓ کے ذریعے نبی ﷺ کا علم اور روحانی تعلق حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس عقیدے کی تائید ایک مشہور حدیث سے بھی کی جاتی ہے، جسے صوفیہ مستند ماننے ہیں: ”میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے۔“ حضرت علیؓ کے تصوف کے گہرے علم پر مسلم دنیا میں عمومی اتفاق پایا جاتا ہے۔

بعض صوفی اہلِ عمل کا ماننا ہے کہ تصوف دراصل نبی کریم ﷺ کے اُس طریقہٴ عمل کی سختی سے پیروی کا نام ہے، جس کے ذریعے اُن کا قلب براہِ راست الہی قرب سے منور ہوا۔ بہت سے صوفی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ تصوف اسلام کے دائرے میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ یہ سنتِ نبویؐ کی سختی سے پیروی کرتا ہے خواہ وہ کھانے کے آداب ہوں یا لباس کا انداز۔ مجموعی طور

پر تصوف اسلام کا وہ روحانی پہلو ہے جو نفس کی تطہیر سے متعلق ہے۔

ساتویں صدی میں تصوف کسی منظم یا ضابطہ بند شکل میں موجود نہیں تھا۔ بتدریج اس نے ایک منظم صورت اختیار کی اور مختلف روحانی سلسلوں (طریقتوں) میں ڈھلتا گیا، جو آج تک قائم ہیں۔ یہ تمام سلسلے معروف اسلامی اولیاء کے قائم کردہ ہیں، اور ان میں سے سب سے بڑے اور مشہور سلسلے درج ذیل ہیں: قادریہ (شیخ عبدالقادر جیلانی سے منسوب)، رفاعیہ (شیخ احمد رفاعی)، چشتیہ (خواجہ معین الدین چشتی)، شاذلیہ (شیخ ابوالحسن شاذلی)، اور نقشبندیہ (حضرت بہاؤ الدین نقشبند بخاری)۔ ان تمام سلسلوں کے بانی اہل سنت کے روایتی مکتب فکر سے وابستہ تھے اور سنی اسلام کے چاروں فقہی مکاتب میں سے کسی ایک سے منسلک تھے۔

سلسلہ قادریہ نے حنبلی فقہی مکتب کی پیروی کی، کیونکہ اس کے بانی شیخ عبدالقادر جیلانی خود ایک معروف حنبلی فقیہ تھے۔ چشتیہ سلسلہ فقہ حنفی سے وابستہ تھا، شاذلیہ فقہ مالکی سے، اور نقشبندیہ بھی فقہ حنفی کی پیروی تھی۔

امام غزالی (1058-1111)، جو ایک جلیل القدر مذہبی عالم اور صوفی بزرگ تھے، موجودہ ایران کے علاقے خراسان کے قریب تبران میں پیدا ہوئے۔ وہ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے اور ان کی پرورش صوفیوں کے زیر سایہ ہوئی۔ امام غزالی نے اپنی متعدد تحریروں میں نفس کی ماہیت اور غم و خوشی کے اسباب پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ انہوں نے یہ دلیل دی کہ تصوف کی بنیاد قرآن میں ہے، اور اس لیے یہ اسلام کی مرکزی فکر سے ہم آہنگ ہے، نہ کہ اس کے متضاد۔ ان کے مطابق، تصوف نہ صرف اسلامی قانون سے ٹکراؤ نہیں رکھتا بلکہ دین کی کامل تکمیل کے لیے ضروری ہے۔ امام غزالی کا یہ بھی کہنا تھا کہ قرآن کی سخت روحانی مطالبات کو صرف وہی شخص پورا کر سکتا ہے جو باطنی خلوص اور روحانی توجہ پر صوفیانہ زور دیتا ہے۔

امام غزالی کے دلائل نے علما اور صوفیہ کے درمیان پیدا ہونے والی عداوت اور شکوک و شبہات کو کم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ تصوف کو جب اسلامی روایت کے سرکاری دھارے (orthodoxy) میں قبولیت ملی، تو اس کے دور رس نتائج برآمد ہوئے۔ اسلام کو ایک عوامی اور

دل پذیر شکل حاصل ہوئی، اور اس میں نئے پیر و کاروں کو متوجہ کرنے کی غیر معمولی قوت پیدا ہوئی۔ بعض محققین تصوف کو اس بات کا سہرا دیتے ہیں کہ اسلام نے مشرق وسطیٰ سے باہر خود کو کامیابی سے مستحکم مذہب کے طور پر پیش کیا۔ تاریخی طور پر، تصوف اسلام اور اسلامی تہذیب میں مسلم زندگی کا ایک نہایت اہم پہلو رہا ہے، جس کی جڑیں قرون وسطیٰ کے ابتدائی ادوار سے لے کر آج تک قائم ہیں۔ بدرتج، تصوف نے ہندوستان سے عراق، بلقان، سینیگال، اور مراکش تک پھیلے ہوئے علاقوں میں اہل سنت کی دینی و معاشرتی زندگی کے ہر پہلو میں اپنی خاموش اور گہری رسائی قائم کر لی۔

اسلامی تہذیب کے پھیلاؤ کا عمل تصوف کے فروغ کے ساتھ گہرے طور پر منسلک رہا ہے۔ تصوف کے پھیلاؤ نے نہ صرف اسلام کی اشاعت میں مدد دی بلکہ ایک منفرد اسلامی ثقافت کی تشکیل میں بھی بنیادی کردار ادا کیا، خصوصاً افریقہ اور ایشیا میں۔ لیبیا اور سوڈان کے سنوسی قبائل تصوف کے سب سے مضبوط پیروکاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ رومی جیسے صوفی شاعر اور فلسفیوں نے وسطی اور جنوبی ایشیا میں اسلام کے پھیلاؤ میں اہم کردار ادا کیا۔ عثمانی سلطنت کی رہنما فکری بنیاد بھی تصوف پر استوار تھی۔ جب ابن عبد الوہاب نے اٹھارہویں صدی میں اسلام کو ایک سخت گیر اور تطہیری تحریک کے طور پر دوبارہ پیش کیا، اور صوفیوں کو گمراہ قرار دیا، تو اس وقت سعودی عرب پر حکمرانی کرنے والے عثمانی حکمرانوں نے عبد الوہاب اور ابن سعود کے ماننے والوں کے قتل کے احکامات جاری کیے کیونکہ وہ روایتی صوفی سنی اسلام کی جگہ نئی وہابی سلفی تعبیر کو ”اصل سنی اسلام“ کے طور پر مسلط کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

آٹھویں سے تیرہویں صدی کے درمیان، تصوف نے اسلامی دنیا میں ایک زرخیز علمی و فکری ثقافت کو جنم دیا۔ اس دور کو اسلام کا ”سنہری دور“ بھی کہا جاتا ہے، جس کی سماجی، ثقافتی اور سائنسی کامیابیوں کی باقیات آج بھی موجود ہیں۔ تصوف بیسویں صدی تک عالمی اسلامی زندگی کا ایک نہایت اہم اور بنیادی حصہ رہا، یہاں تک کہ جب سعودی عرب کی پیٹرول ڈالر طاقت سے ابھرتی ہوئی وہابی سلفیت نے اسلامی تہذیب پر تصوف کے تاریخی اثرات کو کمزور کرنا شروع کر دیا۔

سعودی عرب اور قطر دو عرب سنی ریاستوں کے درمیان تعلقات خاص طور پر عرب بہار کے بعد شدید تناؤ کا شکار ہو گئے، جو 2010 کی دہائی کے آغاز میں عرب دنیا کے بڑے حصے میں پھیل چکی تھی۔ ان دونوں ممالک کے درمیان ایک سخت سفارتی کشمکش شروع ہوئی، جسے بعض اوقات ”دوسری عرب سرد جنگ“ بھی کہا جاتا ہے۔ اس کشیدگی نے قطر کو ترکی اور ایران کے قریب کر دیا، جو مشرق وسطیٰ کی سیاست کو بدلنے اور روایتی صوفی سنی اسلام کی بحالی کا امکان پیدا کر سکتی ہے۔

ترکی اور ایران نے ایک غیر رسمی اسٹریٹجک اتحاد قائم کیا ہے، جو سنی اور شیعہ ممالک کے درمیان تعاون کی علامت ہے، تاکہ وہ قطر کو سعودی عرب کی قیادت میں بننے والے خلیجی اتحاد کی جارحانہ پالیسیوں سے بچاسکیں۔ اس کشیدگی کے بعد، ترکی نے قطر میں ایک فوجی اڈہ قائم کیا، جبکہ ایران نے قطر کے لیے اپنی فضائی حدود، سمندری راستے اور زمینی نقل و حمل کے ذرائع کھول دیے، تاکہ سعودی حمایت یافتہ خلیجی ممالک کے دباؤ کا توڑ کیا جاسکے۔ تاریخی طور پر، ترک قوم فارسی ثقافت سے طویل عرصے تک متاثر رہی ہے اور انہوں نے بعض ناقابلِ مٹ مذہبی و ثقافتی ورثے کو اپنایا ہے۔ ایران میں ترک اقلیت کی بڑی تعداد موجود ہے، کیونکہ ایران کبھی صفوی اور قاجار جیسے ترک شاہی خاندانوں کے زیرِ حکومت رہا ہے، جن کی حکمرانی سولہویں صدی کے آغاز سے قائم تھی۔

سولہویں سے انیسویں صدی کے دوران ہونے والی عثمانی۔صفوی جنگیں دراصل دو ترک شاہی خاندانوں کی سیاسی و مذہبی رقابت تھیں، جن میں سے ایک صوفی سنی اسلام اور دوسرا صوفی شیعہ سلسلوں کا علمبردار تھا۔ تصوف کی فکری جہت، جو اللہ کی باطنی تلاش اور روحانیت پر مرکوز ہے، اس نوعیت کی تھی کہ اس کے پیروکار عموماً سیاسی اسلام سے کنارہ کش رہتے تھے۔ اگرچہ بعض صوفی رہنما، بالخصوص مسلم دنیا میں، سیاسی قوتوں سے وابستہ رہے، لیکن انہوں نے کبھی بھی جنگجو تحریکوں کی حمایت نہیں کی۔ کئی صوفی سلسلے شریعت کی پاسداری اور عبادات و معاشرت کے معاملات میں سخت روایتی اصولوں کی پابندی پر زور دیتے ہیں۔ اس طرح تصوف نے روحانیت اور ظاہری عمل (شریعت) کے درمیان ایک متوازن راستہ فراہم کیا، جو اسے انتہا پسندانہ رجحانات سے ممتاز کرتا ہے۔

داعش اور القاعدہ جیسی تنظیمیں، جو وہابی سلفیت کی کٹر پیروکار ہیں، صوفیوں کو نشانہ بناتی ہیں کیونکہ وہ سمجھتی ہیں کہ صرف اُن کا تعبیر کردہ اسلام ہی درست ہے۔ بہت سے بنیاد پرست عناصر صوفی اور شیعہ اسلام میں موجود اولیاء کرام کی تعظیم کو شرک کی ایک شکل سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ عمل ایک واحد خدا کے علاوہ کسی اور کی عبادت کے مترادف ہے، جو توحید کے خلاف ہے۔ متعدد محققین نے لکھا ہے کہ ابن تیمیہ، جنہیں سلفیت کا بانی سمجھا جاتا ہے، کا تعلق ابتدائی دور مسیٰں قادر یہ سلسلہ تصوف سے تھا۔ حال ہی تک، یہ تصور بھی ناقابلِ فہم تھا کہ اسلامیات کے طلبہ تصوف کو اسلامی تعلیم کا جز و لازم نہ سمجھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تصوف ہی علمِ کلام، دینی عمل، اور روحانیت کا نچوڑ ہے، جو اسلام کے ہمہ گیر اور متوازن فہم کو مکمل کرتا ہے۔

مغرب میں تصوف

امریکہ اور یورپ کے کئی ماہرین، مفکرین اور فلسفیوں نے تصوف اور اس کے عظیم نمائندوں جیسے رومی (1027-1073)، حافظ (1325-1389)، اور ابن عربی (1165-1240) کو اپنایا ہے۔ ان کے نزدیک، تصوف رواداری، وقار، اور انسانوں کے لیے عزت و احترام کی علامت ہے، جو ذات، رنگ اور مذہب کی حد بندیوں سے ماورا ہے۔ فلسطینی نژاد معروف دانشور ایڈورڈ سعید حافظ شیرازی کو، جو ایک فارسی صوفی اور روحانی شاعر تھے، اپنا روحانی آئیڈیل قرار دیا کرتے تھے۔ 1960 کی دہائی میں امریکی سول رائٹس تحریک کے بعد، بڑی تعداد میں افریقی نژاد امریکی صوفی سنی اسلام کی طرف راغب ہوئے، جو مغرب میں مراکش اور تیونس کے راستے پہنچا تھا۔ قابل ذکر ہے کہ تیونس پہلا عرب ملک تھا جس نے واشنگٹن ڈی سی میں سفارت خانہ قائم کیا۔ مغرب کی مشرق سے کشش کا بنیادی سبب اس کی روحانی وراثت ہے۔ یہ امر معروف ہے کہ امریکہ آنے والے مغربی تارکینِ وطن کی بڑی تعداد تصوف کے ذریعے اسلام سے متعارف اور متاثر ہوئی۔ لیکن آج مغرب میں اسلام کے بارے میں جو بد اعتمادی پائی جاتی ہے، وہ وہابی سلفیت کی وجہ سے ہے، جو صرف انتہا پسندی، عدم برداشت، اور دوسرے مذاہب سے نفرت کا پیغام دیتی ہے۔

1970 کی دہائی میں اسلام قبول کرنے والے کئی امریکی نو مسلموں نے اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے اسلام کو اس کی صوفی اقدار کی وجہ سے اختیار کیا۔ چشتی صوفی سلسلہ امریکہ میں موجود قدیم ترین سلسلوں میں شمار ہوتا ہے۔ امریکہ میں مختلف صوفی گروہ موجود ہیں، کچھ کا تعلق ترک-ایرانی اور جنوبی ایشیائی پس منظر سے ہے، جبکہ کچھ دیگر گروہ مراکش سے وابستہ ہیں۔

امریکی خانہ جنگی (1861-1865) کے بعد، صدے سے دو چار امریکی معاشرے نے بڑی تعداد میں تصوف کی طرف رجوع کیا، کیونکہ یہ ایک روحانی سکون اور نفسیاتی شفا کا ذریعہ ثابت ہوا۔ وہ صوفیوں کو ایک محفوظ پناہ گاہ کے طور پر دیکھتے تھے، جہاں انہیں راحت اور تسلی ملتی تھی۔ یہ ایک حیرت انگیز سوال ہے کہ 9/11 کے المناک واقعات کے بعد امریکہ نے اپنے مسلم معاشروں میں تصوف کی تعلیمات کو کیوں فروغ نہ دیا۔ آج کی صورت حال یہ ہے کہ وہاں کے بہت سے مسلم حلقے وہابی-سلفی نفرت انگیز نظریات میں بری طرح جکڑے ہوئے ہیں۔

تاہم، امریکی صوفی سنی مسلمان 9/11 کے بعد امن اور عدم تشدد کے فروغ کے لیے سب سے پہلے سامنے آنے والوں میں شامل تھے۔ انہوں نے بین المذاہب مکالمے منعقد کیے اور دیگر مذاہب کے ماننے والوں سے رابطے کے پل تعمیر کیے۔ صوفی شاعر رومی نے تمام مذاہب کو ایک ہی الہی حقیقت کے مختلف مظاہر قرار دیا تھا۔ 1970 کی دہائی کے آخر میں، رفاعی سلسلہ نے امریکہ میں اپنی موجودگی قائم کی اور واشنگٹن ڈی سی میں ایک سادہ سامرکز بسایا۔ بعد ازاں 1980 اور 1990 کی دہائیوں میں یہ سلسلہ وسعت اختیار کرتا گیا اور اس کے مراکز نیویارک، اسٹین آئی لینڈ، کلیولینڈ، شکاگو اور ٹورنٹو میں قائم ہوئے۔

فرانس میں تقریباً 60 لاکھ مسلمان آباد ہیں، جو ملک کی مجموعی آبادی کا 8 فیصد بنتے ہیں، اور ان میں بڑی تعداد تصوف کے پیروکاروں کی بھی ہے۔ ملک میں موجود تمام صوفی سلسلے محض حالیہ مسلم ہجرت کا نتیجہ نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر، فرانس کی شمالی اور مغربی افریقی کمیونٹیاں بالترتیب تیجانیہ اور موریدیہ سلسلوں کی پیروی کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ، کچھ زیادہ جدید طرز کے صوفی سلسلے بھی ملک میں موجود ہیں۔ فوزی سکالی، جو سوربون یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ ایک ماہر انسانیات ہیں،

فرانس میں قادری سلسلے کی ایک شاخ کے نگراں ہیں، اور انہوں نے تصوف کو شہری، جدید تعلیم یافتہ، متوسط اور اعلیٰ طبقے کے لیے پرکشش بنانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ انہوں نے مراکشی تصوف کو مختلف ثقافتی میلوں اور تقریبات کے ذریعے نہ صرف فرانس بلکہ دیگر ممالک میں بھی کامیابی سے پیش کیا ہے۔ تصوف اُن دانشوروں اور مفکرین میں تیزی سے پھیل رہا ہے، جو کسی وسیع تر معنویت کی تلاش میں ہوتے ہیں اور باطنی تبدیلی کی جانب رجحان رکھتے ہیں۔

1980 کی دہائی کے اوائل سے سعودی عرب کی جانب سے سلفیت کو جارحانہ انداز میں فروغ دیے جانے کے نتیجے میں دنیا کے مختلف حصوں میں دہشت گرد حملوں سمیت متعدد سنگین مسائل نے جنم لیا۔ اس کے نتیجے میں مسلم برادریوں کو سماجی تنہائی کی مختلف شکلوں کا سامنا کرنا پڑا ہے، اور اس نے ایک ایسی اسلاموفوبیا کو جنم دیا ہے جو حالیہ برسوں میں یورپ میں اپنی انتہا پر پہنچ چکی ہے۔ لیکن ایک حوصلہ افزا پہلو یہ ہے کہ صوفی سنی اسلام کا احیا اگرچہ آہستہ روی سے سبھی فرانسیسی معاشرے میں مسلمانوں کے لیے قبولیت اور اعتماد کی فضا بحال کرنے میں مددگار ثابت ہو رہا ہے، کیونکہ یہ شدت پسندی اور انتہا پسندی کے سراسر خلاف ہے۔ فرانس کے مشہور پیر عبد المالک، جو قادر یہ سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں، نے مؤثر انداز میں یہ دکھایا کہ تصوف نہ صرف فرد کی شخصیت سازی کرتا ہے بلکہ اُس کی فنی صلاحیتوں کو نکھارتا ہے، منفی خیالات کا سد باب کرتا ہے، اور دوسروں سے محبت بڑھاتا ہے۔

برطانیہ کی موجودہ مسلم آبادی میں جنوبی ایشیائی، افریقی، عرب، بلقانی، اور وسطی ایشیائی افراد شامل ہیں، جبکہ ایک چھوٹا طبقہ سفید فام نو مسلموں پر مشتمل ہے۔ عمومی طور پر، یہ مسلمان دو مختلف اسلامی شناختوں میں منقسم ہیں۔ ایک گروہ وہابی۔ سلفی مسلمانوں کا ہے، جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ فرد کو یا تو مکمل طور پر مسلمان ہونا چاہیے یا برطانوی، دونوں شناختیں بیک وقت نہیں اپنائی جاسکتیں۔ ان کے مطابق، قومی اقدار اور مذہبی اصولوں میں تضاد پایا جاتا ہے۔ دوسرا گروہ خود کو صوفی سنی اسلام کا پیروکار کہتا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ کوئی شخص بیک وقت مسلمان بھی ہو سکتا ہے اور برطانوی بھی، اور ان دونوں شناختوں میں کوئی تضاد نہیں۔ ان کے مطابق، قومیت اور ایمان

دونوں کو برطانیہ میں رہنے والے مسلمان اپنی شخصیت میں ہم آہنگ کر سکتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں گروہ اپنے اپنے موقف کو قرآن و حدیث یعنی اسلام کے بنیادی مصادر کی روشنی میں درست اور جائز ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بدقسمتی سے، برطانیہ میں مسلم برادریوں کے درمیان جاری نظریاتی بحث کا کوئی غیر جانب دار ثالث موجود نہیں۔

1960 اور 1970 کی دہائیوں میں بڑی تعداد میں مسلم مہاجرین برطانیہ میں آکر آباد ہوئے، اور تقریباً تمام ہی صوفی سنی اسلام کے پیروکار تھے۔ تاہم، 1980 کی دہائی میں سعودی عرب کی منظم حمایت کے نتیجے میں سلفی نظریات نے زور پکڑنا شروع کیا۔ اس مقصد کے لیے ایک ادارہ قائم کیا گیا: جمعیت احیاء منہاج السنہ (JIMAS)، جس کا مقصد صرف اور صرف برطانیہ میں سلفیت کی تبلیغ اور فروغ تھا۔ اس کے حمایتی اسے ”سنت نبوی کے احیاء کی انجمن“ بھی کہتے ہیں۔ 1990 کی دہائی کے اوائل میں، سلفیوں نے کھل کر اس نظریے کی ترویج شروع کی۔ انہوں نے اپنی سرگرمیاں گرین لین مسجد، سلفی انسٹیٹیوٹ (برمنگھم)، ابن تیمیہ مسجد (برکسن) اور لوٹن اسلامک سینٹر جیسے مراکز سے شروع کیں۔ ان کا پیغام صرف اداروں کے ذریعے نہیں پھیلا یا گیا بلکہ زیادہ تر مغربی نو مسلم افراد کے ذریعے بھی عام کیا گیا۔ برطانیہ میں آباد دیگر تنظیمیں، جیسے جماعت اسلامی، اہل قرآن، اہل حدیث اور تبلیغی جماعت، جو وہابی۔ سلفی فکر کو فروغ دیتی ہیں، اپنے آپ کو غیر سیاسی تنظیمیں قرار دیتی ہیں۔ تاہم، ان تمام گروہوں کی ایک مشترک خصوصیت یہ ہے کہ یہ تصوف کی مخالفت کرتے ہیں۔

تمام شدت پسند تحریکیں، جیسے کہ حزب التحریر، وہابی سلفی فکر سے متاثر ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ نے تمام مسلمانوں کو کفار کے خلاف جہاد کا حکم دیا ہے۔ یہ گروہ مغربی اقدار جیسے جمہوریت، لبرل ازم، اور سیکولر ازم کو رد کرتے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک یہ تصورات اسلامی افتدار اور شریعت سے متصادم ہیں۔ آج مرد و خواتین میں سلفیوں کے مذہبی لباس کی علامتیں 1970 کی دہائی کی نسبت کہیں زیادہ نمایاں ہیں۔ اُس وقت مسلمانوں کی اکثریت روایتی صوفی سنی اسلام

سے وابستہ تھی، جس میں سخت لباس کی پابندیاں نہیں تھیں۔ یہی وہ ایک وجہ بھی سمجھی جاتی ہے کہ شام میں داعش میں شمولیت اختیار کرنے والے نوجوانوں کا سب سے بڑا گروہ برطانیہ سے تعلق رکھتا تھا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ بنیاد پرست اور جدیدیت پسند دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ اسلام کو معاشرتی زندگی سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں البانیا اور کوسوونے سلطنت عثمانیہ سے آزادی حاصل کی۔ عثمانی دور کے صوفیاء نے بلقان کے خطے میں اسلامی فکر، روحانیت اور حسن ذوق پر مبنی ایک خوشگوار اور زرخیز تہذیب کی بنیاد رکھی۔ اس خطے میں آنے والے اولین صوفی بزرگوں میں سے ایک بکتاشی سلسلے کے ولی، حضرت ساری سالٹک (محمد بخاری) تھے، جو چودھویں صدی میں یہاں تشریف لائے۔ ان کے مزارات آج بھی بوسنیا، رومانیہ، مقدونیہ اور البانیا جیسے ممالک میں موجود ہیں، جو تصوف کی علاقائی جڑوں اور اثرات کی واضح گواہی دیتے ہیں۔

بلقان کے خطے میں مسلمان روایتی طور پر روادار اور روحانی پہلو پر مبنی اسلام کی پیروی کرتے رہے ہیں۔ خوش قسمتی سے، آج بھی ان علاقوں میں تصوف اسلام کی غالب شکل ہے، اور وہابی سلفی ازم کی رسائی یہاں ویسی وسیع نہیں ہو سکی، جیسی کہ مغربی یورپی ممالک میں دیکھنے کو ملی ہے۔ اس خطے کے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد آج بھی حنفی صوفی اسلامی روایات کی پیروی ہے، اور یہ خصوصاً کوسوو اور مقدونیہ میں زیادہ نمایاں ہے۔ مقدونیہ، کوسوو، بوسنیا اور جنوبی سربیا میں روما نسل کی اکثریت مسلمان ہے، اور ان میں سے بیشتر کسی نہ کسی صوفی سلسلے سے وابستہ ہیں۔ بکتاشی سلسلہ، جو البانیا، بلغاریہ اور مقدونیہ میں رائج ہے، قرون وسطیٰ سے ان علاقوں میں موجود رہا ہے۔ بلقان کی مسلم برادریوں کی اسلامی ثقافت بڑی حد تک تصوف کے ورثے سے تشکیل پائی ہے۔ اپنے نسلی پس منظر سے قطع نظر، صوفی سلسلے یورپ کی مسلم برادریوں کی ثقافتوں میں گہرائی سے رچے بسے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات یہ پہچاننا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ کوئی فرد کس نسل یا قومیت سے تعلق رکھتا ہے، کیونکہ تصوف ان کی اجتماعی شناخت کا مرکزی پہلو بن چکا ہے۔

جنوبی ایشیا میں تصوف

قرون وسطیٰ میں جب اسلام برصغیر میں پھیلنا شروع ہوا، تو بارہویں صدی سے مختلف صوفی سلسلوں سے وابستہ کئی بزرگ ہستیاں ہندوستان آنے لگیں۔ تیرھویں صدی کے آغاز میں، تین معروف صوفی سلسلے تقریباً ایک ہی وقت میں برصغیر میں قائم ہوئے: چشتیہ، سہروردیہ، اور فردوسیہ۔ ان سلسلوں نے برصغیر میں نہ صرف اسلام کی تبلیغ کی، بلکہ روحانی، ثقافتی اور سماجی ہم آہنگی کی بنیاد بھی رکھی۔

پندرہویں صدی میں برصغیر میں قادری، شطاری، اور نقشبندیہ سلسلوں کا تعارف ہوا۔ ان صوفیاء نے ملک کے مختلف حصوں میں اپنی خانقاہیں قائم کیں، جو محض عبادت گاہیں نہیں بلکہ سماجی اور ثقافتی مراکز بھی تھیں۔ یہ صوفی بزرگ امیر و غریب میں امتیاز نہیں کرتے تھے، اور نہ ہی ذات پات کے فرق کو مانتے تھے، جبکہ اُس وقت کی ہندو سماج میں یہ امتیاز عام تھا۔ ان کی تعلیمات میں محبت، برابری اور انسانی وقار کو مرکزی مقام حاصل تھا۔ جلد ہی ان صوفیاء کو مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے پسماندہ طبقات میں غیر معمولی قبولیت حاصل ہوئی، اور وہ عوامی سطح پر انتہائی محبوب بن گئے۔

حضرت نظام الدین اولیاء (1235-1325) نے اپنے ایک معروف خلیفہ زر زری زربخش (یعنی ”سونا عطا کرنے والے“) کو سینکڑوں مریدوں کے ہمراہ موجودہ اورنگ آباد کے قریب خلد آباد میں سکونت اختیار کرنے کے لیے بھیجا۔ زربخش کا انتقال وہیں 1309 میں ہوا۔ روایت ہے کہ شردی والے سائیں بابا، زر زری زربخش کے مرید تھے۔ جب سائیں بابا کی عمر 22 برس تھی، تو وہ اسی غار میں مراقبہ کرتے تھے جہاں زربخش عبادت کیا کرتے تھے۔ سائیں بابا کی مذہبی شناخت ہمیشہ مبہم رہی، اور کسی کو یقین نہ ہو سکا کہ وہ پیدائشی طور پر مسلمان تھے یا ہندو۔ ان کی باتوں میں وحدت الوجود کی جھلک نمایاں تھی، اور انہوں نے جو کچھ بھی کہا، وہ ہمیشہ دوئی سے ماورا محسوس ہوا۔ وہ صوفی بزرگ تھے یا ادویت ویدانتی فلسفے کے نمائندہ، اس سوال سے ان کے لاکھوں ہندو، مسلمان، اور سکھ عقیدت مندوں کو کوئی غرض نہ تھی۔ ان کی زندگی مختلف مذاہب کے ملاپ کی نمایاں مثال بن گئی۔

برصغیر تاریخی طور پر اولیاء، درویشوں، اور رشیوں کی سرزمین رہا ہے۔ ہندوستان میں آنے والے پہلے عظیم صوفی بزرگ علی ہجویری (1009-1072) تھے، جو داتا گنج بخش کے نام سے مشہور ہوئے۔ وہ غزنی (افغانستان) میں پیدا ہوئے، اور اپنے سفر کے دوران انہوں نے شام اور دیگر مشرق وسطیٰ کے ممالک میں کئی معروف صوفیوں سے ملاقاتیں کیں۔ ان کے مرشد نے انہیں حکم دیا کہ وہ ہند کا سفر کریں اور لاہور میں قیام کریں۔ ابتدا میں وہ ہچکچائے کیونکہ ان کے ہم سبق شیخ حسن زنجانی پہلے سے لاہور میں مقیم تھے۔ مگر مرشد کے اصرار پر جب وہ لاہور پہنچے، تو معلوم ہوا کہ شیخ زنجانی کا انتقال ہو چکا ہے۔ پھر وہ لاہور کے بھٹی گیٹ کے قریب مقیم ہو گئے، جہاں آج ان کا مزار مبارک واقع ہے۔

ہندوستان میں صوفیائے کرام میں سب سے زیادہ مقبول اور ممتاز ہستی خواجہ معین الدین چشتی (1143-1234) کی ہے، جن کی جائے پیدائش موجودہ تاجکستان میں تھی۔ وہ بارہ برس کی عمر میں یتیم ہو گئے تھے۔ اس کے بعد وہ سمرقند (ازبکستان) گئے، جہاں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ وہاں سے وہ نیشاپور تشریف لے گئے، جہاں انہوں نے خواجہ عثمان چشتی کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کے مرید بنے۔ انہوں نے چشتیہ سلسلے میں سات سال تک تربیت حاصل کی، جس کے بعد انہیں اس سلسلے میں داخل کر لیا گیا۔ نیشاپور سے خواجہ صاحب نے بغداد کا سفر کیا، جہاں انہوں نے اپنے وقت کے کئی عظیم صوفی بزرگوں سے ملاقات کی جن میں شیخ عبدالقادر جیلانی (قادری سلسلے کے بانی)، ابونجیب سہروردی (سہروردیہ سلسلے کے پیشوا)، شیخ ابویوسف ہمدانی (نقشبندیہ سلسلے سے وابستہ)، اور شیخ شمس الدین تبریزی، جو مولانا جلال الدین رومی کے مرشد اور روحانی رہنما تھے، شامل تھے۔ بعد ازاں، اصفہان میں انہوں نے خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے ملاقات کی، جو ان کے مرید بنے اور بعد میں دہلی میں ان کے جانشین کے طور پر مشہور ہوئے۔

خواجہ معین الدین چشتی سب سے پہلے لاہور تشریف لائے، جہاں انہوں نے حضرت علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش کے مزار پر حاضری دی۔ بعد ازاں وہ ملتان کے راستے اجمیر پہنچے اور 1165-66 میں دہلی تشریف لائے، جہاں انہوں نے اپنی بقیہ زندگی گزاری۔ انہوں نے چشتیہ

سلسلہ کو ہندوستان میں متعارف کرایا اور انہیں خاص شہرت اس وقت حاصل ہوئی جب بادشاہ اکبر نے 14 جنوری 1562 کو ایک مختصر قافلے کے ساتھ اجمیر پہنچ کر ان کے درگاہ پر دعا کی۔ اکبر نے نہ صرف نذریں تقسیم کیں بلکہ حکم دیا کہ محل کی خواتین کو بھی درگاہ لایا جائے تاکہ وہ بزرگ کو خراج عقیدت پیش کریں۔ یہ عمل اکبر کی سالانہ حاضری اور روحانی عقیدت کی بنیاد بن گیا۔ اکبر کے ہاں 27 سال کی عمر تک کوئی اولاد نہ رہی تھی، چنانچہ اس نے خواجہ کی درگاہ پر بیٹے کے لیے دعا کی اور یہ منت مانی کہ اگر بیٹا پیدا ہوا تو وہ آگرہ سے اجمیر تک ننگے پاؤں پیدل سفر کرے گا۔ جب 30 اگست 1569 کو اکبر کی اہلیہ، جو کہ امبر (جئے پور) کی شہزادی تھیں، نے فتح پور سیکری میں ایک بیٹے کو جنم دیا، تو اکبر نے اپنی منت پوری کرنے کے لیے 20 جنوری 1570 کو آگرہ سے پیدل روانہ ہو کر 5 فروری کو درگاہ اجمیر پہنچا، روزانہ تقریباً 10 سے 12 میل کا سفر طے کرتے ہوئے۔ خواجہ معین الدین چشتی المعروف غریب نواز کی درگاہ مغل دور سے ہی تمام مذاہب کے لوگوں کا روحانی مرکز بن گئی، اور آج بھی یہ جگہ زائرین کے لیے عقیدت و محبت کا مقام ہے۔

تمام صوفیائے کرام کو مغل بادشاہوں کی طرف سے بے حد عزت و احترام حاصل رہا۔ شیخ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت معین الدین چشتی کے مرید اور روحانی جانشین تھے۔ ان کی پیدائش 1186 میں فرغانہ (اصفہان) میں ہوئی، جہاں ان کی خواجہ معین الدین چشتی سے ملاقات اس وقت ہوئی جب خواجہ صاحب ہند کی طرف سفر پر روانہ تھے۔ شیخ فرید الدین، جو عوام میں بابا فرید کے نام سے معروف ہیں، قطب الدین بختیار کاکی کے روحانی جانشین بنے۔ بابا فرید نے زہد و تقویٰ کی سخت ترین زندگی گزاری، اور ان کا نکاح دہلی کے سلطان بلبن کی بیٹی سے ہوا۔ وہ 1266 میں 93 برس کی عمر میں وفات پا گئے۔ برصغیر کے سب سے مشہور اور قابل احترام صوفی بزرگوں میں سے ایک، حضرت نظام الدین اولیاء، بابا فرید کے مرید اور اہم ترین جانشین تھے۔ تصوف کو ہندوستان کے کونے کونے تک پہنچانے کا سہرا بڑی حد تک حضرت نظام الدین اولیاء اور ان کے عظیم مرید حضرت امیر خسرو کے سر جاتا ہے، جنہوں نے روحانیت، علم، اور ثقافت کو ایک نئے رنگ میں عام کیا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی پیدائش 1236ء میں بدایوں (موجودہ اتر پردیش) میں ہوئی۔ آپ ایک انتہائی غریب خاندان میں پیدا ہوئے اور پانچ برس کی عمر میں والد کے سائے سے محروم ہو گئے۔ جب گھر میں کھانے کو کچھ نہ ہوتا تو والدہ فرمایا کرتیں: ”آج ہم اللہ کے مہمان ہیں“۔ ان کی اللہ پر غیر معمولی توکل نے حضرت نظام الدین پر گہرا اثر ڈالا اور آپ نے ابتدائی عمر ہی میں عظیم صفات کو اپنالیا۔ بیس برس کی عمر میں حضرت نظام الدینؒ نے بابا فریدؒ کی بیعت کی اور ان کے مرید خاص بنے۔ بعد ازاں بابا فریدؒ نے آپ کو اپنا خلیفہ بنا کر دہلی بھیجا۔ دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو عوام کی بے پناہ عقیدت حاصل ہوئی۔ اس وقت دہلی کا حکمران مبارک خلجی تھا، جو نئے چاند کی رویت کے موقع پر دربار لگا تا تھا اور حضرت نظام الدینؒ کی شرکت کا خواہاں تھا۔ مگر حضرت نے حکمران کے دربار میں حاضری سے انکار کر دیا، جس پر بادشاہ ناراض ہوا اور آپ کو دہلی چھوڑنے کا حکم دیا۔ تاہم نئے چاند کے طلوع سے پہلے ہی مبارک خلجی قتل ہو گیا اور اس کی جگہ غیاث الدین تغلق تخت نشین ہوا۔ اُس نے بھی حضرت نظام الدینؒ کو دہلی چھوڑنے کا حکم دیا اور خود بنگال کا سفر اختیار کیا۔ جب دربار کے کارندے حضرت نظام الدینؒ کو شاہی فرمان سننے آئے تو آپ نے صرف یہ جملہ فرمایا: ”ہنوز دہلی دور است“، یعنی ”ابھی دہلی دور ہے“۔ پھر جب غیاث الدین تغلق بنگال سے واپسی پر دہلی پہنچنے والا تھا، تو تغلق آباد میں اس کے استقبال کے لیے بنائی گئی چھتری اس پر گر پڑی اور وہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ حضرت کا یہ جملہ لوح تاریخ پر ثبت ہو گیا۔

حضرت امیر خسرو، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے وفادار اور محبوب ترین مرید تھے۔ آپ نہ صرف ایک عظیم صوفی بلکہ ایک مایہ ناز شاعر بھی تھے جنہوں نے پہلی مرتبہ عوامی زبان اردو میں گیت، پہیلیاں اور کہانیاں تخلیق کیں تاکہ تصوف اور محبت کا پیغام عام لوگوں تک پہنچ سکے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے وصال کے بعد، حضرت امیر خسرو نے اپنی باقی تمام زندگی اپنے مرشد کے مزار کے قرب میں غم و اندوہ میں بسر کی۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے بعد ان کے ایک اور مرید شیخ نصیر الدین، جو چراغ دہلوی کے نام سے مشہور ہوئے، ان کے جانشین بنے۔ ان کے بعد محمد گیسو دراز، جو بندہ نواز کے نام سے

جانے جاتے ہیں، ان کے جانشین ہوئے۔ اگرچہ ان کی پیدائش دہلی میں ہوئی تھی، مگر ان کے والد انہیں دولت آباد لے گئے۔ بعد میں وہ دہلی واپس آئے اور شیخ نصیر الدین سے بیعت کی۔ 1398 میں وہ دکن چلے گئے جہاں سلطان فیروز شاہ بہمنی نے ان کا پر جوش استقبال کیا۔ شیخ گیسو دراز 1422 میں گلبرگہ، کرناٹک میں وفات پا گئے جہاں ان کا مزار واقع ہے۔ اپنی زندگی کے دوران انہوں نے تصوف اور اسلام پر کئی کتابیں لکھیں۔

نقشبندی سلسلہ ان آخری صوفی سلسلوں میں سے تھا جو برصغیر میں آیا۔ اس سلسلے کا نام معروف صوفی بزرگ محمد بہاء الدین شاہ نقشبند کے نام پر رکھا گیا۔ سترہویں صدی کے آخر میں ایک اور عظیم صوفی بزرگ بلھے شاہ نے ذات پات، مذہب اور فرقے کی سرحدوں سے بالاتر ہو کر محبت اور روحانیت کا پیغام عام کیا۔ وہ سہروردی سلسلے کے بزرگ بہاء الدین زکریا کے مرید تھے۔ بلھے شاہ کے والد شاہ محمد ردیش ایک فاضل اور عربی و فارسی زبانوں کے عالم تھے، اور قرآن کریم کی عمدہ فہم رکھتے تھے۔

برصغیر میں ہندوستانی اور فارسی-عربی موسیقی کے امتزاج کا عمل مشہور سہروردی صوفی بزرگ شیخ بہاء الدین زکریا (1191-1267) کے زیر اہتمام شروع ہوا، جن کے خانقاہوں میں موسیقی کی محفلیں منعقد ہوتیں، جن میں گلوکار اس امتزاج کی کوشش کرتے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کے مقبول راگ 'ملتان' کی تخلیق بہاء الدین زکریا نے کی۔ تیرہویں صدی کے دوران دہلی چشتیہ سلسلے کا عظیم مرکز بن کر ابھرا۔

امیر خسرو (1253-1325) کی پیدائش پٹیالی، موجودہ اتر پردیش میں ہوئی۔ ان کے والد، امیر سیف الدین محمود، چنگیز خان کے دور حکومت میں ترکستان کے ایک قبیلے 'لاچین' کے سردار تھے، جو بعد میں ہجرت کر کے ہندوستان آ گئے۔ یہاں آ کر سلطان شمس الدین التمش کے دربار میں ایک عہدے پر فائز ہوئے۔ امیر خسرو ایک صوفی موسیقار، شاعر اور ہمہ جہت عالم تھے جنہوں نے کئی سازوں اور موسیقی کی اصناف کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا، جن میں قوالی دہلی کے سلاطین کے دور میں سب سے زیادہ مقبول صنف بنی۔

قول، نقش، ترانہ، نگار اور غزل جیسے مختلف موسیقی اصناف ہندوستانی گلوکاروں کے ذخیرہ موسیقی کا حصہ بن گئیں۔ قوالی شاہی درباروں کے ساتھ ساتھ ملک کے صوفی مراکز کا بھی ایک اہم جزو بن گئی۔ قوالوں کو دہلی کے گلوکار بھی کہا جانے لگا۔ وہ اپنی گائیکی کو راگ راگینوں کے ساتھ ساتھ لوک موسیقی پر بھی بنیاد بناتے، یوں ایک خوبصورت سنگم پیدا ہوا جو صوفی بزرگوں کے ہم آہستگی والے مزاج سے بہت ہم آہنگ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء کو راگ پوری بہت پسند تھا اور وہ روزانہ اسے سننے کی خواہش رکھتے تھے۔ امیر خسرو نے ان کی شان میں راگ پوری میں ایک خیال بندش ترتیب دی تھی جو آج بھی ہندوستانی کلاسیکی گلوکاروں کے ذریعہ گائی جاتی ہے۔ قوالی ہندو کیرتن سے مشابہ ہے اور شمالی ہند میں تمام مذاہب کے لوگوں میں بے حد مقبول ہوئی۔ مختلف سلسلوں کے صوفیاء قوالی کی محفلوں یعنی سماع اور ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کی مختلف اقسام کی طرف مائل تھے۔ سماع کی محفلوں کو روحانی بالیدگی کے لیے مفید سمجھا جاتا تھا۔

یہ مانا جاتا ہے کہ امیر خسرو نے ایرانی اور ہندوستانی سروں کے امتزاج سے ستارنامی ساز اور اس پر بجائے جانے والی کئی ڈھنیں ایجاد کیں۔ مقبول ڈھنیں جیسے کہ قول اور ترانہ بھی انہی کی تخلیق تھیں، جنہیں انہوں نے سماع کی رسومات میں نیا پن لانے کے لیے ترتیب دیا۔ ویشنو بھکتی کے گیت بھی یوں سماع کا حصہ بن گئے۔ شمالی ہندوستان میں موجود تمام صوفی سلسلے ہندو سنیا سیوں، یوگیوں، بیراگیوں اور ناتھ پنٹھیوں سے رابطے میں آئے۔ صوفیاء نے عام لوگوں کی زبان اور ہندو سنیا سیوں کے درمیان معروف استعارے اختیار کیے۔ انہوں نے یوگ شاستر کی تعلیمات پر مشتمل قدیم سنسکرت متن ”امرت کنڈ“ کو اپنایا، جس کا ترجمہ پہلے فارسی اور بعد میں عربی میں کیا گیا۔ برصغیر کے تمام صوفی اسلام کے بنیادی اصولوں کا احترام کرتے ہیں۔ وہ عام طور پر شریعت کے راستے کو، توحید کو، نبوت کی ضرورت کو اور اس کے حضور نبی کریم ﷺ پر اختتام کو قبول کرتے ہیں۔ اپنی ذاتی زندگی میں وہ اسلام کے پابند رہتے ہیں، اور عوامی زندگی میں ان کی انسان دوستی ہر سطح پر نمایاں ہوتی ہے۔

مسلم صوفیاء نے ہندوستانی ملی جلی تہذیب کی تشکیل میں نہایت اہم اور پائیدار کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے اکثریتی ہندو برادری کے عقائد اور روایات کا نہایت احترام کیا اور کشادگی،

محبت اور رواداری جیسے اوصاف کے ذریعے ہندوستانی معاشرے کے مشترکہ مزاج کو پروان چڑھایا۔ انہوں نے کئی ہندو اور مسلم رہنماؤں، دانشوروں اور شاعروں کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا جنہوں نے ملک کی تقدیر سازی میں اہم کردار ادا کیا۔ مشہور بنگالی مفکر راجہ رام موہن رائے اسلامی تصوف سے اس قدر متاثر تھے کہ انہوں نے ویدانتی فلسفے اور تصوف کے امتزاج کی کوشش کی۔ اسی طرح رابندر ناتھ ٹیگور کی شاعری پر بھی بنگال کے بادل صوفی گائیکوں کا گہرا اثر تھا۔ ان کے والد فارسی زبان کے عالم تھے اور حافظ شیرازی کی شاعری نوجوان ٹیگور کو سنایا کرتے تھے۔ بارہویں صدی سے تصوف اسلامی تہذیب کے سماجی ڈھانچے کا اہم ستون رہا ہے اور اس کے بعد سے یہ دنیا بھر میں پھیلتا گیا، جن میں چین، مغربی افریقہ، امریکہ، جنوبی اور وسطی ایشیا شامل ہیں۔ جہاں جہاں تصوف پھیلا، وہاں اس نے مقامی ثقافت کو جذب کیا، جیسا کہ ہندوستان میں ہوا، جس نے اسے عوام میں مقبول بنا دیا۔

بھکتی تحریک، جو سائیسویں صدی میں جنوبی ہند میں شروع ہوئی، بعد میں شمالی ہند کی طرف پھیل گئی اور پندرھویں سے سترھویں صدی کے درمیان اپنے عروج پر پہنچی۔ بھکتی سنت جیسے شنکرا، رامانجا، مادھوا، سوردا، میرابائی، تلسی داس، کبیر اور گرو نانک ہندو مذہب کے اندر پائی جانے والی تفریق کو مٹانے میں مصروف تھے۔ ابتدائی بھکتی تحریکوں اور تصوف کے درمیان فکری مکالمے نے ہندوستانی معاشرے میں ایک زیادہ آزاد خیال فہم اور ایک مشترکہ ثقافت کی بنیاد رکھی۔ کبیر اور گرو نانک دونوں نے ایک غیر فرقہ وارانہ مذہب کی تبلیغ کی جو روادار معاشرے پر مبنی تھتا۔ صوفیاء وحدت الوجود کے نظریے پر یقین رکھتے تھے، جسے مشہور صوفی بزرگ ابن عربی (1165-1240) نے مقبول بنایا۔ انہوں نے کہا تھا کہ تمام مذاہب غریبوں اور مظلوموں کی فلاح میں یکساں ہیں۔ تصوف کے بنیادی عقائد میں سے ایک خدا کی عبادت انسانیت کی خدمت کے ذریعے ہے۔ صوفیاء نے کبھی عقیدے کی بنیاد پر تفریق نہیں کی بلکہ تمام انسانوں سے یکساں سلوک کیا۔ اسلام میں مساوات پر جو زور دیا گیا ہے، اسے صوفیاء نے علما یا اسلام کے دیگر دھڑوں کی نسبت کہیں زیادہ اخلاص سے اپنایا۔

چودھویں صدی میں ابن تیمیہ پہلے اسلامی عالم تھے جنہوں نے صوفیاء کے ”عبادتِ اسلام“ پر تنقید کی۔ چند صدیوں بعد، عرب کے ایک اور عالم محمد ابن عبدالوہاب نے ابن تیمیہ کے نظریات سے متاثر ہو کر ایک سخت گیر فکر کو فروغ دیا، جس کے دور رس نتائج برآمد ہوئے۔ جب اٹھارہویں صدی میں عبدالوہاب کی سخت گیر سوچ نے سعودی قبائلی بستیوں میں اثر حاصل کیا، تو قدامت پسند علما نے صوفی سلسلوں پر الزام عائد کیا کہ وہ قرآن کے اصل اصولوں سے ہٹ گئے ہیں۔ یہ معرکہ آج بھی جاری ہے، جہاں وہابی عناصر اسلام کی نرم روح کو مٹا کر اسے ایک عسکری جہادی قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں، جسے سعودی عرب کی پشت پناہی حاصل ہے۔

برصغیر میں بھکتی سنتوں اور صوفیاء نے علاقائی ادب کی ترقی میں زبردست کردار ادا کیا۔ زیادہ تر صوفی شاعر تھے جنہوں نے مقامی زبانوں میں لکھنے کو ترجیح دی۔ بابا فرید نے مذہبی تحریروں کے لیے پنجابی کو اپنانے کی سفارش کی۔ ان سے پہلے شیخ حمید الدین ہندوی میں لکھتے تھے، اور ان کے اشعار فارسی تصوف کی ہندوی میں اولین ترجمانی کی بہترین مثال ہیں۔ شیخ گیسو دراز دکنی ہندی کے اولین نثر نگار تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ ہندی، تصوف کی وضاحت کے لیے فارسی سے زیادہ مؤثر زبان ہے۔ متعدد تصوف پر مبنی تصانیف بنگالی زبان میں بھی تحریر کی گئیں۔

دکن کے علاقے میں مختلف صوفی سلسلے قائم ہوئے، جن میں کچھ شمالی ہند سے، اور کچھ بغداد، ایران اور شام جیسے بیرونی خطوں سے آئے۔ شمالی ہند سے آنے والے سلسلوں میں چشتی، جنیدی اور شطاری شامل تھے، جبکہ مشرق وسطیٰ اور وسطی ایشیا سے آنے والے قادری، نعمت اللہی اور نقشبندی سلسلے بیدر، بیجا پور اور گنگ آباد میں اپنے علیحدہ ڈھانچے کے تحت سرگرم تھے۔ سوانحی تحریروں سے پتا چلتا ہے کہ 1300 سے پہلے بھی خلد آباد (دولت آباد)، گلبرگہ اور بیجا پور میں صوفیاء کی موجودگی تھی، تاہم ان کی شخصیات، افکار، سلسلوں اور انداز کار کے بارے میں صرف مبہم معلومات دستیاب ہیں۔

بعض علما کا خیال ہے کہ کچھ صوفیاء ابتدائی مسلم فاتحین جیسے علاء الدین خلجی کے ساتھ دکن آئے تھے۔ چودھویں صدی کے آغاز تک دکن کو ایک اہم مقام حاصل ہو چکا تھا اور شیخ نظام الدین

اولیاء کی دہلی میں منعقدہ محفلوں میں اس کا ذکر عام ہونے لگا تھا۔

سولہویں صدی میں نقشبندی سلسلہ بھی دکن کے علاقے میں پہنچا۔ انہوں نے کھل کر اسلام کی حمایت کی۔ ذات پات سے جکڑی ہوئی دکنی سماج میں مختلف سلسلوں کے صوفیاء، جو سخاوت، محبت، مہمان نوازی، الفت اور مساوات جیسے اصولوں کے پابند تھے، نہ صرف اس سماج کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئے بلکہ عوام میں بھی جلد مقبولیت حاصل کی۔ مقامی برادریوں سے میل جول کے بعد صوفیاء کا رویہ وقت کے ساتھ بدلنے لگا۔ ان کی خانقاہیں روحانی اور فکری سرگرمیوں کا مرکز بن گئیں جو مقامی ثقافت کے ساتھ جڑ گئی تھیں۔ انہوں نے حکمران طبقے سے فاصلہ رکھا اور اپنی خود مختاری کو قائم رکھا۔ سترہویں صدی کے اختتام تک خانقاہوں کی جگہ درگاہوں نے لے لی، پیروں کی جگہ پیروزادے آ گئے، اور یوں بلند پایہ فکری و روحانی مشقیں اُن اُن پڑھ عوام کے ہاتھوں میں چسلی گئیں جو اب خدا سے روحانی قربت کی بجائے مزاروں سے برکت مانگنے لگے تھے۔

کشمیر اور تصوف

وادی کشمیر میں تصوف نے ہمیشہ لوگوں کی روحانی رہنمائی کی ہے اور کشمیری معاشرے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ کشمیری تصوف کی انفرادیت اس میں ہے کہ یہ اسلامی تعلیمات کے عرفانی پہلوؤں کو بدھ مت کی تانتراک روایات اور ہندو شیو مت فلسفوں کے ساتھ ہم آہنگ کرتا ہے۔ قرون وسطیٰ سے ہی کشمیر میں جن روایتی صوفی سلسلوں نے جڑیں پکڑیں، وہ بنیادی طور پر سہروردی، قادری اور نقشبندی سلسلے تھے۔ ان سلسلوں کی ایک نمایاں خصوصیت ہندو مسلم اشتراکیت تھی۔ پنڈت اور مسلم برادریوں سے تعلق رکھنے والے ریشی اور صوفی محبت اور پر امن بقائے باہمی کا پیغام لے کر آئے۔ وہ خدا تک رسائی کے لیے قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ ہندو ویدوں اور فلسفوں سے بھی استفادہ کرتے تھے۔ کشمیری تصوف کی یہی غیر فرقہ وارانہ اور مقامی فطرت وہ بنیاد بنی جس پر کشمیری پنڈت اور کشمیری مسلمان مل کر 'کشمیریہ' کی ہم آہنگ روایات کو تشکیل دیتے رہے۔

تصوف کشمیر میں سن 1320 میں مسلم اقتدار کے آغاز کے ساتھ ہی پہنچا، تاہم خانقاہوں اور سلاسل کے قیام جیسی مسلسل صوفی سرگرمیاں چودھویں صدی کے اختتام پر شروع ہوئیں۔ سولہویں صدی کے آخر تک سہروردی، کبروی، نقشبندی اور قادری جیسے صوفی سلسلے کشمیری عوام میں گہرے طور پر پیوست ہو چکے تھے۔ فارس اور وسطی ایشیا سے کشمیر آنے والے صوفیوں کا مقصد اسلام کا پیغام پھیلا نا تھا۔ انہوں نے وادی کے مختلف علاقوں میں خانقاہیں قائم کیں۔ ابتدائی دور میں یہ خانقاہیں غریبوں کو کھانا کھلانے کے لیے استعمال ہوتی تھیں اور ان سے ملحقہ مدارس تعلیم دینے کے لیے قائم کیے گئے تھے۔ شیخ اسماعیل کبروی کے قائم کردہ مدارس میں افغانستان اور وسطی ایشیا سے بھی طلباء آیا کرتے تھے۔

سہروردی سلسلے جیسے بعض صوفی سلاسل نے خواتین کی تعلیم پر بھی خاص زور دیا اور ان کے لیے مدارس قائم کیے۔ تصوف نے کشمیری ادب پر بھی گہرا اثر ڈالا، اور بہت سے ہندو اہل علم نے فارسی زبان سیکھی اور اس میں اعلیٰ درجے کی نثر و نظم تخلیق کی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تصوف نے کشمیری عوام کی زندگی، رویے اور مذہبی شعور کی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کیا۔ بد قسمتی سے 1990 کے بعد، تصوف اور وہابی سلفی ازم جو اسلام کی قدامت پسند اور سخت گیر تعبیر ہے، کے درمیان خلیج میں تیزی سے اضافہ ہوا۔

ریشیت کشمیر کی سر زمین میں پیدا ہونے والی ایک مقامی روحانی روایت ہے، جو پندرہویں صدی میں ریشی صوفی تحریک کے طور پر ابھری۔ اس تحریک کی قیادت بابا حیدر ریشی، جو رش میر صاحب کے نام سے جانے جاتے ہیں، اور شیخ نور الدین (1378-1439) المعروف نند ریشی جیسے بزرگوں نے کی۔ شیخ نور الدین ایک عظیم صوفی بزرگ تھے جنہوں نے اپنے وقت کے درباروں اور سماجی و مذہبی اداروں سے کنارہ کشی اختیار کی اور سادگی، قناعت، خدمت حلق اور روحانی پاکیزگی کی مثال قائم کی۔ ان کی زندگی کا زہد و تقویٰ اس قدر نمایاں تھا کہ بعض حکمرانوں نے ان کے نام پر سکے جاری کیے۔ ریشی سلسلہ اپنے طرز فکر اور طرز عمل میں دوسرے کشمیری مسلم صوفیوں سے مختلف نظر آتا ہے، کیونکہ اس میں ترک دنیا، فطرت سے قربت اور ہر مذہب و مخلوق

کے ساتھ رواداری کو مرکزیت حاصل ہے۔

صوفیائے کرام کا مجموعی رویہ ہمدردی، مروت اور دوسروں کے احساسات کا خیال رکھنے پر مبنی تھا۔ ان کے اخلاقی اصول اور بلند اقدار کشمیری معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں ایک عملی نمونہ تھے۔ صوفیانہ طرز فکر نے کشمیریوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔ اس روحانی اثر کو عوام میں رچنے بسنے میں کئی صدیاں لگیں۔ مثال کے طور پر اورادِ فتحیہ نامی دعا چودھویں صدی سے کشمیری مساجد میں اجتماعی طور پر پڑھی جا رہی ہے، جب بزرگ ولی میر سید علی ہمدانی کشمیر میں موجود تھے۔ یہی انہوں نے پہلی بار اس عمل کا آغاز کیا اور عوام میں اسے رواج دیا۔ قرآن مجید کی آیات اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال پر مشتمل اس مجموعے کو صاحب میں بطور ذکر شامل کیا گیا، جو مندروں میں جاپ کی طرح تھا۔ یہ خاموش عبادت کے مسلم طریقے سے واضح انحراف تھا۔ اسی طرح میر ہمدانی نے 'دعائے صبح' متعارف کرائی جو بدھ مت کے صبح کے جاپ سے مشابہ تھی۔ یہ تمام معمولات کشمیر کی معروف بین المذاہب روایات کی ایک نمایاں مثال کے طور پر دیکھے گئے۔

میر سید علی ہمدانی، جن کا شجرہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملتا ہے، 1314 میں موجودہ ایران کے شہر ہمدان میں پیدا ہوئے اور تاجکستان کے شہر کولاب میں مدفون ہیں۔ وہ آخری بار 1384 میں وادی کشمیر تشریف لائے، جس وقت وسطی ایشیا تیمور کے ترک و غل حملوں کی زد میں تھا۔ ان کے ہمراہ تقریباً سات سو افراد آئے، جن میں فنکار، ہنرمند، مصور، خوشنویس اور علما شامل تھے۔ کشمیری عوام انہیں 'امیر کبیر' کے لقب سے جانتے ہیں۔ کشمیر میں دستکاری، حناص طور پر شامل بانی، کوفروغ دینے کا سہرا انہی کے سر جاتا ہے، جو بعد میں کشمیر کی عالمی پہچان بن گئی۔ وہ خود بھی نفیس کڑھائی کے ماہر تھے۔

ہمدانی نے تقریباً سو کے قریب کتب تصنیف کیں جن کے موضوعات میں دین، فقہ، سیاست اور فلسفیانہ شاعری شامل ہیں۔ ان کی معروف تصنیف ذخیرۃ الملک حکمرانوں کے لیے ایک رہنما کتاب تھی جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ رعایا کے ساتھ کیسا برتاؤ رکھنا چاہیے۔ اس میں یہ بھی زور دیا گیا

کہ عدل و انصاف مذہبی اختلافات سے بالاتر ہو کر کیا جانا چاہیے۔ ہمدانی نے خانقاہوں کا ایک وسیع نیٹ ورک قائم کیا، جہاں لوگ بلا امتیاز ساتھ کھاتے اور عبادت کرتے تھے۔ یہ ایک طبعاتی تفریق والے معاشرے میں انقلابی تبدیلی تھی۔ سری نگر میں ایک ایسا مندر بھی ہے جس کی بالائی منزل پر مسجد اور زیریں منزل پر دیوی کالی کا مندر واقع ہے۔ تاہم، وادی میں جو مقبول صوفی روایت پروان چڑھی، اُس نے کشمیری مسلمانوں کو نسبتاً زیادہ سادہ لوح اور زود باور بنادیا۔

ہندوستانی اسلامی تناظر میں اٹھارہویں صدی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اگرچہ عظیم مغلیہ سلطنت زوال پذیر تھی، لیکن فکری اور سماجی بیداری کا آغاز ہو چکا تھا۔ اسی صدی میں شاہ ولی اللہ دہلوی جیسے علماء، جہاں آباد کے صوفی شاہ کلیم اللہ، اور رنج سودا، میر تقی میر اور مہر چند بہار جیسے اردو شاعر پیدا ہوئے۔ شاہ ولی اللہ ایک ممتاز دینی اور صوفی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی تعلیم دہلی میں ہوئی اور بعد ازاں وہ مکہ اور مدینہ بھی گئے۔ بجا طور پر انہیں ہندوستان میں قرون وسطیٰ اور جدید اسلام کے درمیان ایک پل قرار دیا جاتا ہے۔ وہ مسلمانوں میں مذہبی اور اخلاقی زوال سے شدید رنجیدہ تھے اور اکثر اس بات پر افسوس کرتے تھے کہ مسلمانوں نے اللہ کے احکام اور رسول اکرم کی تعلیمات سے بے رغبتی اختیار کر لی ہے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کی نجات کا واحد راستہ یہی تھا کہ انہیں قرآن اور سنت کی تعلیمات سے آگاہ کیا جائے۔ شاہ ولی اللہ کا صوفیانہ نقطہ نظر کشادہ تھا۔ اگرچہ وہ نقشبندی سلسلے سے بیعت یافتہ تھے، لیکن انہوں نے اپنے وقت کے تمام بڑے صوفی سلسلوں سے رہنمائی لی۔ انہوں نے اولیاء کے مزارات پر جانے سے منع نہیں کیا، لیکن اس بات پر زور دیا کہ مردہ بزرگوں سے دنیوی حاجات طلب نہ کی جائیں۔ انہوں نے مدینہ منورہ میں حضور اکرم کے روضہ اقدس کی زیارت کی اور اسے ایک روح پرور تجربہ قرار دیا۔

دیوبند مدرسہ، جو دہلی سے تقریباً 150 کلومیٹر شمال میں واقع ہے، 1866ء میں علما کے ایک گروہ نے مولانا محمد قاسم کی قیادت میں قائم کیا۔ اس کے بانیوں میں سے بعض کا صوفی اسلام سے گہرا تعلق تھا۔ دیوبند کے مؤسسين نے شاہ ولی اللہ کی روایت میں چار اہم صوفی سلسلوں کی روحانی وراثت کو اپنایا، خصوصاً چشتیہ اور نقشبندیہ سلسلوں کا اثر نمایاں تھا۔ علما کا ماننا ہے کہ دیوبندی

تحریک کو سید احمد بریلوی سے تحریک ملی، جو نقشبندیہ سلسلے سے وابستہ تھے۔ تصوف کے حوالے سے، دیوبند کے تمام بانی، خاص طور پر مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی نے اپنی وسیع صوفیانہ بصیرت اپنے پیرومرشد اور معروف صوفی بزرگ حاجی امداد اللہ سے حاصل کی تھی۔

دیوبندی تعلیمات، جو قرآن، حدیث اور سنت سے مستند ہیں، قرونِ وسطیٰ کے سنی حنفی علما کی روایتی تعلیمات اور فہم سے گہرا تعلق رکھتی ہیں، جن کی پیروی ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت کرتی تھی۔ مزید برآں، دیوبندی اصلاحی نقطہ نظر بڑی حد تک ایمان کے حوالے سے ایک جدید رجحان کی نمائندگی کرتا ہے، کیونکہ اس کا ربط عوامی صوفی سلسلوں کے عقائد سے بھی جڑا ہوا تھا۔

دیوبند آغاز ہی سے ہندوستانی تحریک آزادی اور مذہبی دفاع سے وابستہ رہا۔ اپنے ابتدائی عشروں میں دیوبند کی تیز رفتار ترقی اور اُس کو حاصل ہونے والی علمی و دینی وقعت بڑی حد تک اُس کے لبرل رویے اور کثرتِ رائے پر مبنی نقطہ نظر پر مبنی تھی، نہ کہ اٹھارویں صدی کے سعودی عالم ابن عبدالوہاب کی ادارہ جاتی تطہیری اصلاحات پر۔ اگرچہ اس کے بانیوں کی نیت نیک اور رویہ معتدل تھا، لیکن بعد کے ادوار میں یہ ادارہ بعض غیر ضروری تنازعات میں الجھتا چلا گیا۔ اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ ہندوستان میں مقبول اسلام کے بیانیے میں مترونِ وسطیٰ کے صوفی بزرگوں کے مزارات کی تولیت کو اہم مقام حاصل تھا، جب کہ دیوبند نے ایک زیادہ پاکیزہ اور تجریدی صوفیانہ طرزِ عمل کو اپنایا، جو عرس، سماع اور میلادِ گہی جیسے رسوم و رواج سے الگ تھا۔ تاہم، یہ حقیقت کہ دیوبند تمام صوفی سلاسل کو تسلیم کرتا ہے اور مقبول عوامی رسوم کے بارے میں اس کا رویہ نرم ہے، اختلافات اور تصادم کی گنجائش کم کر دیتا تھا۔ اس کے باوجود، انیسویں صدی کے اختتام سے قبل دیوبند فرقہ وارانہ تنازعات کی لپیٹ میں آ گیا، جب اس سے منسلک ایک گروہ، اہل حدیث، نے مزارات سے جڑے cult کے خلاف ایک سخت گیر تطہیری موقف اختیار کر لیا۔

انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں دیوبند اور اہل حدیث کی تحریکیں سعودی عرب کی جانب سے فروغ دیے جانے والے سلفی تحریک کے زیرِ اثر آ گئیں۔ اہل حدیث کا فرقہ وارانہ رویہ عام لوگوں کے لیے زیادہ نمایاں اس وجہ سے تھا کہ وہ تصوف اور اس کے عقائد کو کھلے عام رد

کرتے تھے۔ اس کے برعکس، روایتی دیوبندی اہل حدیث کی اس انتہا پسندانہ اصلاحی سوچ، خصوصاً تصوف کی کلی تردید، کے مخالف تھے۔ دیوبند نے عمومی طور پر عوامی صوفی سلسلوں سے ایک پالیسی کے تحت فاصلہ اختیار کیے رکھا اور اس کے بعد وہ مذہبی اصلاحات کے نسبتاً مثبت پہلوؤں پر توجہ مرکوز کرنے لگا۔

تاہم انیسویں صدی کے اختتام پر جو حنفی بریلوی مکتب فکر ابھرا، اُس نے مقبول اسلام کی بھرپور وکالت کی۔ دیوبند کے مد مقابل یہ تحریک مولانا احمد رضا خان بریلوی کی قیادت میں اٹھی، جنہوں نے اتر پردیش کے بریلی سے اس کی قیادت سنبھالی۔ انہوں نے دیوبند کے طرز پر بندیل کھنڈ کے علاقے میں ایک مدرسہ قائم کر کے مقبول اسلام کو علمی بنیاد فراہم کی۔ مخالفت کی شدت یہاں تک پہنچ گئی کہ بریلوی قیادت کو حجاز (مکہ و مدینہ) کے مفتیان کرام سے دیوبند کے خلاف فتویٰ لینا پڑا، اور جو شخص ان کے عقائد سے اختلاف رکھے اسے کافر تک قرار دیا گیا۔ عوامی اسلام کی نمائندگی اور دفاع شاید ہی کبھی اس شدت سے ہوا ہو جیسا کہ بریلوی علماء کی قیادت میں ہوا۔ بد قسمتی سے، ہندوستانی سنی مسلم برادری دو بڑے حنفی گروہوں، دیوبندی اور بریلوی میں منقسم ہو گئی۔

دیوبند کے بانیان کے روحانی پیشوا، حاجی امداد اللہ مہاجر کی، جنہوں نے مکہ مکرمہ ہجرت کی تھی، ان دونوں مکاتب پر اپنے اثر و رسوخ سے بخوبی آگاہ تھے۔ انہوں نے ان حنفی مکاتب کے درمیان مفاد ہمانہ فضا قائم کرنے کی کوشش میں ایک خط لکھا، جو فیصلہ ہفت مسئلہ کے عنوان سے شائع ہوا۔ یہ ایک نہایت محتاط اور متوازن مشورہ تھا، جو دیوبندی مصلحین اور بریلوی عوامی اسلام کے حامیوں، دونوں کے نام تھا، جس میں انہیں ایک دوسرے کے نظریات کو زیادہ برداشت کے ساتھ سمجھنے کی تلقین کی گئی تھی۔

ہندوستان کے سنی مسلمان آپس میں دو بڑے دھڑوں میں منقسم ہیں، وہابی۔ سلفی اور صوفی۔ گزشتہ کئی دہائیوں سے ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک شدید نظریاتی کشمکش جاری ہے، جس میں طاقتور سعودی حمایت یافتہ وہابی گروہ ہندوستانی صوفی سنیوں کو اپنے نظریاتی دائرے میں

شامل کرنے کی مسلسل کوششوں میں مصروف ہیں۔ یہ دو مذہبی نظریات کے درمیان ایک معرکہ ہے ایک اعتدال پسند اور جامع، دوسرا سخت گیر اور اخراجی۔ صوفی سنی، جنہیں ہندوستان میں اہل سنت یا بریلوی بھی کہا جاتا ہے، اولیاء کرام کی تعظیم کرتے ہیں اور نبی کریم ﷺ کا جشن ولادت مناتے ہیں، جب کہ وہابی اس عمل کو بدعت سمجھتے ہیں۔ صوفی سنیوں کے لیے بزرگان دین کی درگاہوں پر حاضری دینا ایک روحانی اور قلبی تجربہ ہوتا ہے، جبکہ وہابی عقیدہ یہ رکھتا ہے کہ اللہ اور بندے کے درمیان کسی قسم کی وساطت یا شفاعت شرک کے مترادف ہے، اور وہ سعودی عرب کی جانب سے پھیلائے گئے سخت گیر نظریات کے پیروکار ہیں۔

تمام جہادی دہشت گرد تنظیمیں جیسے داعش، القاعدہ اور طالبان وہابی نظریے کی حامل ہیں۔ دنیا کے مختلف حصوں میں جتنے بھی افراد انتہا پسندی کی طرف مائل ہوئے، ان میں سے تقریباً سب کا تعلق وہابی۔ سلفی فکر سے رہا ہے، جب کہ آج تک کوئی بھی نمایاں دہشت گرد تنظیم معتدل اور جامع صوفی سنی نظریہ سے وابستہ نہیں رہی۔ سعودی سرمائے سے چلنے والے وہابی مبلغین نے ہندوستان کی مساجد اور مدارس میں کئی صوفی النسل نوجوانوں کو اپنے نظریات میں تبدیل کر لیا ہے۔

جنوبی ہندوستان میں تصوف

تصوف نے کیرالہ کی جنوبی ریاست کے مللا بار خطے میں مہٹا مسلمان برادری کے معاشرتی و ثقافتی وجود پر کئی صدیوں کے دوران گہرا اثر ڈالا ہے۔ ابتدائی دور میں کیرالہ میں اسلام کی تبلیغ زیادہ تر مالک بن دینار کے ذریعے ہوئی، جو عرب سے ایک جماعت کے ساتھ کیرالہ کے ساحل پر پہنچے تھے۔ مالک بن دینار ایک صوفی سالک تھے اور اسلام کے عظیم ترین صوفیوں میں سے ایک، حسن بصری کے شاگرد تھے۔

پندرھویں صدی کی دوسری نصف میں کیرالہ کے قصبہ پوتانی نے مہٹا مسلمانوں کے لیے ایک اہم مذہبی اور ثقافتی مرکز کی حیثیت اختیار کر لی۔ پوتانی کے پہلے شیخ، مخدوم زین الدین (1467-1521)، نے مللا بار میں تصوف پر ایک جامع کتاب تحریر کی۔ سولہویں اور سترھویں صدیوں کے دوران کیرالہ میں صوفی سنی اسلام وسیع پیمانے پر پھیل چکا تھا۔ تصوف نے اپنی

ابتدائی تشکیل کے مرحلے میں اشرافیہ تک محدود رہ کر ترقی پائی، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ یہ عام لوگوں تک بھی پہنچا اور ایک عوامی تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔ اولیا کرام کی مزارات پر حاضری اور ان سے عقیدت و نیاز مندی، کیرالہ کے عام لوگوں میں بہت مقبول تھی، کیونکہ اس سے انہیں خدا سے قربت اور روحانی سکون حاصل ہوتا تھا۔ صوفی تنظیمیں جیسے خانقاہ، جماعت خانے اور زاویے، آج بھی ملا بار کے مختلف حصوں میں موجود ہیں۔ خانقاہ کے متبادل کے طور پر موجودہ زمانے میں پوتانی پٹی (پوتانی کی مسجد) کو دیکھا جاتا ہے، جہاں طلباء ایک اجتماعی رہائش میں رہ کر دینی اور اخلاقی تربیت حاصل کرتے ہیں۔ یہاں شریعت کے ساتھ ساتھ ہمہ گیر علم پر بھی زور دیا جاتا ہے۔ جب طلباء اس دینی مدرسے سے کامیابی کے ساتھ تعلیم مکمل کرتے ہیں تو شیخ انہیں ایک اعزازی خطاب عطا کرتے ہیں، جو انہیں دینیات کا معلم بننے کے قابل بناتا ہے۔

پوتانی کے شیخ مخدوم ایک طویل عرصے تک ملا بار خطے میں مسلمانوں کے اعلیٰ ترین مذہبی پیشوا سمجھے جاتے تھے، یہاں تک کہ بیسویں صدی کے آغاز میں وہابی سلفی ازم کے پھیلاؤ نے ان کی حیثیت کو چیلنج کرنا شروع کیا۔ صدی کے اختتام تک، سعودی عرب کی مالی معاونت سے سرگرم سلفی تنظیموں کی جارحانہ تبلیغی مہمات کے باعث کیرالہ میں وہابی اثر و رسوخ میں خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ کیرالہ کے وہ زیادہ تر افراد جو داعش میں شامل ہوئے، سلفی گروہوں سے وابستہ تھے۔ کیرالہ میں سلفی گروہوں کی بڑھتی ہوئی موجودگی ریاست کے کثرت پسند سماج کی بین المذاہب ہم آہنگی کے لیے نقصان دہ ثابت ہو رہی ہے۔

کیرالہ کے مغربی ساحل سے دو واقعہ جرائز کے مجموعے کو لکشدیپ کہا جاتا ہے۔ سن 900 میں بخارا سے تعلق رکھنے والے ایک معروف صوفی بزرگ، شیخ جلال الدین، ان حبسزیروں پر تشریف لائے۔ ان کی اولاد کو علمی فضیلت اور سماجی قیادت کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔ ان کے سلسلے کے پانچویں بزرگ سید مولا تھے، جن کی ولادت گورائی جزیرے پر ہوئی۔ ان کی صوفی تعلیمات کا اثر کیرالہ کے مغربی ساحل کے مختلف علاقوں میں آج بھی محسوس کیا جاسکتا ہے، جو منگلور سے تراوگور تک پھیلا ہوا ہے۔

سید حسینی، جو گبرگہ، کرناٹک میں واقع حضرت خواجہ بندہ نواز درگاہ کے متولی ہیں، کے مطابق تصوف اور سریت (Mysticism) کے درمیان واضح فرق ہے۔ اُن کے مطابق تصوف محض روحانی تجربے پر مبنی ایک تصور ہے، جبکہ سریت میں روحانی مشاہدات کے ساتھ فلسفیانہ افکار و نظریات بھی شامل ہوتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں ظاہری اور باطنی، یا شریعتی (exoteric) اور طریقتی (esoteric) اور مذہب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ مذہب کا باطنی پہلو دراصل سریت ہی ہے۔ سید حسینی کا یہ بھی کہنا ہے کہ صوفی وہ ہیں جو دین اسلام کی تفہیم رسول اکرم ﷺ کے طریقے پر کرتے ہیں۔ انہوں نے بارہویں صدی کے شرنوں (Sharanas) اور ویرشیو (Veerashaiva) سنتوں کی تعلیمات کو صوفیانہ تعلیمات سے مشابہ قرار دیا۔ سنت شرنب اسویشور اور خواجہ بندہ نواز کی تعلیمات میں نمایاں مماثلت موجود ہے، اور بعض علما کا تو یہ بھی ماننا ہے کہ خواجہ ہی چیتنہ مکتب فکر کے بانی تھے، جس کے ماننے والے آج بھی پورے بھارت میں موجود ہیں۔ یہاں تک کہ آج بھی شرن باسویشورامیلے کی سالانہ جلوس کا آغاز اُس مقدس پیالے (Holy Chalice) کی آمد کے بعد ہوتا ہے جو خواجہ بندہ نواز کی درگاہ سے آتا ہے۔

بھکتی تحریک، ایک لحاظ سے، بھارت میں اسلام کے پھیلاؤ کا براہ راست نتیجہ تھی۔ توحید، مساوات، اخوت، اور طبقاتی تقسیم کی نفی، یہ سب اسلام کی خصوصیات ہیں، جنہوں نے اس دور کے بھارتی مذہبی رہنماؤں پر گہرا اثر ڈالا۔ صوفیائے کرام کی تعلیمات نے بھکتی اصلاح پسندوں جیسے رامانند، کبیر اور نانک کی فکر کو جلا بخشی، جنہوں نے ایک غیر فرقہ وارانہ مذہب کی تبلیغ کی جو آفاقی محبت پر مبنی تھا۔

تصوف، اسلام کے اندر ایک لبرل تحریک ہے، جس کی ابتدا فارس میں ہوئی اور گیارہویں صدی میں یہ برصغیر میں پھیلی۔ جنوبی بھارت کے ہندو حکمرانوں کو عرب تاجروں کی ضرورت تھی، چنانچہ انہوں نے انہیں مکمل سہولیات فراہم کیں اور برابری کا درجہ دیا۔ ان ابتدائی مبلغین اور ان کی پیش رفت نے صوفی اسلام کو پورے قتل خطے میں پھیلانے میں مدد دی۔ دراصل، بھکتی

تحریک ہندومت کا ایک علاقائی احیاء تھا، جس نے عقیدت اور کسی مخصوص دیوی یا دیوتا کے ذریعے مختلف زبانوں، جغرافیوں اور ثقافتی شناختوں کو آپس میں جوڑا۔

پونڈت پجیری یونیورسٹی کے پروفیسر گننا سندر کے مطابق، تمل ادب بھکتی کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ اگر ہم گیتوں کی تعداد اور ان کے موضوعات کی وسعت پر نظر ڈالیں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ بھکتی محض مذہب سے متعلق نہیں بلکہ ساتویں صدی سے تمل سماجی تاریخ کا اظہار بھی ہے۔ بھارت میں آنے والے پہلے عظیم صوفی جنہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ تمل ناڈو میں گزارا، اناتھار والی تھے۔ وہ 959 میں پیدا ہوئے، اسلام کا پیغام تمل عوام تک پہنچایا اور 1026 میں انتقال کیا، ان کی درگاہ تروچیراپلی میں واقع ہے۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی دہلی کے تاریخ کے پروفیسر ہرنس مکھیہ کے مطابق، صوفی اور بھکتی تحریکیں تاریخ کو بیان کرنے کے دیگر طریقوں کی روشن مثالیں ہیں۔ ان کے مطابق تاریخ اندرونی سطح پر خاموشی سے کسی شے کے زوال کے ذریعے وقوع پذیر ہوتی ہے، بغیر اس کے کہ کسی بیرونی عنصر سے دشمنی کا رشتہ قائم ہو، یا کسی بڑی انقلابی یا ڈرامائی واقعے کا ظہور ہو جیسا کہ فرانسیسی یا روسی انقلاب میں ہوا۔ صوفی تحریک نے، اگرچہ اسلامی تصورات کائنات کو فروغ دیا، مگر وہ حکمرانوں اور علما کے تصور سے کافی حد تک مختلف تھی، اور یہی وہ مقام تھا جہاں سے اس نے تبدیلی پیدا کی۔

داراشکوہ، جو شہنشاہ شاہجہان کے چار بیٹوں میں سے ایک تھے، قادرِ یہ سلسلے کے پیروکار اور علم و عرفان کے دلدادہ تھے۔ وہ ہندو دھرم میں گہری دلچسپی اور فہم رکھتے تھے۔ انہوں نے ایک نہایت دلکش کتاب ”مجمع البحرین“، یعنی ”دو دریاؤں کا سنگم“ تصنیف کی، جو اسلام اور ہندومت کے درمیان فکری ہم آہنگی پر مبنی ہے۔ داراشکوہ نے سنسکرت میں تقریباً تمام اہم ہندو مذہبی متون کا مطالعہ کیا اور ویشنوا اور شیوا مت کے علما سے وسیع علمی گفتگو بھی کی۔ انہوں نے ان فارسی تراجم کا بھی مطالعہ کیا جو ہندو مذہب پر سنسکرت میں لکھی گئی کتب کے ترجمے تھے اور جو اکبر و جہانگیر کے عہد میں مکمل ہوئے، اور غالباً انہی تراجم نے ان کی دلچسپی کو فلسفہ ہند اور باطنیات کی طرف مائل کیا۔

شاہ ولی اللہ دہلوی، جو دہلی کے معروف صوفی رہنما اور اسلامی اسکالر تھے، ان کے اصلاحی

اثرات جنوبی ہند، خاص طور پر تمسل ناڈو میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں، جہاں ان کی اصلاحی تحریک ان کے خلفاء جیسے کہ شیخ مندوم کے ذریعے پہنچی، جو انیسویں صدی میں ترونیلوئی ضلع میں سرگرم رہے۔ تاہم، برصغیر میں سب سے پہلے جنہوں نے صوفیانہ رسوم و رواج اور بزرگان دین کے مزاروں سے منسلک تہواروں، خاص طور پر عرس کی تقریبات پر تنقید کی، وہ شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز تھے۔ انہوں نے وہابی نقطہ نظر اختیار کرتے ہوئے ان رسوم کو ہدف تنقید بنایا۔

آل انڈیا علماء و مشائخ بورڈ (AIUMB)، جو کہ بھارت میں معتدل علما اور روحانی صوفی رہنماؤں کی ایک تنظیم ہے، نے وہابی سلفی ازم کے انتہا پسند رجحانات کے خلاف آواز بلند کی۔ اس بورڈ نے اس انتہا پسندانہ نظریے کی سخت مذمت کی جسے سعودی عرب کی سرپرستی اور مالی معاونت حاصل ہے اور جو بتدریج ہندوستان میں اہل سنت کے تمام مکاتب فکر میں سرایت کر چکا ہے۔ بورڈ نے مدارس اور مساجد کو وہابی کتب سے تعلیم یافتہ علما، ان کے لٹرچر اور قرآن کی ان کی تعبیرات سے پاک کرنے کی وکالت کی۔ بورڈ کے ارکان کا کہنا تھا کہ روایتی طور پر ہندوستانی مسلمان روحانی و محبت پر مبنی اسلام سے متاثر رہے ہیں اور وہ وہابی نظریے کے پھیلائے گئے انتہا پسند خیالات کو کبھی قبول نہیں کریں گے۔ ان کا مزید کہنا تھا کہ صوفی سنی مسلمان ہمیشہ سے قوم پرست رہے ہیں اور اپنی مادر وطن سے وفاداری پر کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ افغانستان اور پاکستان کے بعد اب وہابیوں نے بھارتی مسلم نوجوانوں کو انتہا پسندی کی طرف راغب کرنے پر اپنی توجہ مرکوز کی ہے۔ اس نظریے کی نفوذ اس حد تک گہری اور وسیع ہو چکی ہے کہ یہاں تک کہ مالابار کے مپلا مسلمان اور کشمیر کے وہ مسلمان بھی، جو روایتی طور پر صوفی سنی اسلام کے پیروکار تھے، اب بڑی تعداد میں وہابیت کی طرف مائل ہو چکے ہیں۔

حالیہ برسوں میں دنیا کے مختلف حصوں میں وہابی سلفی ازم کے ماننے والوں نے صوفی ازم کو تشدد کا نشانہ بنایا ہے۔ ایک طرف جہاں ترقی پسند عالمی برادری وہابی نظریے کو انتہا پسندانہ اور تباہ کن سمجھ کر اس پر تنقید کر رہی ہے، وہیں دوسری جانب وہابی عناصر دنیا بھر میں صوفی، سنی اور دیگر معتدل اسلامی مسالک سے نفرت کے ساتھ پیش آرہے ہیں۔ ان کے عسکریت پسند گروہ مختلف

مقامات پر صوفی بزرگوں کے مزارات اور قبروں کو بھی منہدم کر رہے ہیں۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ صوفی ازم کا جواب تشدد سے دینا چاہیے اور وہ اہل سنت کے دائرے میں صوفی ازم کی مرکزی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتے۔ سعودی عرب کے اکثر مذہبی ادارے بھی اسی موقف کے حامل ہیں۔ یہی وہ سب سے بڑا چیلنج ہے جس کا سامنا ولی عہد محمد بن سلمان کر رہے ہیں جب وہ ’معتدل اسلام کی بحالی‘ کے اپنے وعدے کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

وہابی۔ سلفی، جنہیں جنوبی ایشیا میں اہل حدیث کے نام سے جانا جاتا ہے، صوفیوں کو اسلام کے لیے خطرہ تصور کرتے ہیں اور ان کے پیروکاروں کو بدعتی اور مرتد قرار دیتے ہیں۔ اسلامک اسٹیٹ (داعش) صوفیوں کو اس لیے نشانہ بناتی ہے کیونکہ اس کا عقیدہ ہے کہ صرف وہابی سنی اسلام کی بنیاد پرستی ہی درست اسلام ہے، اور صوفی ازم اس پاکیزہ اسلام سے انحراف ہے۔ ان کے نزدیک صوفی اور شیعہ دونوں گمراہ اور مرتد ہیں، جن کا خون بہانا جائز ہے تاکہ اسلام کو انحرافات سے پاک کیا جاسکے۔ یہی وہ مذہبی جواز ہے جس کی بنیاد پر تمام سنی انتہا پسند تنظیمیں، خواہ وہ داعش ہو، القاعدہ ہو یا پاکستان کی تحریک طالبان، فرقہ وارانہ قتل و غارت گری کا ارتکاب کرتی ہیں۔

صوفی مقامات اور ان کے عقیدت مندوں کو اسلامی دہشت گردی کے آغاز سے ہی جہادیوں کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔ فروری 2017 میں پاکستان میں عظیم صوفی بزرگ لال شہباز قلندر کے مزار پر بم دھماکہ ہوا، جس میں تقریباً 100 افراد جاں بحق اور متعدد زخمی ہوئے۔ 2016 میں داعش نے یوٹیوب پر صوفی اساتذہ کو قتل کیے جانے کی ویڈیوز نشر کیں۔ اسی سال، پاکستانی طالبان نے معروف صوفی گلوکار امجد صابری کو شہید کر دیا۔ 2010 میں لاہور شہر میں مشہور صوفی بزرگ حضرت داتا گنج بخش (علی بن عثمان ہجویری) کے مزار پر بم دھماکہ ہوا۔ وہ ابتدائی صوفی ہستیوں میں سے تھے جو ہندوستان آئے اور لاہور کو اپنا مسکن بنایا۔ دنیا بھر میں، خاص طور پر مراکش، ترکی اور جنوبی ایشیا کے کئی ممالک میں مسلمان اور غیر مسلم دونوں صوفی بزرگوں کی عزت کرتے ہیں اور ان کے مزارات پر حاضری دے کر عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسے صوفی سنی اسلام کی ہزار سالہ روایت کی نمائندگی کرتا ہے جو پر امن، روادار اور روحانیت پر مبنی

ہے اور جسے اب شدت پسند بنیاد پرستوں کی جانب سے براہ راست نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ بیشتر مسلمان صوفی روایات جیسے بزرگوں سے عقیدت، ان کے مزارات پر حاضری، اور صوفیانہ رسومات کا فخر سے دفاع کرتے ہیں، کیونکہ یہ ان کے لیے مذہب اور روحانیت کو سمجھنے کا بنیادی ذریعہ ہیں۔ صرف جنوبی ایشیا ہی نہیں بلکہ دنیا کے مختلف خطوں میں بھی یہ روایت قائم ہے۔ آج مصر کی تقریباً 15 فیصد آبادی کسی نہ کسی صوفی سلسلے سے وابستہ ہے یا صوفی روایت پر عمل کرتی ہے۔ صوفیوں کی مقبولیت اور ان کے مختلف مذاہب و مسلک کے لیے روادار رویے کو دیکھتے ہوئے اس بات پر حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ داعش جیسے انتہا پسند گروہ اسلامی تنوع اور کثرت کے ہر ماڈل کے سخت مخالف ہیں۔

سنہ 2003 میں اسلامی دہشت گردوں نے مراکش کے شہر کاسابلا نکا میں ایک مشہور ریٹورنٹ پر حملہ کیا، جہاں اس وقت بڑی تعداد میں فرانسیسی سیاح موجود تھے۔ یہ حملہ مراکش میں موجود وہابیوں کی جانب سے مغربی سیاحوں کو خوفزدہ کرنے اور مراکش کے بادشاہ کو ایک سخت پیغام دینے کی کوشش تھی کہ سلفی اور وہابی نظریہ اب مراکشی معاشرے میں جڑ پکڑ چکا ہے۔ وہابی رہنما چاہتے تھے کہ حکومت صوفی سنی اسلام کے روایتی طریقوں کی حمایت سے دستبردار ہو جائے، جسے وہ 'شرک' اور 'مشرک' نہ رویہ قرار دیتے ہیں۔ یہ مراکش کے بادشاہ کے لیے ایک براہ راست چیلنج تھا، کیونکہ وہاں کے مسلمان انہیں امیر المؤمنین کے طور پر عزت دیتے ہیں۔ اسلامی روحانیت یا تصوف کا علم آج بھی مسلم دنیا کی اعلیٰ ترین دینی درسگاہوں میں پڑھایا جاتا ہے، جن میں مصر کی جامعہ ازہر اور مراکش کی جامعہ قروین شامل ہیں جو اسلامی تعلیم کی سب سے قدیم دانش گاہوں میں شمار ہوتی ہیں۔

مغرب اور باقی اسلامی دنیا کے کئی علماء اس بات پر زور دیتے ہیں کہ صوفی اسلام اور اس کی عظیم اقدار کا فروغ وہابیت اور اس سے جڑے انتہا پسند رجحانات کے اثرات کو زائل کر سکتا ہے۔ آج مسلم معاشروں میں پیوست صوفی ازم کو دوبارہ زندہ کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ مراکش میں صوفی ازم پر حملے 1970 کی دہائی کے آخر اور 1980 کی دہائی میں تیز ہوئے، جب موجودہ

بادشاہ کے والد حسن دوم کے دورِ حکومت میں سعودی عرب سے وہابیت کے نفوذ کو روکنے کے لیے خاطر خواہ اقدامات نہیں کیے گئے۔ تاہم موجودہ بادشاہ، محمد ششم، نے مذہبی امور پر زیادہ مضبوط ضابطہ سازی کا اختیار حاصل کیا ہے۔ انہوں نے وہابیت سے متاثر خطیبوں کو مساجد سے نکالا، مذہبی نصاب سے صوفی ازم مخالف اسباق کو ہٹایا، ائمہ کی تربیتی اسکیموں میں اصلاحات کیں اور ملک بھر میں صوفی ازم کے فروغ کے لیے اقدامات کیے۔

متعدد دانشوروں کے مطابق، اسلام نے اپنے ابتدائی ادوار میں سائنس، تعلیم، فنون لطیفہ، ادب اور ثقافت کی ترقی میں مرکزی کردار ادا کیا۔ برطانوی مورخ برنارڈ لیوس نے اپنی کتاب What Went Wrong? (کیا غلط ہوا؟) میں اسلامی دنیا کے زوال کی وجہ یہ بتائی ہے کہ وہ ایسے قانونی، اقتصادی اور سیاسی ادارے تشکیل نہ دے سکی جو یورپ کے اداروں کا متبادل کر سکتے۔ یہ ادارے یورپ کی روشن خیالی (Enlightenment) کے دور کی پہچان بنے، جبکہ اسلامی دنیا اس دوران قرآن اور حدیث کی متنوع تفاسیر سے پیدا ہونے والے داخلی تضادات میں الجھی رہی۔

یہ بیسویں صدی کے وسط میں ہی ممکن ہوا کہ مسلم اکثریتی ممالک نے نوآبادیاتی تسلط سے آزادی حاصل کرنے کے بعد اپنی ساجیات کو از سر نو تشکیل دینے کی کوشش کی۔ اس عمل میں بیشتر مسلم ممالک نے اپنی داخلی فکری قوتوں کو دریافت کرنے کے بجائے نظریاتی طور پر سیکولر سیاسی نظاموں کو اپنانے کو ترجیح دی۔ ترکی میں کمال اتاترک کی اصلاحات، مصر میں قوم پرست رہنما جمال عبدالناصر کا پان عرب ازم، محمد رضا پہلوی کی ایران میں سیکولر حکومت، اور یہاں تک کہ ایران کا شیعہ اسلامی نظام، یہ سب ایسی ہی مثالیں ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی سیاسی نظام اسلامی معاشروں کی روحانی تکثیریت (spiritual pluralism) کو پوری طرح نہ سمجھ سکا اور نہ ہی اس کی قدر کر سکا۔ سنہ 2011 میں پورے عرب عالم میں انقلاب اور جوابی انقلابات کی مختلف صورتیں سامنے آئیں، اور القاعدہ، داعش اور ایک مختصر المدت ”اسلامی خلافت“ جیسے شدت پسند گروہوں کا ظہور ہوا، جنہوں نے اپنی طاقت وہابیت سے حاصل کی۔

استعمار سے پہلے کے دور میں، مسلم دنیا جو سعودی عرب سے اناطولیہ، اور ہندوستان سے انڈونیشیا تک پھیلی ہوئی تھی، اسلامی روایت کے مختلف فہم و ادراک کو قبول کرتی تھی۔ یہ وہ اسلام تھا جو چکچک اور غیر متشدد تعبیرات پر مبنی تھا، جس میں مختلف ثقافتی اور روحانی روایات اسلامی دھارے میں ضم ہو جاتی تھیں، جس سے اسلام ایک فطری اور باطنی افروز صورت اختیار کرتا تھا۔ صوفی ازم نے بیسویں صدی کے دوران اسی روحانی معنویت کی بقا اور قرآنی وحدتِ متون پر مبنی باطنی پہلوؤں کی حفاظت کے لیے اپنی جدوجہد کو جاری رکھا۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ صوفی ازم کا عروج ایسے وقت میں ہوا جب اسلامی معاشروں میں یونانی فلسفے اور سائنسی ترقیات کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا۔ یہ وہی دور تھا جب مسلم دنیا نے سائنس اور ادب میں غیر معمولی ترقی کی، اور متعدد صوفی اہل علم نے فلسفہ، طب، فلکیات اور فنون میں لاجواب تصنیفات پیش کیں۔

اسلام کے سنہری دور میں دین کے ظاہر و باطن دونوں جہات کو بیک وقت فروغ حاصل ہوا۔ ان دونوں پہلوؤں نے مل کر ایسی تہذیب کی بنیاد رکھی جس میں حکمرانی، قانون اور نظم اجتماعی کو اتنی ہی اہمیت دی گئی جتنی کہ فلسفہ، روحانیت اور ماورائیت کے باطنی اسرار کو۔ اس نے ایک ایسا متنوع معاشرہ تشکیل دیا جو تحقیق کا شوق رکھتا تھا اور اسلام کو مختلف زبانوں، ثقافتوں اور روایات کے ذریعے بیان کرنے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ بد قسمتی سے، وہ روایتی طریقے اور روحانی ورثہ، جو اسلام کے سنہری دور میں عام تھے اور جنہیں کھلے دل سے اپنایا گیا تھا، آج کی مسلم دنیا میں تقریباً ناپید ہو چکے ہیں، یا کم از کم انہیں شدید خطرات لاحق ہیں۔ یہ زوال بنیادی طور پر بیسویں صدی کے آغاز پر مختلف مسلم ممالک میں نافذ کی گئی آمرانہ اصلاحات اور سخت گیر سیاسی نظاموں کا نتیجہ ہے، جنہوں نے اسلامی معاشروں میں روحانیت، تنوع اور فکری آزادی کو محدود کر دیا۔

تصوف پر بیسویں صدی میں دنیا بھر میں سعودی تعلیم یافتہ علما کی جانب سے بڑھتے ہوئے شدید حملے کیے گئے۔ ان حملوں میں بنیاد پرست قوتوں نے کئی دیگر جدید رجحانات کے ساتھ اشتراک کر لیا۔ ان میں سب سے اہم مغرب سے متاثر قوم پرستانہ فلسفہ تھا، جو تصوف کو حقارت کی

نظر سے دیکھتا تھا۔ جنوبی ایشیا قبل از جدید دور میں تصوف اور اس سے وابستہ نظریات کے فروغ کا مرکز رہا ہے۔ اور یہی خطہ بعد ازاں جدید دور میں بنیادی اسلام کے ان اصلاحی نظریات کی آماجگاہ بھی بن گیا، جو تصوف کے مخالف تھے۔

دیگر خطوں کی مسلم آبادیوں کے برعکس، برصغیر ہند میں مسلمان ہمیشہ ایک اقلیتی طبقہ رہے، جو ایک بڑی ہندو آبادی کے درمیان زندگی بسر کرتے تھے۔ یہاں تک کہ سولہویں اور سترہویں صدیوں میں، جب ہندوستان میں مسلم حکمرانی اپنے عروج پر تھی، مغلوں کی سیاسی ثقافت مذہبی رواداری اور بقائے باہمی پر مبنی تھی۔ صرف چند ایک، جیسے کہ آخری بڑے مغل شہنشاہ اورنگزیب (1657-1707)، نے اس رجحان کو جزوی طور پر بدلتے کی کوشش کی اور ہندوؤں کے ساتھ کچھ امتیازی سلوک اختیار کیا۔ یہ طرز عمل بھی سلفی اثرات سے جوڑا جاتا ہے، کیونکہ اورنگزیب کا استاد سعودی عرب کے نجد علاقے سے تھا، اور غالباً وہ ابن تیمیہ جو سلفیت کا ابتدائی نظریہ ساز تھا کی تحریروں سے متاثر تھا۔

بیسویں اور اکیسویں صدی میں، صوفی مخالف اصلاحی تحریکوں نے صوفی سلسلوں کو، اور عمومی طور پر صوفیانہ عبادات و تقہیمات کو، دفاعی اور معذرت خواہانہ پوزیشن میں لاکھڑا کیا ہے۔ اس کے باوجود، مراکش اور ازبکستان جیسے کئی مسلم اکثریتی خود مختار ممالک تصوف کو وہابیوں اور سعودی پشت پناہی سے چلنے والی ان بنیاد پرست اسلامی تنظیموں کے خلاف ایک مؤثر توازن کے طور پر استعمال کر رہے ہیں جو پوری دنیا کے مسلمانوں کو ایک خلافت کے تحت متحد کرنے کی مہم چلاتی ہیں۔ ازبکستان کے شہر بخارا میں چودھویں صدی میں عظیم صوفی حضرت بہاء الدین نقشبند پیدا ہوئے تھے۔ نقشبندیہ سلسلے کے پیروکار دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بخارا شہر کے سب سے بڑے مدرسے، مدرسہ میر عرب، نے ملک میں تصوف کے فروغ کے لیے حکومتی پالیسی کی بھرپور حمایت کی ہے، تاکہ سعودی عرب کی پشت پناہی سے پھیلائے جانے والے وہابی سلفی ازم کا مؤثر طور پر مقابلہ کیا جاسکے۔

وہابی سلفیت کے انتہا پسند نظریات کا کس طرح جواب دیا جائے، اس حوالے سے حباری

مباحثوں میں اسلامی تہذیب کے 'سنہری دور' میں پیدا ہونے والے صوفی فلسفے، فن، موسیقی اور ادب کے وسیع اور گہرے ذخیرے پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ مصر کے مفتی اعظم نے قرآن کی ان انتہا پسندانہ تفسیروں کو رد کر دیا ہے، کیونکہ وہ 'سچے' اسلام کی نمائندگی نہیں کرتیں۔ تصوف کی تاثیر اس کی اس صلاحیت میں ہے کہ یہ دنیا کو یاد دلاتا ہے کہ اسلامی مقدس متون کے صرف ظاہری مفاہیم ہی نہیں ہوتے بلکہ ان کے اندرونی اور وسیع تر معانی بھی ہیں، جنہیں گزشتہ 1400 سالوں سے دنیا کے مختلف ملکوں اور ثقافتوں میں جیا اور محسوس کیا گیا ہے۔

بین الاقوامی سطح پر مسلمانوں کا تجربہ، ایک باہم مربوط، ٹیکنالوجی سے طاقت یافتہ اور عالمی دنیا میں 'تباہ کن اور سفاک' رہا ہے۔ وہابی۔ سلفی نظریہ، جو عدم برداشت پر مبنی اسلام کی ایک انتہا پسند شکل ہے، سعودی عرب کی جانب سے اربوں ڈالر کی پشت پناہی کے ساتھ فروغ دیا گیا اور دنیا بھر میں برآمد کیا گیا، اس نے مسلم برادریوں کو عالمی سطح پر تباہی، تنہائی اور تنزل سے دوچار کر دیا ہے۔ اس تناظر میں، دنیا بھر کے مسلمانوں کو اپنی ان روایات کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور انہیں دوبارہ زندہ کرنا ہوگا، جنہوں نے ان کی عظیم تہذیب کو صدیوں تک انتہا پسندی سے محفوظ رکھا۔ اسلام کی باطنی اور روحانی روایت 'یعنی تصوف' وہ کھویا ہوا ورثہ ہے، جس کی بازیافت آج کی سب سے اہم ضرورت ہے تاکہ دنیا بھر میں امن قائم ہو سکے۔

خلاصہ کلام

1979 میں آیت اللہ خمینی کی قیادت میں برپا ہونے والا ایرانی اسلامی انقلاب پورے مشرق وسطیٰ اور اس سے آگے تک گونج اٹھا۔ انقلابی اثرات سے سب سے زیادہ فکر مند جو ممالک تھے، ان میں سعودی عرب نمایاں تھا، جسے یہ محسوس ہوا کہ اس کا سابق اتحادی اب اچانک ایک انقلابی شیعہ حکومت میں بدل چکا ہے۔ سعودی شاہی خاندان کو اندیشہ تھا کہ ایران کا انقلابی پیغام پورے جزیرہ نمائے عرب میں اسلامی بغاوت کو جنم دے سکتا ہے۔ یہ اندیشہ اس وقت ایک بھیانک حقیقت بن گیا جب اُسی سال 20 نومبر کو، جُہیمان العتیبی کی قیادت میں سنی اسلام پسند باغیوں کے ایک گروہ نے خانہ کعبہ پر قبضہ کر لیا جو مملکت میں آل سعود کی حکمرانی کے لیے براہ راست چیلنج تھا۔ یہ باغی گروہ آل سعود کو اقتدار سے ہٹانے اور سعودی عرب میں مکمل شریعت نافذ کرنے کے لیے سرگرم تھا۔ جُہیمان نے میڈیا کو بتایا کہ آل سعود کا خاندان بدعنوان ہے اور مغرب کے زیر اثر کام کر رہا ہے۔ اس گروہ نے سعودی علماء پر بھی شدید تنقید کی کہ انہوں نے اسلام سے غداری کی ہے اور حکمران خاندان سے سمجھوتہ کر کے دین کا سودا کیا ہے۔

مسجد الحرام پر قبضے کی قیادت ایک گروہ نے کی تھی یہ کوئی عوامی تحریک نہیں تھی جیسا کہ ایران میں شاہ ایران کے خلاف دیکھی گئی تھی۔ عوامی بنیادوں پر انتہا پسندی کے مزید پھیلاؤ سے بچنے

کے لیے سعودی شاہی خاندان نے جلدی باغیوں سے بات چیت پر آمادگی ظاہر کی اور انہیں مذاکرات کی میز پر لے آیا۔ بالآخر ایک حل نکالا گیا اور یہ فیصلہ ہوا کہ ملک کے اندرونی اسلام کے سخت اطلاق کو یقینی بنایا جائے گا، اور بیرون ملک اس کی بھرپور تبلیغ کی جائے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ مذہبی مدارس کے دائرے کو وسعت دینے اور شہری معاشرے پر شریعت کا سخت نفاذ کرنے کے لیے ایک خصوصی مذہبی پولیس فورس قائم کرنے پر بھی اتفاق ہوا۔ 1970 کی دہائی کے اوائل میں آنے والے تیل کے معاشی عروج نے مملکت کو عربوں ڈالر کی مالی قوت فراہم کی، جسے ”مسلم ورلڈ لیگ“ جیسے خیراتی اداروں کے ذریعے دنیا بھر کی مسلم برادریوں میں سرمایہ کاری اور وہابیت کے فروغ کے لیے استعمال کیا گیا۔

مسلم ورلڈ لیگ نے اسلامی تنظیموں کی معاونت اور وہابیت کے فروغ کے لیے سرمایہ کاری کے منصوبے ترتیب دینے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ، سعودی وزارت امور مذہبیہ نے دنیا بھر کی مساجد میں لاکھوں کی تعداد میں قرآن مجید کے نسخے اور دیگر وہابی۔ سلفی عفت اند پر مبنی متون بلا معاوضہ تقسیم کرنے کے اقدامات کیے۔ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں پہلی بار ایک منظم کوشش کی گئی کہ دین اسلام کو ایک مخصوص علما کی تعبیر کی بنیاد پر یکساں شکل میں دنیا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھیلا یا جائے۔ سلفی نظریہ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں مشرق وسطیٰ کی مسلم سوسائٹیوں میں اس وقت مقبول ہونے لگا جب مسلم علاقوں پر مغربی طاقتوں نے نوآبادیاتی تسلط قائم کرنا شروع کیا۔ سلفی اصلاح پسندوں نے اس نوآبادیاتی یلغار کا الزام خود مسلمانوں پر عائد کیا، یہ کہتے ہوئے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں سے انحراف کر چکے ہیں، جس کی سزا انہیں مغربی غلامی کی صورت میں ملی ہے۔ ان اصلاح پسندوں کا مؤقف تھا کہ اس صورت حال سے نکلنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ اسلام کی قدیم ترین اور خالص ترین شکل کی طرف رجوع کیا جائے۔

سلفیت کا مقصد اسلام کو مغربی اثرات اور ان تمام شکلوں سے پاک کرنا رہا ہے جنہیں وہ ’انحرافات‘ سمجھتے ہیں، جیسے کہ تشیع، تصوف، اور یہاں تک کہ غیر سلفی سنی اسلام بھی۔ سلفی منکر کا

بنیادی ذخیرہ ابن تیمیہ اور ان کے شاگردوں کی تحریروں پر مبنی ہے۔ ان تحریروں میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اسلامی عقائد کو قرآن اور سنت کے دائرے میں رہتے ہوئے ان کی خالص ترین شکل میں بحال کیا جائے۔ سلفیت نے شرک کے خاتمے اور توحید کے اثبات کو اپنا مرکز مقصد بنایا۔ سلفی خود کو اسلام کے سچے پیروکار قرار دیتے ہیں۔ جو لوگ اولیاء کے مزارات پر نماز یا دعا کرتے ہیں، سلفیوں کے نزدیک وہ مرتد شمار ہوتے ہیں۔ سلفی نظریہ خواتین کو چار دیواری میں محدود رکھنے اور انہیں جدید رسمی تعلیم سے محروم رکھنے کو ترجیح دیتا ہے۔

مسلم دنیا میں جب شہروں کی ترقی تیزی سے ہونے لگی، تو سب سے نمایاں تبدیلی جو دیکھی گئی وہ یہ تھی کہ بڑی تعداد میں نئی مساجد بننے لگیں۔ سعودی علماء، جنہوں نے 1980 اور 1990 کی دہائیوں میں دنیا بھر میں وہابی سلفی نظریات کو زور و شور سے پھیلا یا، انہوں نے ایران کے رہنما خمینی کے اسلام کے انداز کا بھی مذاق اڑایا تا کہ یہ دکھاسکیں کہ ان کا نظریہ اس سے مختلف ہے۔ اس حکمت عملی کا پوری مسلم دنیا پر بہت گہرا اثر پڑا، اور اسی کے نتیجے میں دنیا بھر میں سخت گیر سنی نظریات تیزی سے پھیلنے لگے۔

جہادیوں کی امریکی حمایت

دسمبر 1979 میں افغانستان پر سوویت یونین کے حملے کے بعد امریکی صدر رونالڈ ریگن کی حکومت نے روس کی 'شیطانی سلطنت' کا مقابلہ کرنے کے لیے افغانستان میں اسلامی جنگجوؤں (مجاہدین) کی مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ اسرائیل کے اسٹریٹجک مشورے پر امریکہ نے یہ بھی محسوس کیا کہ سوویت یونین کو روکنے اور شیعہ ایران کے اثر و رسوخ کو محدود کرنے کے لیے سعودی عرب کے مذہبی نظریات کو استعمال کیا جاسکتا ہے۔ چونکہ امریکہ نے اسامہ بن لادن کی قیادت میں افغان مجاہدین کو مالی اور عسکری مدد فراہم کی، اس عجیب حکمت عملی کے نتیجے میں امریکہ خود بھی عالمی جہاد کے پھیلاؤ میں شریک ہو گیا۔ سی آئی اے نے ان باغی گروہوں کو سوویت یونین، جو اس وقت اس کا سب سے بڑا نظریاتی اور عسکری دشمن تھا، کے خلاف پراکسی وار کے لیے استعمال کیا۔ ریگن حکومت کی قومی سلامتی ٹیم نے سی آئی اے کو ہدایت دی کہ وہ اپنے قریبی اتحادیوں 'سعودی

عرب اور پاکستان کو اس مشن میں شامل کرے۔ اس وقت امریکہ میں تعینات سعودی سفیر شہزادہ بندر بن سلطان کی مدد سے سعودی عرب نے افغان مجاہدین کو مکمل مالی مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعودی عرب، امریکہ اور پاکستان نے اپنی انٹیلیجنس ایجنسیوں کے ذریعے پاکستان میں جہادی تربیتی مراکز قائم کیے، اور ان مراکز کو مشیروں، ہتھیاروں اور نقدی کے ذریعے سوویت افواج سے لڑنے کے لیے مدد فراہم کی۔

صحافی اسٹیو کول کے مطابق، امریکی اسٹریٹجسٹ یہ چاہتے تھے کہ جدید فوجی ٹیکنالوجی افغانستان میں داخل کی جائے اور دھماکہ خیز مواد اور تخریب کاری کی تکنیکوں کی تربیت کو تیز کیا جائے تاکہ سوویت فوجی تنصیبات پر ہدفی حملے کیے جاسکیں۔ امریکی ادارہ برائے بین الاقوامی ترقی (USAID) نے لاکھوں ڈالر خرچ کر کے سعودی عرب کے وہابی علما کی تحریک شدت پسند اسلامی تعلیمات پر مبنی نصابی کتابیں فراہم کیں تاکہ اس مہم کو تقویت دی جاسکے۔ ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ امریکی صدر رونالڈ ریگن نے گلبدین حکمت یار جیسے جہادیوں کی بھی تعریف کی، جنہوں نے انتہا پسند تنظیم حزب اسلامی کی بنیاد رکھی تھی۔ القاعدہ کے بانی اسامہ بن لادن کی بھی امریکی میڈیا نے اس وقت تعریف کی جب وہ سوویت افواج سے برسرِ پیکار تھا۔ وہ سعودی انٹیلیجنس کے سربراہ شہزادہ ترکی الفیصل کے قریب بھی تھا۔ حیرت انگیز طور پر سی آئی اے نے ان جہادیوں کی انتہا پسندی اور مغرب مخالف جذبات کو نظر انداز کیے رکھا۔

امریکی انٹیلیجنس نے سوویت یونین کو شکست دینے کے اپنے قلیل مدتی ہدف کے حصول کے لیے وہابی نظریات سے متاثر شدت پسندوں کی مذہبی جنونیت کو فروغ دیا۔ اس عمل کے دوران، انہوں نے نادانستہ طور پر ایک ایسے عفریت کو جنم دیا جس کی ہلاکت خیزی اور تباہ کن قوت ایک دن انہی کو نقصان پہنچائے گی، اس کا انہیں اندازہ نہ تھا۔

جہادی شدت پسندوں کی مدد سے امریکہ نے سوویت یونین کو مکمل طور پر شکست دی اور اسے افغانستان سے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ لیکن وہ اس بات کا ادراک نہ کر سکے کہ القاعدہ جیسی انتہا پسند تنظیموں کو جائز حیثیت دینا کس قدر بھیانک نتائج کا باعث بنے گا، اور اس عمل کے نتیجے میں

ایک پوری نسل کے مسلمانوں کو شدت پسندی کی طرف دھکیل دیا گیا۔ غیر جانب دار امریکی اسٹریٹیجک ماہروں نے ریگن انتظامیہ کو خبردار کیا تھا کہ وہ وہابی۔ سلفی اسلام کی حمایت نہ کرے، کیونکہ یہ نظریہ غیر مسلموں اور مغربی اقدار کے خلاف نفرت اور تشدد کی تعلیم دیتا ہے۔ سعودی عرب کے وہابی اسلام کی حمایت کر کے امریکہ نے نہ صرف اپنی قومی سلامتی پر سمجھوتہ کیا بلکہ عالمی سطح پر مسلم برادری کے مستقبل کو بھی شدید نقصان پہنچایا۔ 1979 میں مسجد الحرام پر قبضے کے واقعے کے بعد سعودی حکومت نے وہابی علما کو دنیا بھر میں وہابیت کے فروغ کا کھلا اختیار دے دیا، جسے بعد کی تمام امریکی حکومتوں کی حمایت بھی حاصل رہی۔

1989 میں سوویت افواج کے افغانستان سے انخلا کے بعد، امریکہ نے بڑی آسانی سے اس ملک کو تنہا چھوڑ دیا، ایک ایسی ریاست جو ناکامی کے دہانے پر کھڑی تھی، اور ایک ایبائیٹ ورک پیچھے رہ گیا تھا جس میں مغربی تعلیمی اداروں سے تعلیم یافتہ نوجوان شامل تھے، جو مکمل طور پر جہادی نظریات سے متاثر تھے اور اسامہ بن لادن کی قیادت میں مغربی جمہوری ریاستوں کو لہو لہان کرنے کے لیے اپنی جانیں قربان کرنے کو تیار تھے۔ کئی دہائیوں بعد، سینیٹر ہیلری کلنٹن نے اس ساری صورتِ حال کو نہایت سادہ اور واضح الفاظ میں بیان کیا:

”آج جن لوگوں سے ہم لڑ رہے ہیں، ہم نے ہی انہیں برسوں پہلے فنڈ کیا، تربیت دی۔..... یہ صدر ریگن تھے، جنہوں نے کانگریس (جس کی قیادت اس وقت ڈیموکریٹس کے پاس تھی) کے ساتھ مل کر کہا: ”دیکھو، یہ تو ایک اچھا خیال لگتا ہے..... چلو ان مجاہدین کو بھرتی کرتے ہیں، سعودی عرب اور دیگر عرب ممالک سے کچھ لوگوں کو لاتے ہیں، ان کے وہابی اسلام کے نظریے کو بھی درآمد کرتے ہیں، تاکہ ہم سوویت یونین کو شکست دے سکیں۔“ وہ پیچھے ہٹے، اور ہم نے جلد ہی پیٹھ موڑ لی، اور پاکستان سے کہا کہ اب یہ اسٹنگر میزائل اور جہادی نوجوان مسلمانوں سے خود نمٹو۔ آج ہم وہی کاٹ رہے ہیں جو ہم نے بویا تھا۔“

عراق پر امریکی حملہ

2003 میں عراق پر امریکی حملہ مشرق وسطیٰ میں امریکہ اور مغربی جمہوریتوں کے خلاف غصے کے بھڑکنے کا ایک اہم موڑ تھا۔ القاعدہ سے متاثر ایک گروہ، جس کی قیادت ابو مصعب الزرقاوی کر رہا تھا، نے امریکی قابض افواج کے خلاف جنگ لڑی۔ صدر جارج ڈبلیو بوش کی قیادت میں امریکی انتظامیہ نے ایک بار پھر غلطی کی اس بار وہ خطے کی فرقہ وارانہ خلیج سے بے خبر رہی اور ایسا فیصلہ کیا جس کے نتیجے میں تاریخ میں پہلی بار عراق جیسے بڑے عرب ملک میں شیعہ اکثریت کو حکمرانی کا موقع مل گیا۔

ابو مصعب الزرقاوی وہابی، سلفی اسلام کا ایک پیروکار تھا، جو شیعہ اسلام کے ماننے والوں کو مرتد سمجھتا ہے۔ وہ اس بات سے شدید ناالا تھا کہ عراق کی سیاسی قیادت شیعوں کے ہاتھ میں چلی گئی ہے۔ عراق کے سنی مسلمانوں نے خود کو بے حد ذلیل محسوس کیا، کیونکہ ایک دن اچانک نئی امریکی حمایت یافتہ حکومت کے تحت انہیں سرکاری نوکریوں، فوجی عہدوں اور ریاستی اختیارات سے نکال دیا گیا اور وہ دوسرے درجے کے شہری بن کر رہ گئے۔ جیسا کہ نیلن منڈیلا نے کہا تھا: ”اس سے زیادہ خطرناک کوئی نہیں ہوتا جو ذلت کا شکار ہو چکا ہو۔“ زرقاوی نے سنی مسلمانوں کی اس ذلت کو اپنے بیانیے کا مرکز بنایا اور نہ صرف امریکی افواج بلکہ عراق میں شیعہ مقدس مقامات پر دہشت گردانہ حملے تیز کر دیے۔ اس نے صدام حسین کے دور کے سابق فوجی افسران کو اکٹھا کیا اور انہیں داعش (ISIS) میں شامل ہونے کے لیے منظم و متحرک کیا۔ اگرچہ 2006 میں وہ امریکی فضائی حملے میں مارا گیا، لیکن خلافت کے قیام کا اس کا تصور آگے بڑھتا رہا۔ اس کا مرکز جانشین ابو بکر البغدادی تھا، جس نے 2014 میں عراق اور شام کے وسیع علاقوں میں داعش کی ”خلافت“ کا اعلان کر دیا۔

بشار الاسد کے خلاف بغاوت 2011 میں عرب بہار (Arab Spring) کے حصے کے طور پر شروع ہوئی۔ اُس وقت کی امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن، سی آئی اے کے ڈائریکٹر ڈیوڈ پیٹر یاس اور دیگر کئی اعلیٰ حکام نے شامی باغیوں کو تربیت دینے اور اسلحہ فراہم کرنے کے ساتھ

ساتھ شہریوں کی حفاظت کے لیے شام میں نو فلائی زون قائم کرنے کی تجویز دی۔ تاہم صدر او باما نے اس تجویز کو مسترد کر دیا اور صرف کیمیائی ہتھیاروں کے استعمال پر ریڈ لائن مقرر کرنے کی بات کی لیکن وہ بھی نافذ نہ کر سکے۔ بعد میں انہوں نے صدر پیوٹن کی اس پیشکش کو تسلیم کر لیا کہ شام کے کیمیائی ہتھیار محفوظ طور پر روس منتقل کر دیے جائیں۔ امریکہ کی طرف سے روس کی اس تجویز کو قبول کرنا ایک اسٹریٹیجک غلطی ثابت ہوا۔

صدر او باما پر اور بجا طور پر اس الزام کی ذمہ داری عائد کی گئی کہ ان کے فیصلوں کے باعث شام میں دس لاکھ سے زائد افراد مارے گئے اور شہریوں کی ایک بڑی تعداد کو ملک چھوڑنا پڑا۔ تمام کیمیائی ہتھیار روس منتقل نہیں کیے گئے؛ ان میں سے ایک بڑی مقدار شام میں ہی رہ گئی، جسے بعد میں بشار الاسد نے عام شہریوں کے خلاف استعمال کیا۔ داعش کا ابتدائی مرحلے میں فوجی طور پر مقابلہ کرنے میں صدر او باما کی سستی بھی واضح تھی، جس کی وجہ سے اس دہشت گرد تنظیم کو پنپنے کا موقع ملا۔ غالباً صدر او باما حد سے زیادہ محتاط ہو چکے تھے، کیونکہ وہ وائٹ ہاؤس میں اُس وقت داخل ہوئے جب ان کے پیش رو صدر بش عراق میں مہم جوئی کر چکے تھے اور او باما نے اپنی فہم و فراست کے مطابق ایک اور مشرق وسطیٰ کے دلدل سے خود کو بچانے کی راہ اختیار کی۔

امریکی پالیسیوں کی خامیاں

اگست 2014 میں ایک میڈیا بریفنگ کے دوران صدر او باما نے یہ تبصرہ کیا کہ امریکہ کے پاس ابھی تک شام میں داعش کے جنگجوؤں سے نمٹنے کے لیے کوئی حکمت عملی موجود نہیں ہے۔ یہ بات کوئی راز نہیں تھی کہ داعش کا خطرہ کافی عرصے سے بڑھ رہا تھا اور اس کی طاقت میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ صدر او باما کو داعش کے پھیلنے ہوئے خطرے سے نمٹنے میں ناکامی پر سخت تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ شام اور عراق میں داعش کے قدم جننے کے باوجود، آخر کار 2015 میں انہوں نے کردوں کی داعش کے خلاف جنگ میں مدد کے لیے فضائی طاقت اور فوجی مشیروں کی فراہمی کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ دراصل ایک ”گیم چینجر“ ثابت ہوا، امریکہ نے بغیر زمینی فوج اتارے داعش کی نام نہاد خلافت کو تباہ کر دیا۔

2016 میں صدر ٹرمپ نے اوباما انتظامیہ سے وہ پالیسیاں ورٹے میں حاصل کیں جو شام اور عراق دونوں میں داعش کے جغرافیائی دائرہ کو محدود کرنے اور اس کی عسکری صلاحیت کو کمزور کرنے میں مؤثر ثابت ہو رہی تھیں۔ سیرین ڈیموکریٹک فورسز (SDF) جو کرد اور عرب جنگجوؤں کا ایک اتحاد تھا جسے امریکی فضائی مدد حاصل تھی نے بظاہر ناممکن کو ممکن کر دکھایا اور داعش کی خلافت کو شکست دی۔ ایک وقت میں داعش تقریباً ایک کروڑ لوگوں پر حکمرانی کر رہی تھی، جن میں موصل اور رقبہ جیسے اہم شہر شامل تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ SDF نے امریکی فضائی مدد کے ساتھ تقریباً 95 فیصد علاقہ دوبارہ حاصل کر لیا اور ہزاروں عرب وغیرہ ملکی جنگجوؤں کو قیدی بنایا۔ دریائے فرات کی وادی میں واقع تمام شہر اور قصبے SDF کے قبضے میں آ گئے، سوائے کچھ چھوٹے علاقوں کے جہاں اب بھی داعش کے جنگجو موجود تھے۔ صدر ٹرمپ نے 20 مارچ 2018 کو ایک شیخی بھری ٹویٹ میں کہا: ”ہم نے بہت ہی کم وقت میں وہ تقریباً 100 فیصد علاقہ واپس لے لیا ہے جو داعش نے قبضے میں لے رکھا تھا۔ اور یہ سب میرے انتخاب کے بعد ممکن ہوا۔“

تاہم ریپبلکن سینیٹرز نے گراہم نے شام سے امریکی فوجوں کے انخلا کے صدر ٹرمپ کے فیصلے کی شدید مذمت کی اور اسے ایک جلد بازی میں کیا گیا، محدود سوچ والا اور غیر ذمہ دارانہ فیصلہ قرار دیا۔ کرد جنگجو سخت ناراض ہوئے کیونکہ جس وقت وہ داعش کے خلاف جنگ میں مصروف تھے، امریکی افواج نے اچانک اپنی پوزیشنیں خالی کر دیں جبکہ ترک فوجی حملہ کرنے کی تیاری میں تھی۔ امریکی افواج کے انخلا سے جو خلا پیدا ہوا، اسے روس، ایران اور بشار الاسد کی حکومت نے پُر کیا۔ ترک صدر رجب طیب اردوان پہلے سے ہی شام میں موجود کرد فوجوں کو دہشت گرد تصور کرتے تھے، کیونکہ ان کا تعلق ترکی کے اندر سرگرم کرد باغیوں سے جوڑا جاتا تھا۔ وہ طویل عرصے سے شمالی شام میں فوجی کارروائی کی دھمکیاں دیتے آئے تھے، جہاں کردوں کا غلبہ تھا۔ صدر ٹرمپ ترک صدر کی دھمکیوں پر کبھی ایک موقف اپناتے اور کبھی دوسرا وہ مسلسل متذبذب اور غیر یقینی رویہ اپناتے رہے، یہاں تک کہ ان کرد جنگجوؤں کو تنہا چھوڑ دیا جنہوں نے داعش کے خلاف

امریکہ کے ساتھ مل کر جنگ لڑی تھی۔

صدر ٹرمپ کا ارادہ تھا کہ وہ 2018 میں شام سے امریکی فوجوں کو مکمل طور پر واپس بلا لیں، لیکن جب ان کے سیکیورٹی مشیروں نے زور دیا کہ خطے میں امن قائم رکھنے کے لیے امریکی موجودگی نہایت ضروری ہے، تو انہوں نے ایک محدود تعداد میں فوج رکھنے پر رضامندی ظاہر کی۔ سیرین ڈیموکریٹک فورسز (SDF) نے خبردار کیا کہ ترکی کی مجوزہ فوجی چڑھائی داعش کے خلاف جنگ پر بہت منفی اثر ڈالے گی اور اب تک کی تمام کامیابیاں ضائع ہو جائیں گی۔ امریکی وزیر دفاع جم میٹس اور قومی سلامتی کی ٹیم کے دیگر سینئر ارکان ٹرمپ کے فیصلے پر ناراض اور مایوس تھے۔ انہوں نے کہا کہ کردوں کو تنہا چھوڑ دینا اور داعش کو دوبارہ ابھرنے کا موقع دینا، امریکہ کی عزت پر ایک بدنما داغ ہوگا۔

صدر ٹرمپ کی انتظامیہ کے سینئر اراکین، بشمول ان کے قومی سلامتی کے مشیر جان بولٹن، اس بات کو تسلیم کر چکے ہیں کہ داعش کا خطرہ بدستور موجود رہے گا۔ یہی وجہ تھی کہ صدر اور ان کی قومی سلامتی ٹیم کے موقف میں تضاد پایا جاتا رہا۔ امریکی فوج نے صدر ٹرمپ کی مکمل انخلا کی ہدایت کو نظر انداز کرتے ہوئے شام میں تقریباً 1000 فوجیوں کو رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت شام کے لیے امریکہ کے خصوصی نمائندے جم جیفری کے مطابق عراق اور شام میں داعش کے تقریباً 15000 سے 20000 خفیہ سیل (sleeper cells) سرگرم تھے، جو مشرقی شام میں رات کے وقت چیک پوسٹوں پر نمودار ہوتے تھے۔

اگرچہ امریکی فوج نے افغانستان، عراق اور شام میں دہشت گرد گروہوں کو موثر انداز میں کمزور کر دیا، لیکن ہمیشہ آخری مرحلے میں اس کی پالیسی ناکام رہی جہاں جنگی کامیابیوں کو واضح اور با مقصد فتح میں بدلنے میں کوتاہی ہوئی۔ SDF اس وقت شام میں ان کیمپوں کا انتظام سنبھالے ہوئے ہے جہاں سابق جہادی جنگجو، ان کی بیویاں اور بچے رکھے گئے ہیں، جنہیں داعش کے زیر قبضہ علاقوں سے نکالا گیا تھا۔ ان کی تعداد دسیوں ہزار میں ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مغربی ممالک سے ایک خیالی خلافت کا حصہ بننے کے لیے یہاں آئے تھے اور اب ریاست سے محروم ہیں۔

2011 میں جب امریکی افواج نے عراق سے انخلا کیا اور بشار الاسد نے ایران اور حزب اللہ کی خفیہ مالی و عسکری مدد کے ذریعے شام میں اپنی حکومت بچالی، تو ایران کا علاقائی اثر و رسوخ بے پناہ بڑھ گیا۔ ایران اور حزب اللہ نے یمن میں زیدی حوثیوں کی بھی سعودی قیادت میں لڑنے والی افواج کے خلاف مدد کی۔ یہ کوئی راز کی بات نہیں کہ ایران مشرق وسطیٰ میں ایک طاقتور علاقائی قوت کے طور پر ابھرا ہے۔ اسرائیل کے لیے یہ خدشات بالکل جائز ہیں کہ ایران کا اثر و رسوخ اس کے آس پاس کے علاقوں، خاص طور پر لبنان میں، تیزی سے پھیل رہا ہے۔

صدر ٹرمپ نے ایران کے جوہری معاہدے (JCPOA) سے اس لیے دستبرداری اختیار کی تاکہ وہ اپنے دوست نیتن یاہو کو خوش کر سکیں چاہے اس کے بدلے میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے پانچ مستقل اراکین کو ناراض ہی کیوں نہ کرنا پڑا۔ ان کا دوسرا ذاتی مقصد یہ تھا کہ آئندہ صدارتی انتخابات میں انہیں یہودی لابی کی حمایت حاصل ہو۔ امریکہ کی سخت پابندیوں نے ایران کی معیشت کو شدید نقصان پہنچایا، لیکن اس کے باوجود ایران نے چین اور کچھ جنوبی امریکی ممالک کے ساتھ تجارت کا راستہ نکال لیا۔ صدر ٹرمپ نے خلیجی ممالک، جیسے متحدہ عرب امارات (یو اے ای) اور بحرین، کو اسرائیل سے سفارتی تعلقات قائم کرنے پر آمادہ کیا حالانکہ امریکہ نے اپنے سفارت خانے کو متنازع شہر یروشلم منتقل کر کے واضح طور پر اسرائیل کی طرف داری کا مظاہرہ کیا تھا۔ یو اے ای کو امید تھی کہ اسرائیل سے تعلقات قائم کر کے وہ اسے فلسطینی تنظیم PLO کے ساتھ سنجیدہ امن مذاکرات پر آمادہ کر سکے گا۔ یہ اسرائیل کے لیے ایک ”ون-ون“ صورت حال تھی: اس سے ایک طرف اس کی خطے میں تنہائی ختم ہوئی، اور دوسری طرف اسے اسلحہ اور ٹیکنالوجی کی فروخت کے ذریعے اقتصادی اور تجارتی فوائد حاصل ہونے لگے۔ خلیجی ممالک اس وقت کئی طرح کے خطرات سے دوچار ہیں، تیل کی قیمتوں میں شدید کمی، عوامی بغاوتوں کا خوف، اور امریکہ کی حمایت سے محرومی کا اندیشہ۔ آخر کار تجربہ یہی ہے کہ مشرق وسطیٰ پر اسرائیل کا اثر و رسوخ مضبوط ہو چکا ہے، اور عرب جی سی سی (GCC) ممالک اب اس کے زیر اثر آچکے ہیں۔

ٹرمپ انتظامیہ کے اہلکاروں کے مطابق، اسرائیل، متحدہ عرب امارات (یو اے ای) اور

بحرین کے درمیان دشمنی میں کمی، اور مستقبل میں عمان اور سعودی عرب جیسے دیگر عرب ممالک کے ساتھ اسرائیل کے ممکنہ معاہدے، دراصل ایران کا مقابلہ کرنے کی ایک وسیع تر حکمت عملی کا حصہ ہیں۔ تاہم احتیاط کے طور پر، یو اے ای اور بحرین نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اپنے سفارت خانے یروشلم میں نہیں بلکہ تل ابیب میں قائم کریں گے۔

ایران نے متحدہ عرب امارات - اسرائیل اور بحرین - اسرائیل کے درمیان سفارتی تعلقات قائم کرنے کے معاہدوں کی شدید مذمت کی ہے۔ متحدہ عرب امارات میں ایرانی کاروباری افراد اور کمپنیوں کے پاس تقریباً 300 ارب امریکی ڈالر کے اثاثے ہیں، اور اندازاً 6 لاکھ ایرانی شہری وہاں رہائش پذیر ہیں اور جائیداد کے مالک ہیں۔ اسرائیل کے ان معاہدوں کا طویل مدتی مقصد فلسطینیوں کی آواز کو عالمی پلیٹ فارمز سے ختم کرنا اور صرف ایران کو مشرق وسطیٰ کا 'واحد بد معاش' بنا کر پیش کرنا ہے۔ اکیسویں صدی کا مشرق وسطیٰ امریکہ کے لیے ماضی کی نسبت کہیں زیادہ خطرناک خطہ بن چکا ہے۔ مارٹن انڈانیک، جو امریکہ کے سابق سفیر برائے اسرائیل اور بروکنگز انسٹیٹیوشن کے سینئر فیلو ہیں، نے وال اسٹریٹ جرنل میں ایک مضمون میں لکھا ہے کہ اب امریکہ کے لیے مشرق وسطیٰ کا تیل اور اسرائیل کی سکیورٹی پہلے جیسے اہم نہیں رہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ امریکہ مکمل طور پر مشرق وسطیٰ سے نکل جائے گا اور چین، روس، ترکی یا ایران کو جگہ دے دے گا۔ امریکہ کو اب بھی عالمی اقتصادی استحکام برقرار رکھنے کے لیے مشرق وسطیٰ جیسے غیر مستحکم خطے میں تیل کی قیمتوں پر کنٹرول اور بحری راستوں کی آزادی یقینی بنانی ہوگی۔

امریکہ 1979 سے وہابی - سلفی نظریہ رکھنے والے شدت پسند اسلام کی حمایت کرتا آ رہا ہے تاکہ خطے میں اپنے اسٹریٹیجک مفادات حاصل کر سکے اور اس کے نتیجے میں، سعودی شاہی خاندان اور خلیجی بادشاہتوں کے مفادات کو بھی تقویت ملی۔ ان حکومتوں کو عرب سول سوسائٹی کی طرف سے مسلح بغاوتوں کا خدشہ تھا، جو انقلابی سوشلسٹ عرب ریاستوں جیسے کہ شیعہ ایران، بعضی عراق، قوم پرست مصر اور لیبیا سے متاثر تھیں۔ سوویت یونین کے افغانستان پر حملے کے بعد امریکہ کی جانب سے جو پالیسی اپنائی گئی، اس کا سب سے حیران کن طویل مدتی نتیجہ یہ نکلا کہ

جہادیوں کو پاکستان اور افغانستان کے کیمپوں میں متحرک کیا گیا۔ سی آئی اے اور آئی ایس آئی نے اسامہ بن لادن کو دعوت دی کہ وہ ان عرب اور غیر عرب رضا کاروں کی قیادت کرے جو 'شہادت' کے متمنی تھے۔ ان میں سے بڑی تعداد ان مغربی تعلیم یافتہ نوجوانوں کی تھی جو مسلم معاشرے کے متوسط یا اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتے تھے، اور وہ وہابیت پر پختہ یقین رکھتے تھے جس کی وجہ سے وہ یورپی معاشروں کی مرکزی دھارے سے مکمل طور پر کٹ گئے۔

وقت کے ساتھ، وہابی-سلفی نظریہ رکھنے والے یہ شدت پسند عناصر امریکہ اور مغربی جمہوریتوں کے لیے سنگین خطرہ بن گئے۔ سعودی عرب کے بااختیار ولی عہد محمد بن سلمان (MBS) نے کئی اصلاحات کا آغاز کیا، جن میں ملک کے اندروہابی-سلفی مذہبی نظام میں کچھ نرمی کے لیے جارحانہ اور سخت گیر علما کو دباؤ میں لانا بھی شامل ہے۔ تاہم سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ دنیا بھر میں وہابی اماموں کی تربیت اور ان کی مساجد و اسلامی مطالعہ مراکز میں وہابی لٹریچر کی فراہمی کے ذریعے جو شدت پسندی پھیلائی گئی ہے اس کو واپس کیسے پلٹایا جائے؟

امریکہ، ایک خود مختار ملک ہونے کے ناطے، مسلم کمیونیٹیوں میں پھیلی ہوئی وہابی-سلفی نظریات کی خطرناک سوچ پر قابو پانے کے لیے مسلسل ناقص حکمت عملیوں کا استعمال کرتا رہا ہے۔ اس چیلنج سے نمٹنے پر مامور مختلف سکیورٹی ایجنسیوں کے حکام کو نہ تو اسلامی تاریخ کی بنیادی سمجھ حاصل تھی، اور نہ ہی مسلم برادری کی نسلی، ثقافتی اور فرقہ وارانہ خصوصیات کا ادراک۔ انہوں نے اسلام کی اُس تہذیب دار تاریخ میں جھانکنے سے انکار کیا، جو یہ واضح کرتی ہے کہ کس طرح ایک نہایت پُر امن اور روادار نظریہ یعنی صوفی سنی اسلام کو سعودی حکمرانوں نے 18 ویں صدی کے ایک عالم، محمد بن عبدالوہاب کے مشورے پر پس پشت ڈال دیا، اور اس کی جگہ ایک غیر روادار اور قدامت پسند طرز فکر کو ریاستی مذہب بنا دیا گیا۔

امریکی سکیورٹی ایجنسیوں کی سب سے بڑی ناکامی یہ تھی کہ وہ مسلم نوجوان نسل کو سمجھنے میں ناکام رہیں، جنہیں سعودی پشت پناہی سے پھیلانے جانے والے وہابی-سلفی اسلام نے متاثر کر کے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ 2004 میں، نیشنل سکیورٹی کونسل نے یہ جاننے کے لیے تحقیق کی

کہ امریکی یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے نوجوان مسلمان القاعدہ کے نظریے سے کیوں متاثر ہو رہے ہیں۔ لیکن شاید ماہرین ایک اہم نکتہ نظر انداز کر گئے کہ جہادی سوچ دراصل وہابی۔ سلفی نظریہ کا ایک اندرونی جزو ہے، جو نوجوانوں کو بچپن سے ہی اتوار کے مدارس اور دینی اسکولوں کے ذریعے سکھایا جاتا رہا ہے۔ امریکی سفارت خانوں کی مقامی مسلم برادریوں سے رابطے کی کوششوں میں جو چیز سب سے زیادہ کمی تھی، وہ یہ فہم تھی کہ وہ ان کمیونیٹیوں کی قیادت کو وہابی۔ سلفی تعلیمات سے خبردار کریں، ایسی تعلیمات جن کی بنیاد ہی انتہا پسندی اور نفرت پر رکھی گئی ہے۔

نائن الیون کے بعد امریکہ کے پاس ایک منفرد موقع تھا، کیونکہ عالمی ہمدردی اس کے ساتھ تھی، کہ وہ دنیا بھر کی مسلم کمیونیٹیوں کو انتہا پسندی سے پاک کرنے کی سنجیدہ کوشش کرتا۔ لیکن یا تو وہ اس محدود اور زہریلی نظریاتی سوچ یعنی وہابی۔ سلفی ازم کے خطرناک نتائج کو پہچان نہ سکا، یا پھر اس نے جان بوجھ کر اس کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ مسلمانوں میں انتہا پسندی کی وجہ نہ غربت ہے، نہ محرومی، اور نہ ہی مغربی جمہوریتوں کی پالیسیوں کے خلاف کوئی شکایت۔ اور نہ ہی مغربی جمہوریتیں اسلام کے خلاف حالت جنگ میں ہیں۔ اصل اور افسوسناک مسئلہ وہ سخت گیر رجعت پسند وہابی۔ سلفی اسلام ہے، جسے سعودی عرب ”اصلی“ اور ”حقیقی اسلام“ کہہ کر دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ انہوں نے اس نظریے کو ایک طاقتور، متحرک اور بامقصد اسلام کے طور پر ”برانڈ“ بنایا اور مسلم دنیا کو بیچا۔ اکثریتی سنی مسلم نوجوان، خاص طور پر مشرق وسطیٰ اور مغربی دنیا میں، انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کے ذریعے اس نظریے کے پیروکار بن گئے۔

اوباما انتظامیہ کے سینئر پالیسی سازوں کا خیال تھا کہ وہ بیک وقت دو کام کر سکتے ہیں: مسلمانوں سے دوستی کا ہاتھ بڑھانا اور ان سے انتہا پسندی کے بارے میں دیانتداری سے گفتگو کرنا۔ تاہم، وہ یہ کہنے کی ہمت نہ کر سکے کہ انتہا پسندی اور نفرت کو فروغ دینے والا اصل نظریہ وہابی۔ سلفیت ہے۔ سعودی عرب اور اس کے انتہا پسند مذہبی نظریے سے نمٹنے میں مسلسل امریکی حکومتوں کی طرف سے جو غلطیاں ہوئیں، انہوں نے انتہا پسندی کو پروان چڑھنے کا پورا موقع دیا۔ صدر اوباما کی حکومت میں سکیورٹی مشیر، انسداد دہشت گردی کے ماہرین اور نیشنل سکیورٹی کونسل کے اہلکار

مسلم کمیونٹیوں سے رابطے، ان کے تجزیے اور دہشت گردی کو قابو میں لانے کے لیے مؤثر حکمت عملی تیار کرنے میں اندھیرے میں ٹٹولتے رہے۔

امریکہ بھر میں کئی بین الادارہ دفاتر نے اپنی توجہ داعش اور دیگر دہشت گرد تنظیموں کے مالی ذرائع بند کرنے پر مرکوز رکھی، لیکن وہ یہ سمجھنے میں ناکام رہے کہ پچھلے چالیس برسوں میں وہابی اماموں اور سعودی عرب کے مذہبی اداروں نے مسلم نوجوانوں کو انتہا پسندی کی طرف مائل کیا ہے۔ انہوں نے نہ صرف اگلی نسل کے مسلمانوں کو شدت پسند بنایا بلکہ ان کے مغربی جمہوریتوں اور ان کے نمائندہ ترقی پسند اقدار کے بارے میں رویے کو بھی مکمل طور پر تبدیل کر دیا۔

حقیقت یہی ہے کہ دنیا بھر کی مسلم برادریوں میں انتہا پسندی کے پھیلاؤ میں امریکہ کا کردار اور ذمہ داری ناقابل انکار ہے۔ 1935 سے سعودی عرب کو حاصل امریکی عسکری تحفظ نے سعودی حکومت کو اعتماد اور سازگار ماحول فراہم کیا، جس کے ذریعے وہ وہابیت کو دنیا بھر کی مسلم کمیونٹیوں میں پھیلانے کے قابل ہو گئی۔ اندازہ ہے کہ 2030 تک دنیا بھر میں مسلم آبادی 2.2 ارب تک پہنچ جائے گی، جس کی ایک بڑی اکثریت وہابی۔ سلفی شدت پسند اسلام کی پیروکار ہوگی۔ اب وقت آ گیا ہے کہ دنیا کی ترقی پسند قوتیں امن کے مقصد کے لیے متحد ہوں، اور اجتماعی و ہمدردانہ جذبے کے ساتھ ایسا کچھ کریں جس سے اس رجعت پسند نظریے کو مزید نقصان پہنچانے سے روکا جاسکے۔

امریکہ اور نیٹو افواج کا افغانستان سے مکمل انخلا اور اس کے نتیجے میں افغان۔ امریکہ امن معاہدے کے تحت طالبان کو سیاسی گنجائش دینا ایک سنگین غلطی ثابت ہوئی، جس کے خطے اور پوری دنیا پر گہرے اور خطرناک اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

اگر امریکہ واقعی طالبان کو ایک بار پھر افغانستان میں اقتدار میں لانے کا ارادہ رکھتا ہے، جیسا کہ نظر آ رہا ہے، تو دنیا ایک بار پھر شدید خطرے سے دوچار ہو جائے گی۔ طالبان پہلے ہی اعلان کر چکے ہیں کہ وہ وہابی نظریات پر مبنی شریعت نافذ کریں گے۔ یہ ایک خطرناک صورت حال ہو گی، جو وہابی اسلام کو ایک نئی قانونی حیثیت دے گی حالانکہ آج بہت سے مسلم ممالک (حتیٰ کہ خود سعودی عرب بھی) اس نظریے کو محدود یا معتدل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اگر امریکہ واقعی اسلامی شدت پسندوں کے سخت گیر اور رجعت پسند رویے میں کوئی بنیادی تبدیلی دیکھنا چاہتا ہے، تو نیشنل سیکورٹی کونسل اور دیگر امریکی اداروں کو یہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے اور وہی اقدامات کرنے چاہئیں جو مراکش جیسے ممالک کر رہے ہیں۔ مراکش نے بطور خود مختار ریاست اپنے مساجد اور اسلامی مطالعہ مراکز سے تمام وہابی لٹریچر پر پابندی لگا کر وہابیت کو قابو میں لانے کے لیے عملی قدم اٹھایا ہے۔ یہ نظریہ طویل عرصے سے ایک سخت گیر، غیر روادار اور انسانی اقدار کے خلاف جرائم پر کسانے والی تعبیر اسلام کے طور پر جانا جاتا رہا ہے۔

امریکہ کے لیے آئندہ کاراستہ

اسلامک سپریم کونسل آف امریکہ، کورڈ وہا باؤس، اور اسلامک سوسائٹی آف نارٹھ امریکہ (ISNA) جیسی چند بڑی مسلم تنظیمیں امریکہ میں فعال کردار ادا کر رہی ہیں۔ نیشنل سیکورٹی کونسل اور دہشت گردی سے نمٹنے والے دیگر اداروں کو چاہیے کہ وہ ان تنظیموں کے ساتھ باقاعدہ مکالمہ شروع کریں، تاکہ عوامی زندگی میں اسلام کی ایک زیادہ معتدل شکل کے تصور کو دوبارہ زندہ کیا جاسکے۔ بنیاد پرستی (Fundamentalism) کا مطلب ہے عدم رواداری، تعصب میں اضافہ، اور دین کی ایک طرفہ اور سخت گیر تشریح جیسا کہ وہابی۔ سلفی نظریے میں دیکھا جاتا ہے۔

اسلامک سوسائٹی آف نارٹھ امریکہ (ISNA)، جو پلین فیلڈ، انڈیانا، امریکہ میں قائم ہے، ایک مرکزی تنظیم ہے۔ یہ ممکنہ طور پر شمالی امریکہ کی سب سے بڑی مسلم تنظیم سمجھی جاتی ہے۔ ISNA ہر سال ایک سالانہ کنونشن منعقد کرتی ہے، جو امریکی مسلمانوں کا سب سے بڑا اجتماع تصور کیا جاتا ہے، جہاں وہ سول سوسائٹی، سیاست، میڈیا، تعلیم اور عوامی انتظامیہ میں اپنے کردار پر گفتگو کرتے ہیں۔

امریکی محکمہ برائے داخلی سلامتی (Department of Homeland Security) کو چاہیے کہ وہ ISNA کو ساتھ لے کر وہابی۔ سلفی قیادت پر زور دے کہ وہ اپنے رویے میں نرمی لائے، اور دیگر مذاہب و ثقافتوں کے حوالے سے اپنے موقف میں برداشت پیدا کرے۔ حکام کو مختلف مسلم کمیونٹیوں کو بھی اس بات کی ترغیب دینی چاہیے کہ وہ ان سعودی فلاحی اداروں سے اپنا

تعلق ختم کریں جو وہابیت کے فروغ کے لیے فنڈ فراہم کرتے ہیں، اور اس کے بجائے ایسے ممالک کے ساتھ اشتراک کریں جو زیادہ روادار اور پُر امن اسلام کو فروغ دیتے ہیں جیسے مراکش، جہاں صوفی سنی اسلام کی روایت کو اپنایا گیا ہے۔ امریکہ، ایک خود مختار ریاست ہونے کے ناطے، اس بات کا پورا حق رکھتا ہے کہ وہ اپنی مساجد اور اسلامی مطالعہ مراکز سے ایسے تمام وہابی لٹریچر پر پابندی عائد کرے جو دیگر مذاہب کے خلاف نفرت کو ہوا دیتا ہے اور جہاد پسندی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر بھی ISNA اور امریکی سیکورٹی ایجنسیوں کے اشتراک سے نگرانی کی جانی چاہیے، اور خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت کارروائی کی وارننگ دی جانی چاہیے۔ اب فیصلہ امریکہ کی حکومت کے ہاتھ میں ہے کیونکہ اس پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف اپنے ملک بلکہ پوری دنیا کے لیے امن کی بنیاد رکھنے میں قیادت فراہم کرے۔

تمہید

سنہ 1979 میں مشرق وسطیٰ میں تین ایسے ہولناک واقعات پیش آئے جنہوں نے موجودہ مسلم دنیا کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ واقعات تاریخ کے وہ نکتہ ہائے انحراف تھے جن سے جدید اسلامی انتہا پسندی اور دہشت گردی کے بیشتر مظاہر کو جوڑا جاسکتا ہے۔ ان میں سب سے پہلا واقعہ ایران کا انقلاب تھا، جسے اسلامی انقلاب ایران بھی کہا جاتا ہے۔ یہ انقلاب آیت اللہ خمینی (1902-1989) کی قیادت میں برپا ہوا۔ وہ یکم فروری 1979 کی صبح پیرس سے ایک کرائے کے طیارے کے ذریعے اپنے رفقاء اور صحافیوں کے ہمراہ تہران پہنچے۔ ان کا استقبال کرنے کے لیے تیس لاکھ سے زائد افراد کا ہجوم سڑکوں پر موجود تھا۔ خمینی نے فوری طور پر مہدی بازگان، جو تحریک آزادی ایران کے رہنما تھے، کو عبوری حکومت کا وزیر اعظم مقرر کیا۔ مشرق وسطیٰ کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب کسی بادشاہت کا خاتمہ فوجی بغاوت کے بجائے (جیسا کہ پہلے مصر اور عراق میں ہوا تھا) عوامی تحریک کے ذریعے ہوا، جس کی روح رواں شیعہ مذہبی جوش و جذبہ تھا۔ اس وقت سعودی عرب میں بیمار بادشاہ خالد اور ان کے سوتیلے بھائی ولی عہد فہد نے اس انقلاب کو قاہرہ اور بغداد میں پہلے سے وقوع پذیر بادشاہ مخالف بغاوتوں کے سلسلے کا ہی ایک حصہ سمجھ کر قبول کر لیا۔

سعودی عرب نے خمینی حکومت کو تسلیم کر لیا تھا۔ نائب وزیر اعظم، شہزادہ عبداللہ بن عبدالعزیز آل سعود نے ”گلف نیوز“ کو دیے گئے ایک انٹرویو میں کہا کہ قرآن پاک دونوں ممالک کا آئین ہے، اس لیے ان کے تعلقات اب مادی مفادات یا جغرافیائی سیاست کے تابع نہیں رہے۔ شاید سعودی قیادت نے اسلامی انقلاب ایران کے طویل المدتی نتائج کو کم اہمیت دی۔ انقلاب سے پہلے تہران اور تل ابیب (اسرائیل) کے درمیان قریبی تعلقات تھے۔ ایران اسرائیل کو تیل فراہم کرتا اور دونوں کے درمیان کئی تجارتی معاہدے موجود تھے۔ یہ سب 1979 کے انقلاب کے ساتھ ختم ہو گئے۔

اگرچہ اسلامی جمہوریہ ایران ایک مسلم ملک ہے، لیکن شیعہ مسلمان اور فارسی تہذیبی طور پر خود کو عربوں سے برتر سمجھتے ہیں۔ مزید برآں، اس مذہبی انقلاب نے مشرق وسطیٰ میں صدیوں پرانی سنی-شیعہ رقابت کو ایک بار پھر نمایاں کر دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سعودی عرب کے وہابی-سلفی نظریات کے حامل سنی مسلمان شیعہ مسلمانوں کو مرتد سمجھتے ہیں۔

دوسرا ہولناک واقعہ نومبر 1979 میں پیش آیا جب جوہیمان العتیبی، ایک سعودی جنگجو جس پر وہابی سلفیت کا گہرا اثر تھا، نے مسجد الحرام (مکہ) پر قبضہ کر لیا۔ وہ نجد کے ایک بااثر خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور سعودی افواج کا سابق اہلکار تھا۔ اس نے ایک گروہ تیار کیا اور انہیں مسجد الحرام پر قبضے اور پھر سعودی شاہی حکومت کے خاتمے کے لیے تربیت دی۔ اس نے اسلامی کیلنڈر کے پہلے مہینے، محرم کی پہلی تاریخ چنی، جب ہزاروں مومنین فجر کی نماز کے بعد خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہیں۔ حملہ آوروں کے مطابق، ”آل سعود کی حکومت اپنی کرپشن، نمود و نمائش، اور سعودی معاشرے کو مغربی طرز پر تبدیل کرنے کی جارحانہ پالیسی کی وجہ سے اسلامی اقدار سے منحرف ہو چکی تھی، اس لیے وہ اقتدار میں رہنے کی حقدار نہیں رہی۔“ جوہیمان العتیبی چودھویں صدی کے اسلام پسند عالم ابن تیمیہ (1263-1328) اور اٹھارہویں صدی کے مشہور عالم محمد بن عبد الوہاب (1703-1792) کے نظریات سے متاثر تھا۔

اپنے بلند دینی مقام کے سبب، عبد الوہاب نے ابن تیمیہ کے نظریات کی سرحدوں کو مزید

وسعت دی۔ اس نے ابن تیمیہ کے کاموں پر گہری تحقیق کی اور ان کے بنیادی عقائد کو اخذ کر کے اپنی ہم عصر مسلم سوسائٹی میں دوبارہ راسخ کرنے کی کوشش کی۔ عبدالوہاب کے زمانے میں جزیرہ نما عرب میں کوئی متحدہ ریاستی نظام موجود نہ تھا۔ اس کی پہلی ترجیح عرب مسلمانوں کو ان کے ”ابتدائی خالص پن“ میں واپس لانا تھا، اور اس مقصد کے لیے اس نے ابن تیمیہ کے نظریات کو نافذ کرنے کا عزم کیا۔

اس نے خطے کی مختلف بستیوں کے سرداروں سے بات چیت شروع کی۔ انہیں قائل کیا کہ معمولی اختلافات پر جھگڑنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا؛ بہتر یہ ہے کہ قرآن پاک اور سنت نبوی کی تعلیمات کی طرف رجوع کیا جائے اور انہیں تمام بستیوں کے لیے قابل قبول اور پُرکشش بنایا جائے۔ اس نے اپنی کتاب کتاب التوحید (توحید کی کتاب) میں ان تمام رائج انحرافات کو نمایاں کیا جنہیں وہ اسلام سے انحراف سمجھتا تھا۔

اس نے اولیاء اللہ کی قبور پر حاضری اور وہاں سے برکت لینے کے عمل کی سخت مخالفت کی۔ اس کے نزدیک بزرگان دین کا ادب و احترام بت پرستی کے مترادف تھا۔ اس نے صوفی ازم کی بھی شدید مخالفت کی جو کہ اسلام کا ایک نرم، روادار اور کشادہ دل روپ ہے۔

1744 میں، عبدالوہاب نے نجد کے مرکزی علاقے درعیہ کے ایک بااثر سردار، ابن سعود سے ایک تاریخی معاہدہ کیا۔ یہ معاہدہ عبدالوہاب کے لیے اس کے نظریات کو قانونی حیثیت دلانے اور اسلام کی ایک انتہائی سخت گیر تعبیر کو فروغ دینے کے لیے فیصلہ کن ثابت ہوا۔ اس معاہدے کے بعد، جزیرہ نما عرب کی مختلف مسلم بستیاں اس خواب کی تعبیر کے لیے متحد ہو گئیں کہ وہ اسلام کے ابتدائی، خالص اور ”غیر فاسد“ دور کو واپس لائیں۔ اس تحریک کو سلفی اسلام کہا جاتا ہے۔

پہلی بار بڑے پیمانے پر، جزیرہ نما عرب کے مسلمانوں نے صوفی ازم کو حاشیے پر دھکیلنا شروع کر دیا۔ ایک ایسا دینی نظریہ جو ہم آہنگی، تصوف اور دیگر مذاہب کے ساتھ رواداری کا علمبردار رہا ہے۔

1932 میں مملکت کے قیام کے بعد سے، سعودی شاہی خاندان وہابی علما کے ساتھ ہم آہنگی میں کام کر رہا تھا تاکہ اس نظریے کو منظم طریقے سے مختلف طبقات میں پھیلا یا جاسکے۔ تاہم، اصل

تبدیلی 1938 میں مشرقی صوبے میں تیل کی دریافت سے آئی، جس کے بعد پیٹرول ڈالر زکی بھر مار نے سعودی حکومت کو مالی طور پر خود مختار بنادیا اور ان کے ہاتھ میں بے پناہ وسائل آ گئے۔ آل سعود کے افراد اور ان کے بعد آنے والے حکمران پُر تعیش زندگی گزارنے لگے، ان کے لیے عالی شان محلات اور تفریحی کشتیاں تعمیر کی گئیں یا خریدی گئیں۔ دوسری طرف، مذہبی طبقے کو مکمل آزادی حاصل تھی کہ وہ دنیا بھر میں مساجد، مدارس، اور اسلامی مراکز کو مالی اعانت فراہم کریں اور وہابی۔ سلفی طرز اسلام کو فروغ دیں، جس نے صوفی اسلام جیسے روادار اور ہم آہنگ نظریے کو حاشیہ پر دھکیل دیا۔

وہابی تعلیمات کی سخت گیر تشریحات، جنہیں دل کھول کر دی جانے والی مالی معاونت کے ساتھ پیش کیا گیا، نے مسلم دنیا میں بہت سے پیروکار پیدا کیے۔ سنی مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت اس بنیاد پر ستانہ نظریے اور شدت پسندی کے راستے کی جانب راغب ہوئی۔

تیسرا قیامت خیز واقعہ دسمبر 1979 کے مہینے میں پیش آیا، جب سوویت یونین نے افغانستان پر حملہ کیا۔ اس کے جواب میں، رونالڈ ریگن کی قیادت میں امریکی حکومت نے فیصلہ کیا کہ سوویت یونین کو شکست دینے کے لیے افغانستان میں اسلام پسندوں کو اسلحہ فراہم کیا جائے گا۔

یہ جنگ لڑنے والے گروہوں میں افغان مجاہدین، طالبان (جو پاکستانی مدارس کے نوجوان طالب علم تھے)، عرب و مسلم دنیا سے پاکستان آنے والے جہادی، اور کرائے کے فوجی شامل تھے۔ امریکی خفیہ ایجنسی سی آئی اے نے پاکستانی خفیہ ادارے آئی ایس آئی کے ذریعے جہادی گروہوں کو بے تحاشہ فنڈز فراہم کیے تاکہ اسلام پسندوں کے ذریعے سوویت یونین کو کمزور کیا جاسکے۔

یہ امریکی منصوبہ آپریشن سائیکلون کہلایا، جو سی آئی اے کی تاریخ کا سب سے طویل اور مہنگا خفیہ منصوبہ تھا۔ 1987 میں اس کی مالی اعانت بڑھ کر سالانہ 630 ملین امریکی ڈالر ہو گئی۔ پاکستانی حکومت کو افغان مزاحمتی گروہوں کی تربیت اور اسلحہ فراہمی کے لیے 20 ارب ڈالر سے زائد کی امداد ملی۔

یہ حمایت مجاہدین کی سوویت یونین کے خلاف مزاحمت کے لیے انتہائی اہم ثابت ہوئی۔ اس دوران، وہابی-سلفی نظریے کے پُر جوش حامی عرب رضا کار بڑی تعداد میں پاکستان پہنچے تاکہ امدادی گروپ بنائیں۔ خود سعودی عرب کی قیادت نے بھی اس مقصد کے لیے لاکھوں ڈالر فراہم کیے۔

سعودی عرب کے مشہور اور نہایت دولت مند بن لادن خاندان کے وارث، اسامہ بن لادن، اپنے عرب ساتھیوں کے ایک بڑے گروہ کے ساتھ پاکستان پہنچے۔ جلد ہی یمن اور شام سے بھی جہادی رضا کار اس 'مقدس جنگ' میں شامل ہو گئے۔

امریکی ساختہ اسٹنکر اینٹی ایئر کرافٹ میزائل اور دیگر ہلکا اسلحہ پاکستانی آئی ایس آئی کے ذریعے ان جنگجوؤں میں تقسیم کیا گیا۔ پاکستانی فوج کے کرپٹ جنرلوں نے امریکی امداد کا بڑا حصہ ہڑپ لیا اور اسلحہ، بشمول اسٹنکر میزائل اور اے کے-47 رائفلیں، کراچی، کوئٹہ اور پشاور کی کھلی منڈیوں میں فروخت کر دی۔

سوویت حملے کے نتیجے میں تقریباً 40 لاکھ عام افغان باشندے بے گھر ہو گئے، جن میں سے بیشتر نے پاکستان کی سرحد عبور کی۔ یہ لوگ ڈیورنڈ لائن (افغانستان اور پاکستان کی سرحد) کے ساتھ پھیلے ہوئے مہاجر کیمپوں میں آباد ہو گئے۔

ان کے بچوں، خاص طور پر لڑکوں، کو ہزاروں مدارس میں داخل کرایا گیا، جنہیں سعودی عرب کے وہابی-سلفی اداروں کی مالی امداد حاصل تھی۔ ان مدارس میں عموماً صوفی اسلام اور شیعہ مذہب کے خلاف نفرت پر مبنی تعلیم دی جاتی تھی۔ امریکہ کی جانب سے مجاہدین کی حمایت کے اس فیصلے کا ایک اہم ضمنی نتیجہ یہ نکلا کہ ایک نئی نسل کے طالب علم (طالبان) تیار ہونے لگے، جنہیں بچپن سے ہی خود کش حملوں سمیت 'عظیم قربانی' کے اسلامی جواز اور فوائد سکھائے جاتے تھے۔

ان مدارس سے فارغ التحصیل طلبہ کو انتہا پسند اسلام کے پھیلاؤ کے لیے نہ صرف نظریاتی طور پر بلکہ عملی طور پر بھی تیار کیا گیا تھا۔ جب سوویت یونین نے 1989 میں افغانستان سے نکلنے کا فیصلہ کیا، تو طاقت کا خلا پیدا ہو گیا جسے مختلف وارلارڈز (جنگی سرداروں) کے گروہوں نے پُر کرنے کی کوشش کی۔ اس سے ایک ہولناک خانہ جنگی شروع ہوئی جس نے افغانستان کے دیہی

علاقوں کو مکمل طور پر تباہ کر دیا۔

پاکستان کے سکیورٹی اداروں نے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے افغانستان میں اپنے اثر و رسوخ کو بڑھانے کی حکمت عملی اختیار کی، جسے انہوں نے 'اسٹریٹجک ڈپتھ' (حکمت عملی کی گہرائی) کا نام دیا۔ ان کے خیال میں بھارت کے مشرقی بارڈر سے دباؤ کی صورت میں یہ ایک فیصلہ کن پالیسی ثابت ہو سکتی تھی۔

ابتدائی فوجی تربیت کے بعد، پاکستانی اسٹیبلشمنٹ نے افغان طالبان کو ان کے مدارس سے نکال کر اسلحے اور ٹینکوں سے لیس کیا۔ دوست ملک سعودی عرب نے انہیں پک اپ ٹرک خریدنے کے لیے مالی امداد فراہم کی۔

پاکستانی فوج کی پشت پناہی میں ایک نئی طالبان فوج نے افغانستان میں داخل ہو کر جنگجو وار لارڈز کو کچل دیا اور ایک سخت شریعت پر مبنی طالبان حکومت قائم کی۔ یہ وہی ماڈل تھا جو چودہویں صدی کے اسلامی اسکالر ابن تیمیہ نے پیش کیا تھا، اور جسے بعد ازاں 1744 میں ابن عبدالوہاب نے سعودی عرب میں ابن سعود کے ساتھ معاہدہ کر کے زندہ کیا اور ادارہ جاتی شکل دی۔

پاکستان اور سعودی عرب دونوں نے ملا عمر کی حکومت کو افغانستان کی جائز حکومت کے طور پر تسلیم کر لیا۔ امریکی خفیہ ادارے بھی اس بنیاد پرست کردار رکھنے والے ناکام ریاست کو تسلیم کرنے میں شریک جرم تھے، بغیر اس کے کہ وہ اس کے طویل مدتی نتائج کو سمجھ پاتے۔ جلد ہی کابل حکومت نے شریعت نافذ کر دی۔ تمام خواتین کو سخت پردے کا پابند بنایا گیا، خواتین کی تعلیم پر پابندی عائد کر دی گئی اور انہیں پورے افغانستان میں سرکاری ملازمتوں سے نکال دیا گیا۔

جب طالبان کی قیادت میں حکومت قائم ہو گئی، تو امریکی انتظامیہ نے افغانستان کے اس منصوبے کو تکمیل شدہ مشن قرار دے دیا اور ایسا رویہ اختیار کیا جیسے ان کا اس ملک سے اب کوئی تعلق نہ ہو، حالانکہ یہ وہی ملک تھا جس میں انہوں نے اربوں ڈالر خرچ کر کے ایک انتہائی بنیاد پرست جہادی گروہ کو مسلح کیا تھا۔

امریکی انٹیلی جنس یا انتظامیہ کا ہمیشہ یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ کسی بھی عسکری مداخلت کے بعد کوئی حکمت عملی ترتیب نہیں دیتے۔ برسوں بعد یہی غلطی انہوں نے عراق پر حملے کے بعد دہرائی، جب وہ بغیر کسی مابعد حکمرانی منصوبے کے عراق کو چھوڑ گئے۔ اس کا نتیجہ تباہ کن نکلا، کیونکہ ایک مکمل فرقہ وارانہ جنگ چھڑ گئی، جس نے بالآخر داعش (ISIS) کی بنیاد رکھنے میں مدد دی، اور دنیا نے وہابی-سلفی نظریے کے پیروکاروں کے ہاتھوں دوسری عالمی جہادی دہشت گردی کی لہر کا مشاہدہ کیا۔

وہابی-سلفی عقیدہ اسلام

1980 اور 1990 کی دہائیاں وہ اہم زمانے تھے جب سعودی عرب نے وہابی-سلفی اسلام کے ورژن کو جارحانہ انداز میں فروغ دینا شروع کیا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے عالمی سطح پر اسلامی مراکز (اتوار مدارس)، مساجد اور نجی اسکولز کو مالی امداد فراہم کی، خاص طور پر امریکہ اور بیشتر یورپی ممالک جیسے برطانیہ، بلجیم، اسپین، فرانس اور جرمنی میں۔ اس عالمی مہم نے سرکاری سطح پر ان نوجوان مسلمانوں کو بنیاد پرستی کی طرف مائل کیا جو ہائی اسکولز اور پیشہ ورانہ کالجوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، اور ان کے لیے قرآن اور احادیث کا وہابی ترجمہ انگریزی زبان میں استعمال کیا گیا۔ سعودی عرب سے اسلامی پروفیسرز کو مختلف یونیورسٹیوں میں مسلم طلبہ سے خطاب کے لیے بلا یا گیا۔

یہ وہی زمانہ تھا جب امریکی انتظامیہ کے قومی سلامتی کے ادارے سعودی عرب کی طرف سے امریکہ میں وہابی-سلفی نظریے کو فروغ دینے کی سرگرمیوں کی حمایت کر رہے تھے، بغیر اس کے کہ وہ اسلام کی تاریخ یا اس عمل کے اثرات کو سمجھتے۔

افغانستان میں طالبان کی قیادت میں قائم حکومت نے ایک وقت میں دنیا بھر سے آئے ہوئے 100000 سے زائد شدت پسندوں کو پناہ دی، جن کی قیادت اسامہ بن لادن کر رہا تھا، جو وقت کے ساتھ ساتھ ایک انتہائی طاقتور شخصیت بن گیا۔ اس نے پورے افغانستان میں تربیتی مراکز قائم کیے۔ امریکہ نے جب افغانستان کی جنگ کے دوران اربوں ڈالر اور جدید اسلحہ جہادی گروہوں کو فراہم کیا تو ایک 'فرینکفیلڈ ٹائن' تخلیق کیا۔ اسامہ بن لادن کی قیادت

میں، ملا عمر کی حکومت کے تحت محفوظ پناہ گاہوں سے مستفید ہوئی اور امریکہ و یورپی ممالک سے تعلیم یافتہ پیشہ ور افراد اور شدت پسندوں کی بھرتی شروع کر دی۔

پاکستانی خفیہ ادارہ آئی ایس آئی القاعدہ کے ان مذموم عزائم کی بھرپور مدد کر رہا تھا، کیونکہ وہ افغانستان پر بالواسطہ قبضہ کرنے اور بھارت کو کشمیر میں زخمی کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اُس وقت کے پاکستانی صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے ملک میں وہابی نصاب متعارف کرایا، مدارس میں اس کی تعلیم عام کی اور مساجد میں سلفی اصلاحات نافذ کیں، تاکہ صوفی اسلام کو منظم طریقے سے پس منظر میں دھکیل دیا جائے۔

مقبوضہ کشمیر میں، جہادیوں کو لائن آف کنٹرول (LoC) عبور کر کے بھیجا گیا تاکہ کشمیر کے سماجی و ثقافتی تانے بانے کو نقصان پہنچایا جاسکے۔ متعدد ہندو کشمیری پنڈت قتل کر دیے گئے یا وادی سے جبراً ہجرت پر مجبور کیے گئے، جبکہ صوفی اولیاء کے مزار، جہاں معتدل صوفی مسلمان عبادت کرتے تھے، بم دھماکوں کا نشانہ بنے۔ امریکہ میں خارجہ پالیسی کی خفیہ سازشوں میں کردار ادا کرنے والی بااثر کونسل آن فارن ریلیشنز (CFR) نے اس بات کی تصدیق کی کہ دہشت گرد تنظیمیں لشکر طیبہ اور حیدر محمد پاکستانی آئی ایس آئی نے CIA کی خاموش منظوری سے کشمیر میں خونریزی کے لیے قائم کیں۔

جہادی سیاحت میں اچانک تیزی آئی، خاص طور پر کراچی اور پشاور ہوائی اڈوں پر، جوشدت پسندوں کے لیے بین الاقوامی عبوری مراکز کے طور پر استعمال ہونے لگے۔ یہ شدت پسند کاہل اور قندھار جاتے تاکہ اسامہ بن لادن اور اس کے قریبی مشیروں کے خطابات سن سکیں۔ القاعدہ کے سینئر آپریٹوز باقاعدہ طور پر خفیہ اور منظم طریقے سے دنیا بھر میں حملے کرنے کے لیے منصوبہ بندی کے اجلاس منعقد کرتے تھے۔ ان اجلاسوں میں شرکت کرنے والے براہ راست کراچی یا پشاور نہیں آتے تھے، بلکہ پیچیدہ راستے اختیار کرتے، مثلاً پہلے فرینکفرٹ سے بینکاک جاتے، پھر کراچی پہنچتے، اور وہاں سے سڑک کے ذریعے قندھار یا کاہل لے جائے جاتے۔

کوسوو و لبریشن آرمی (KLA) بھی القاعدہ کے ساتھ گٹھ جوڑ میں تھی۔ منشیات کی اسمگلنگ

ایک اور کاروبار تھا جس میں القاعدہ پوری طرح ملوث تھی۔ وہ منشیات دنیا بھر میں بھارت اور کوسوو کے راستے پہنچاتی۔ آئی ایس آئی نے خفیہ طور پر پاکستان اور افغانستان میں کام کرنے والے سی آئی اے کے اہلکاروں پر نظر رکھی اور اسامہ بن لادن کو حساس معلومات فراہم کیں، جبکہ سی آئی اے کو بن لادن کی پناہ گاہوں اور القاعدہ کے تربیتی مراکز کے بارے میں معلومات نہیں دی گئیں۔ آئی ایس آئی اکثر سی آئی اے کو جعلی معلومات فراہم کر کے انہیں گمراہ کرتی رہی۔

وقت کے ساتھ، آئی ایس آئی اس پورے معاملے میں سب سے بڑا فائدہ اٹھانے والا ادارہ بن کر ابھری چاہے وہ مالی فائدے ہوں یا عسکری اور اس نے جہادیوں کو اسلحہ دے کر مضبوط کیا۔ پاکستانی عسکری اسٹیبلشمنٹ، جس کی قیادت آئی ایس آئی کر رہی تھی، نے بن لادن اور اس کے ساتھیوں کو مکمل تحفظ فراہم کیا، اور کشمیر میں جہادی سرگرمیوں کو دو گنا کر دیا تاکہ کشمیر کو تقریباً ایک آزاد ریاست کی حیثیت دی جاسکے۔ بالآخر، افغانستان۔ پاکستان کے اس جہادی منظر نامے میں امریکی ایجنسیاں مؤثر کردار سے باہر ہو گئیں۔

پہلی خلیجی جنگ

اگست 1990 میں، صدام حسین نے کویت پر چڑھائی کر دی اور اپنی افواج کو ہمسایہ ریاست میں داخل کر دیا۔ صدر جارج ایچ ڈبلیو بش نے اسے مشرق وسطیٰ میں امریکی مفادات کے لیے خطرہ سمجھا اور اقوام متحدہ اور یورپی ممالک کو شامل کر کے ایک عالمی اتحاد قائم کیا تاکہ کویت کو عراقی افواج سے آزاد کرایا جاسکے۔ اس فوجی کارروائی کو ”آپریشن ڈیزرٹ اسٹورم“ کا نام دیا گیا، اور امریکی کمان کے تحت افواج نے سعودی عرب میں اتر کر عراق پر زمینی اور فضائی حملے شروع کیے تاکہ کویت کو آزاد کرایا جاسکے۔ جنوری 1991 میں یہ کارروائی شروع ہوئی اور عراقی افواج کو کویت سے نکال باہر کیا گیا۔ پوری کارروائی صرف تین دن میں مکمل ہو گئی۔

تاہم، سعودی عرب میں امریکی افواج کی موجودگی اور ایک عرب ملک پر حملہ، اسامہ بن لادن اور اس کی انتہا پسند تنظیم کو ناگوار گزرا۔ وہابی سلفی عقیدے کا پیروکار بن لادن غیر مسلموں کو کافر سمجھتا تھا، اور مقدس سرزمین پر امریکی افواج کی موجودگی کو توہین سمجھتا تھا۔ اس کی امریکہ کے

خلاف ناراضی مزید بڑھ گئی، باوجود اس کے کہ افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف جنگ کے دوران اسے امریکی فوجی مشیروں سے امداد ملی تھی۔ سی آئی اے نے امریکی ڈالر کے ذریعے تمام جہادی گروپوں، بشمول القاعدہ، کو اسلحہ خریدنے اور عرب جنگجوؤں کو مسلح کرنے کے لیے مالی مدد فراہم کی تھی۔

فلسطین کا سلگتا ہوا مسئلہ اور اسرائیلی قبضوں کے لیے امریکہ کی کھلی حمایت اکثر اس کے ذہن میں آتی رہتی تھی، جس سے وہ امریکہ کے بارے میں مزید بے چین اور ناراض ہوتا گیا۔ اس دوران، 1990 کی دہائی کے اوائل میں، امریکہ نے صومالیہ میں بھی مداخلت کی تاکہ بظاہر وہاں کے مقامی ملیشیاؤں کے درمیان لڑائی ختم کر کے ”نظم و ضبط“ قائم کیا جاسکے۔

جہادی ہیرو کے طور پر اسامہ کا عروج

1995-96 تک، اسامہ بن لادن عالمی سطح پر ایک جہادی ہیرو کے طور پر مقبول ہو چکا تھا، اور جلد ہی وہ بین الاقوامی میڈیا کی نگاہ کا مرکز بن گیا۔ اس کی شخصیت کو عالمی سطح پر ایک برانڈ کی صورت میں پیش کیا گیا، اور جنوبی ایشیاسمیت دنیا بھر کے مسلمان نوجوان اسے اپنا رول ماڈل اور متاثر کن شخصیت تصور کرنے لگے۔ وہ بار بار اپنی قریبی ٹیم کے ساتھ یہ بات زیر بحث لاتا رہا کہ امریکیوں اور ان کی ’شیطانی سلطنت‘ کو کس طرح سزا دی جائے۔ وہ امریکی فوجی طاقت سے بخوبی واقف تھا اور اس سے براہ راست ٹکرا لینے کی غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے امریکی مفادات کو عرب خطے میں نشانہ بنانے اور ان کے رد عمل کو جانچنے کی ایک انوکھی حکمت عملی تیار کی۔

اس نے ایک خود کش حملے کا منصوبہ بنایا، جس میں دھماکہ خیز مواد سے بھری ہوئی کار کو سعودی عرب کے شہر الخبر میں واقع امریکی فضائیہ کے رہائشی کمپلیکس سے ٹکرا دیا گیا۔ یہ حملہ 25 جون 1996 کو ہوا، جس میں 19 سے زائد امریکی فوجی ہلاک ہوئے۔ اس حملے نے سعودی شاہی خاندان کو یہ سخت پیغام دیا کہ مقدس سرزمین پر غیر ملکی افواج برداشت نہیں کی جائیں گی۔

امریکی انٹیلیجنس ایجنسیوں، جیسے سی آئی اے اور ایف بی آئی، کو شبہ ہونے لگا کہ الخبر ٹاور حملے میں اسامہ بن لادن اور اس کی تنظیم القاعدہ ملوث ہے۔ اسی دوران امریکی ایجنسیاں اس

حقیقت سے آگاہ ہو رہی تھیں کہ سوویت یونین کو افغانستان سے نکالنے کے لیے بنائی گئی جہادی تنظیم القاعدہ، جسے دی بیس، بھی کہا جاتا تھا، نہ صرف اب بھی موجود ہے بلکہ بہت تیزی سے پھیل چکی ہے۔ اس وقت تک امریکی انٹیلیجنس کو آئی ایس آئی کی جانب سے القاعدہ کی قوت کے بارے میں مسلسل گمراہ کیا جا رہا تھا۔

افغان جہاد کے بعد، اسامہ بن لادن کو کبھی کابل اور کبھی سوڈان کے دارالحکومت خرطوم میں دیکھا گیا۔ اس نے سوڈان میں تعمیراتی کاروبار شروع کیا، جس کا مقصد سڑکیں تعمیر کرنا تھا۔ 1993 میں، نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی سیمنٹ میں ایک کم شدت کا بم دھماکہ ہوا۔ امریکی حکومت نے سوڈانی حکومت پر اسامہ کو ملک بدر کرنے کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ 1996 میں، وہ دوسو پیر وکاروں کے ساتھ ایک چارٹر طیارے میں کابل پہنچا، جہاں پاکستانی حمایت یافتہ طالبان حکومت نے اسے ایک خصوصی مہمان کا درجہ دیا۔

اسامہ نے جلد ہی وہاں بے پناہ اثر و رسوخ حاصل کر لیا، اور طالبان کے امیر، ملا عمر، اسے اپنا روحانی رہنما سمجھنے لگے۔ امریکی حکومت نے سعودی عرب پر بھی دباؤ ڈالا کہ وہ اسامہ کو امریکہ کے حوالے کرے، لیکن طالبان حکومت نے اس کی سخت مزاحمت کی۔ 1998 میں، اسامہ نے امریکیوں کے خلاف ایک فتویٰ جاری کیا، جس میں سعودی حکومت کو گرانے کی اپیل کی گئی۔ اسی سال، القاعدہ نے کینیا کے شہر نیروبی اور تنزانیہ میں واقع امریکی سفارت خانوں پر بیک وقت حملے کیے، جن میں دوسو سے زائد افراد ہلاک اور تقریباً دس ہزار زخمی ہوئے۔

پہلی بار، امریکی عوام اور میڈیا ’خواہ پرٹ ہو یا الیکٹرانک‘ نے القاعدہ اور اس کے رہنماؤں، اسامہ بن لادن اور ایمن الظواہری، سے پیدا ہونے والے غیر معمولی خطرے کو سنجیدگی سے محسوس کیا۔

امریکی انٹیلیجنس ایجنسیاں مکمل طور پر بیدار ہو گئیں کہ افریقہ میں ان کے سفارت خانوں پر ہونے والے حملوں کے پیچھے القاعدہ اور اسامہ بن لادن کا ہاتھ تھا۔ اصل مسئلہ خود اسامہ بن لادن کی ذات تھی۔ صدر بل کلنٹن نے افغانستان میں بن لادن کے زیر انتظام تربیتی کیمپوں پر جوابی

حملہ کا حکم دیا۔ امریکی فوج نے 70 کروڑ میزائل داغے۔ ہدف تو نشانہ بنے، مگر بن لادن اور القاعدہ کے تمام اعلیٰ رہنما محفوظ رہے کیونکہ آئی ایس آئی نے انہیں پیشگی اطلاع دے دی تھی۔

بن لادن کے قریبی گروہ نے اس وقت امریکہ کے پیسے، طاقت اور جمہوریت کی علامتوں پر ایک شاندار حملے کی تیاری شروع کر دی تھی۔ اسی دوران خالد شیخ محمد، جو امریکہ کی ایک یونیورسٹی سے زرعی سائنس میں ڈگری لے چکا تھا، بن لادن کے سامنے کچھ حیرت انگیز خیالات لے کر آیا۔ ایک اجلاس میں اس نے تجویز دی کہ امریکہ کے مشرقی اور مغربی ساحلوں سے مسافر طیارے ہائی جیک کر کے انہیں امریکہ کی مشہور عمارتوں سے ٹکرا دیا جائے۔ بن لادن نے ابتدا میں اسے مسترد کرتے ہوئے کہا کہ یہ منصوبہ بہت بڑا ہے اور اس میں کئی لوگ شامل ہوں گے، اس لیے راز فاش ہونے کا خطرہ ہے۔ تاہم بعد میں اس نے یہی منصوبہ اختیار کیا اور مخصوص اہداف چن کر ان پر ہوائی جہازوں سے حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

اوائل 1999 میں، بن لادن نے خالد شیخ محمد کو قندھار بلایا اور منصوبے پر عملدرآمد کی اجازت دی۔ ایک اور اجلاس میں امریکی ایٹمی تنصیبات کو نشانہ بنانے کی تجویز بھی سامنے آئی، لیکن اس خیال کو رد کر دیا گیا کیونکہ اس سے امریکی مسلمانوں کی بڑی تعداد متاثر ہو سکتی تھی۔ حوالہ دے پاکستان میں ایک محفوظ مقام سے منصوبے پر کام شروع کیا، جہاں وہ آئی ایس آئی کی نگرانی میں تھا۔ اس نے مالی وسائل اور دیگر لو جسٹک امور کو ترتیب دیا۔

حملہ آوروں کے چناؤ کا کام جرمنی کے شہر ہیمبرگ کی مسجد القدس کے امام فزازی کو سونپا گیا۔ اس مسجد میں آنے والے محمد عطا کو قیادت سونپی گئی، جو 1992 میں ارب بن پلاننگ کی تعلیم کے لیے جرمنی آیا تھا۔ امام فزازی وہابی سلفی نظریات کا سخت حامی تھا اور اس نے ایسے سعودی نوجوانوں کی نشاندہی کی جو نظریاتی طور پر انتہا پسند اور تعلیمی طور پر قابل تھے۔ انہیں پہلے ہیمبرگ اور بعد ازاں افغانستان بھیجا گیا تاکہ وہ بن لادن سے تربیت حاصل کریں۔

بن لادن نے ان کی تربیت میں خود حصہ لیا، انہیں لیکچرز، ویڈیوز اور دیگر ذرائع سے ذہنی طور پر تیار کیا گیا۔ امریکی مظالم کی ویڈیوز دکھا کر ان کے جذبات بھڑکائے گئے۔ قندھار کے تربیتی

کیمپ میں بن لادن نے اصرار کیا کہ تمام حملہ آور سعودی شہری ہوں تاکہ انہیں امریکہ کے ویزے حاصل کرنے میں آسانی ہو۔ انہیں فلوریڈا کے فلائنگ اسکول میں داخلہ لینے کی ہدایت دی گئی تاکہ وہ کمرشل پائلٹ کا لائسنس حاصل کر سکیں۔ رقوم دیئے اور بنگاک کے بینکوں کے ذریعے امریکہ منتقل کی گئیں۔

11 ستمبر 2001 کو، دنیا لرز کر رہ گئی، جب اسے اندازہ ہوا کہ افریقی ملک میں امریکی سفارت خانوں پر ہونے والے حملے صرف ایک پیش خیمہ تھے۔ اس دن، 19 سعودی القاعدہ کے حملہ آوروں نے امریکی ہوائی اڈوں کی سکیورٹی کی خامیوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے حبار طیارے ہائی جیک کیے۔ دو طیارے نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر سے ٹکر دیے گئے، ایک طیارہ پینٹاگون کے قریب ورجینیا میں گرا، جبکہ چوتھا طیارہ، جو کینیڈا کی طرف جا رہا تھا، پنسلوانیا میں مارگرایا گیا۔ اس واقعے میں 6000 افراد ہلاک اور 10000 سے زائد زخمی ہوئے۔ تاریخ میں پہلی بار، غیر ریاستی عناصر نے امریکی طاقت کی علامتوں پر ایسی کاری ضرب لگائی۔

نائن الیون کے بعد امریکہ کا رد عمل

20 ستمبر 2001 کو صدر جارج ڈبلیو بوش نے امریکی کانگریس کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کیا۔ یہ نائن الیون حملوں کے بعد پہلا خطاب تھا، جس نے اسلامی دہشت گردی کے خلاف امریکہ کا ایجنڈا متعین کیا۔ بد قسمتی سے یہ خطاب وہابی-سلفی عقیدے کی واضح شناخت کرنے میں ناکام رہا، جو 1979 سے سعودی عرب کی جانب سے کھلم کھلا پھیلا یا جا رہا تھا۔ یہی وہ سال بھی تھا جب مکہ مکرمہ کی عظیم مسجد پر وہابی-سلفی شدت پسندوں کے ایک گروہ نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس سے پہلے بھی کئی امریکی اسکالرز نے اس پر تشویش ظاہر کی تھی کہ سعودی عرب نے وہابی-سلفی اسلام کی شکل میں ایک ایسا خطرناک نظریہ آزاد کیا ہے جو مسلمانوں کو دیگر مذاہب سے نفرت سکھاتا ہے اور بے گناہ انسانوں کے قتل کو جائز قرار دیتا ہے۔

اپنے خطاب میں صدر بوش نے دنیا بھر کے مسلمانوں سے براہ راست مخاطب ہو کر کہا:

”ہم آپ کے دین کا احترام کرتے ہیں۔ لاکھوں امریکی اور امریکہ کے دوست

ممالک میں کروڑوں افراد آزادی سے اس مذہب پر عمل کرتے ہیں۔ اس کے اصول اچھے اور پُر امن ہیں، اور جو لوگ اللہ کے نام پر برائی کرتے ہیں وہ اللہ کے نام کی توہین کرتے ہیں۔ دہشت گرد اپنے ہی مذہب سے غداری کر رہے ہیں، اور حقیقت میں اسلام کو ہائی جیک کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ امریکہ کا دشمن ہمارے بے شمار مسلم دوست نہیں ہیں، نہ ہی ہمارے بے شمار عرب دوست۔ ہمارا دشمن دہشت گردوں کا ایک انتہا پسند نیٹ ورک ہے۔“

امریکی اسلامی اسکالرز اور سیکورٹی ماہرین نے پہلے ہی، صحرائی اسلام یا وہابی۔ سلفی عقیدے پر اپنی تشویش ظاہر کی تھی، جسے سعودی عرب نے نائن الیون سے کئی دہائیاں قبل سے دنیا بھر میں پھیلا نا شروع کر دیا تھا۔ یہ کوئی راکٹ سائنس نہیں کہ یہ انتہا پسند دہشت گرد نیٹ ورکس اسی سخت گیر وہابی۔ سلفی نظریے کے پیروکار ہیں، جو دیگر مذاہب کے خلاف نفرت اور شدت پسندی کو فروغ دیتا ہے۔ خود امریکہ کا قریبی اتحادی، سعودی عرب، مسجد الحرام کے واقعے کے بعد، اور سلفیوں اور سعودی شاہی خاندان کے درمیان معاہدے کے تحت، اسی انتہا پسند اسلام کو دنیا بھر میں پھیلانے میں ملوث رہا۔

وسیع تر اسلامی دنیا، جو صوفی سنی روایتوں پر یقین رکھتی ہے، یہ چاہتی تھی کہ صدر بش اپنے خطاب میں واضح طور پر کہتے کہ جو بھی ملک شدت پسند، جہادی وہابی۔ سلفی نظریے کو پھیلاتا ہے، وہ امریکہ کا دشمن ہے۔

ایک خود مختار ملک کی حیثیت سے امریکہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے ملک میں وہابی۔ سلفی نظریے پر مبنی اسلامی طرز عمل پر پابندی عائد کرے، جیسا کہ مراکش کی اسلامی حکومت نے کیا ہے۔

9/11 کمیشن رپورٹ کے صفحہ 373 پر درج ہے:

”بہت سے امریکی سعودی عرب کو ایک دشمن کے طور پر دیکھتے ہیں، نہ کہ ایک گھیرے ہوئے اتحادی کے طور پر۔ ان کی نظر میں یہ ایک آمرانہ حکومت ہے جو عورتوں

پر ظلم کرتی ہے، اور جس پر امیر اور سست اثر افیہ کا قبضہ ہے۔ سعودی حکام کے امریکی سیاستدانوں سے روابط اکثر سیاسی الزامات میں استعمال ہوتے ہیں۔ امریکی عوام اکثر ان کے تعلیمی اداروں اور مساجد میں پڑھائے اور سنائے جانے والے عدم برداشت، یہود دشمنی اور امریکہ مخالف خیالات سے شدید نالاں ہوتے ہیں۔“

7 اکتوبر 2001 کو، امریکہ نے جوابی کارروائی کرتے ہوئے آپریشن اینڈورنگ فریڈم (Operation Enduring Freedom) کا آغاز کیا، جو افغانستان میں طالبان حکومت کے خلاف امریکی قیادت میں ایک بین الاقوامی کارروائی تھی۔ القاعدہ کے تربیتی کیمپوں پر مسلسل فضائی بمباری کی گئی۔ شمالی اتحاد کی افواج، جو ملا عمر کی طالبان حکومت کے مخالف تھے، کو کامل پر قبضے کے لیے آگے بڑھنے کی ترغیب دی گئی۔

اس آپریشن میں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں طالبان جنگجو مارے گئے۔ ان میں سے کئی پاکستان کی طرف فرار ہو گئے۔ ایک بار پھر آئی ایس آئی نے مشکوک کردار ادا کیا، اور القاعدہ کے سینئر رہنماؤں، بشمول اسامہ بن لادن اور ایمن الظواہری، کو پاکستان میں محفوظ پناہ گاہیں فراہم کیں۔ آئی ایس آئی نے سی آئی اے کو گمراہ کرتے ہوئے کہا کہ القاعدہ کی قیادت تورابورا کے پہاڑوں میں منتقل ہو چکی ہے اور انہیں تلاش کرنا آسان نہیں ہوگا۔

حقیقت یہ تھی کہ انہیں پاکستان کے شہر ایبٹ آباد کے قریب وسیع و عریض جنگلوں میں رکھا گیا تھا، جہاں وہ اپنے بڑے خاندانوں کے ساتھ ہر طرح کی مادی آسائشوں میں رہ رہے تھے۔

نائن الیون کے بعد، بن لادن کی پشت پناہی یافتہ دہشت گردی نے دنیا بھر، خاص طور پر مغربی اور مسلم معاشروں میں، مختلف شکلوں میں جنم لیا۔ ان دہشت گردوں نے تمام بڑے مذاہب جیسے کہ عیسائیت، ہندومت اور یہودیت کے ساتھ براہ راست تصادم کیا۔ خود مسلم معاشرے کے اندر بھی ایک جنگ شروع ہو گئی، جس کا ہدف صوفی روایت اور اس کی علامتیں، جیسے بزرگانِ دین کے مزارات، بنے۔

سعودی عرب کے مذہبی اداروں نے، بھاری مالی وسائل کے ساتھ، دنیا بھر میں سینکڑوں نہیں

بلکہ ہزاروں مساجد تعمیر کیں، اور ان مساجد میں قرآنی آیات اور احادیث کی وہابی تشریحات کو فروغ دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں ایک سخت گیر اسلامی نظریے کا غیر معمولی پھیلاؤ دیکھنے کو ملا، جو مغربی، ایشیائی اور افریقی مسلم کمیونٹیز میں بھی سرایت کر گیا۔

یہاں تک کہ وہابی اسلام کی جانب سے مرد و خواتین کے لیے متعین کردہ لباس بھی دنیا کے بڑے شہروں میں نمایاں طور پر دکھائی دینے لگا۔

انٹرنیٹ یا ماحلوں کی مساجد کے ذریعے شدت پسندی کی طرف مائل ہونے والے نوجوانوں کے الگ تھلگ حملے، جنہیں 'لون و ولوز' (تنہا بیٹھے) کہا جاتا ہے، آج بھی عالمی برادری کے لیے تشویش کا باعث ہیں۔ ایسی وارداتیں امریکہ، فرانس، جرمنی، انگلینڈ، بھارت، مراکش، انڈونیشیا اور مصر سمیت دنیا کے کئی ممالک سے رپورٹ ہوتی رہی ہیں..... اور یہ فہرست بہت طویل ہے۔

دوسری خلیجی جنگ

سنہ 2003 میں، امریکہ نے عراق پر پوری فوجی طاقت کے ساتھ حملہ کیا۔ اس کارروائی کو دوسری خلیجی جنگ کہا جاتا ہے، جس کا جواز صدام حسین کی جانب سے تباہ کن ہتھیاروں کی تیاری کو بنایا گیا۔ اس جنگ کا اصل مقصد ایک سفاک حکمران کا تختہ الٹ کر نظام حکومت کی تبدیلی لانا تھا جو کہ امریکی سلامتی کے اداروں کا محبوب نعرہ بن چکا تھا۔

امریکہ اس مہم میں کامیاب رہا: صدام حسین کو اقتدار سے بے دخل کیا گیا اور شیعہ اکثریتی آبادی کو سیاسی طاقت دی گئی۔ تاہم، اس کے ساتھ ہی اسلامی تاریخ میں سب سے بدترین فرقہ وارانہ تقسیم کا آغاز بھی ہوا۔ تقریباً ایک دہائی تک، عراق ایک ایسی تجربہ گاہ بن گیا جہاں دہشت گرد اپنی جنگی تکنیکوں کو نکھار کر انہیں دنیا بھر میں پھیلانے لگے۔

عراق میں جن دہشت گردی کی تکنیکوں کو فروغ ملا، ان میں خودکش حملوں کی مہم، جہادی پراپیگنڈہ پر مبنی ویڈیوز، ویب سائٹس، اور بم سازی کے طریقے شامل تھے۔ 2003 سے

2005 کے درمیان، عراق میں خودکش حملوں کی شدت اور رفتار میں اضافہ ہوا، اور پھر سرائیو طریقوں کو افغانستان اور پاکستان میں بھی استعمال کیا گیا۔ عراق وہ مقام بن گیا جہاں کاربم دھماکے اور VBIEDs (گاڑیوں میں نصب دیسی ساختہ دھماکہ خیز آلات) کے استعمال کو مکمل پختگی حاصل ہوئی۔

جب داعش نے عراق اور اس سے ملحقہ شام میں دہشت گرد سرگرمیوں پر قبضہ حاصل کیا، تو گاڑیوں سے کیے جانے والے حملوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ 2004 میں القاعدہ عراق کا مقصد امریکی وغربی قبضے کو ہٹا کر وہابی سنی اسلامی حکومت قائم کرنا تھا۔ اس گروہ کا پہلا لیڈر ابو مصعب الزرقاوی تھا، جو اسامہ بن لادن کا قریبی پیروکار تھا۔ اس میں ظلم پسندی، شہرت کی ہوس اور ایک مبہم قیامت کی سوچ پائی جاتی تھی۔ 2006 میں وہ ایک فضائی حملے میں مارا گیا۔

اس کے بعد ابوالیوب المصری، جو کہ ایک مصری شہری تھا، نے قیادت سنبھالی لیکن وہ بھی ایک امریکی-عراقی کارروائی میں مارا گیا۔ کچھ وقت تک داعش بغیر کسی قائد کے رہی۔ پھر 2011 میں ابو بکر البغدادی منظر عام پر آیا اور اس نے تنظیم کی مکمل کمان سنبھال لی۔ اس نے عراقی شیعہ آبادی اور شام کے صدر بشار الاسد کی افواج کے خلاف فرقہ وارانہ جنگ کی قیادت کی۔

2013 میں داعش کے نام سے ایک نیا گروہ قائم کیا گیا، جو ایک وقت میں عراق اور شام کے بڑے حصے پر قابض ہو گیا۔ اس گروہ کا مقصد شریعت پر مبنی ایک اسلامی ریاست قائم کرنا تھا، جیسا کہ ابن تیمیہ نے تیرہویں صدی میں نظریاتی طور پر بیان کیا تھا اور محمد بن عبدالوہاب نے اٹھارہویں صدی میں ایک عوامی تحریک کے طور پر اسے پروان چڑھایا۔

2013 میں، داعش نے عراق کے فلوجہ، موصل اور تکریت جیسے سنی اکثریتی علاقوں پر قبضہ کر لیا، اور ساتھ ہی دریائے فرات کے کنارے شام کے کئی قصبے بھی اس کے قبضے میں آ گئے۔ ان علاقوں میں زیادہ تر وہ لوگ بستے تھے جو صدام حسین کے حامی تھے، اور امریکی افواج نے ان تمام افراد کو حکومت اور سکیورٹی اداروں سے نکال باہر کیا جو کہ ایک انتہائی غیر دانشمندانہ قدم تھا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ یہ افراد نئی شیعہ حکومت سے انتقام لینے پر آمادہ ہو گئے۔ جلد ہی عراق میں ایک

مکمل فرقہ وارانہ جنگ کا آغاز ہوا، جہاں خود کش بمبار بغداد اور دیگر شہروں میں چیک پوسٹوں کو نشانہ بنانے لگے۔ داعش نے اپنے زیر قبضہ علاقوں میں سخت شریعت قوانین نافذ کیے۔

امریکی انتظامیہ نے خطے میں نئی سیکورٹی فورسز تشکیل دیں۔ لیکن زیادہ تر افسران، جو پہلے عراقی فوج کا حصہ تھے، اب داعش میں شامل ہو گئے اور ابو بکر البغدادی کی قیادت میں ایک طاقتور جنگجو فورس کی تشکیل دی۔ یہ افراد تجربہ کار اور ذہین تھے۔ جلد ہی انہوں نے ہزاروں نئے عراقی فوجی بھرتی شدگان کو ہلاک کر دیا اور عراق کے وسیع علاقے پر قبضہ جمالیا۔

تاہم، کرفورسز بی جو کہ شمالی عراق میں خود مختار علاقے میں مقیم تھیں نے داعش کو سخت مزاحمت دی اور انہیں اپنے شہروں سے دور رکھا۔ یزیدی اقلیت، جو شمالی عراق کے کچھ علاقوں میں رہتی تھی، داعش کی درندگی کا بدترین نشانہ بنی۔ انہیں قتل کیا گیا، عورتوں کی آبروریزی کی گئی اور غلامی میں لے جایا گیا۔ داعش نے انہیں کسی عجیب قسم کے عیسائی فرقے سے تعلق رکھنے والے کا فر قرار دیا۔

داعش کی بربریت، جو عراق اور شام میں جاری تھی، 2016 کے آخر تک اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ عالمی میڈیا رپورٹس نے مہذب دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ داعش کے ٹیکنالوجی سے واقف اراکین نے سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کا استعمال اپنے جرائم کی تشہیر اور نوجوانوں کی بھرتی کے لیے کیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ القاعدہ نے باضابطہ طور پر داعش سے تعلق توڑ لیا، کیونکہ القاعدہ کے مطابق بے گناہ لوگوں کا پر تشدد قتل مسلم دنیا کو خود سے دور کر دے گا۔

داعش کے وحشیانہ جرائم کا سلسلہ 2017 تک جاری رہا۔ انہوں نے امریکی صحافیوں اور بین الاقوامی امدادی کارکنوں کو قتل کیا۔ انہوں نے عوامی مقامات پر دشمنوں کی گردنیں کاٹنے کی ویڈیوز بنا کر سوشل میڈیا پر نشر کیں۔

نومبر 2015 سے مئی 2017 کے درمیان، دنیا بھر میں جہادی دہشت گرد حملے دیکھنے کو ملے۔ یہ حملے فرانس (پیرس، تولوز، نیس)، بیلجیم (برسلز)، سپین (میڈرڈ، بارسلونا)، امریکہ (کسیلی فورنیا، نیویارک، بوٹن، فلوریڈا)، برطانیہ (مانچسٹر، لندن) اور جرمنی (برلن) میں ہوئے۔

ان حملوں میں اکثر نوجوان، تعلیم یافتہ مسلمان ملوث تھے، جو یا تو سوشل میڈیا اور وہابی-سلفی نظریات پر مبنی ویب سائٹس سے شدت پسند بنے یا داعش سے متاثر ہوئے۔

نسل پرستی بمقابلہ اسلام پسندی

سال 2018 میں مغربی دنیا میں سفید فام بالادستی کے حملوں میں اضافہ دیکھا گیا۔ امریکہ کے شہر پٹسبرگ میں ایک یہودی عبادت گاہ، نیوزی لینڈ کے کرائسٹ چرچ کی ایک جمعے کی نماز کی جماعت، اور ناروے کے شہر اوسلو کی ایک مسجد پر حملہ کیا گیا۔

جب ڈونلڈ ٹرمپ نے 2016 کے متنازع صدارتی انتخابات جیتے، باوجود اس کے کہ ان کے تقریریں اور ٹویٹس شدید تنقید کا نشانہ بنتے رہے، تو ان کے اقدامات نے نسلی تعصب رکھنے والوں کو مزید حوصلہ اور تحریک دی۔ امریکی قدامت پسند میڈیا نے صدر ٹرمپ کی نسل پرستانہ بیانیہ کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا، خاص طور پر ڈیموکریٹس، لبرلز اور لاطینی تارکین وطن کے خلاف، جنہیں وہ امریکہ کی جنوبی سرحد سے آنے والا منشیات فروشوں اور مجرموں کا قافلہ قرار دیتے رہے۔

2019 تک سفید فام قوم پرست نہ صرف مزید متحرک ہو چکے تھے بلکہ کھلم کھلا ہونے لگے تھے۔ ماضی میں تشدد سے بڑی یہ تنظیمیں اب خود کو ریاستی پشت پناہی یافتہ محسوس کرنے لگیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ سفید فام بالادستی کے انتہا پسندوں کی انتہا پسندانہ سوچ، طریقے اور بیانیہ درحقیقت داعش کی حکمت عملی سے ملتے جلتے تھے۔

درحقیقت، انتہا پسندی ایک نظریاتی ڈھانچہ ہے، چاہے وہ مغرب میں ہو یا مشرق میں۔ بظاہر، سفید فام قوم پرست اور داعش کے بھرتی شدہ افراد میں کوئی مماثلت نظر نہیں آتی۔ ایک طرف وہ گروہ ہے جو نسل پرستی اور تارکین وطن دشمنی پر یقین رکھتا ہے اور اس خوف میں مبتلا ہے کہ جلد ہی رنگ دار لوگ اکثریت میں آجائیں گے؛ دوسری طرف وہ گروہ ہے جو غیر اسلامی ممالک میں مسیحا ہجرت کو ایک مقصد سمجھتا ہے تاکہ وہاں اپنی تعداد بڑھا کر کفار کو قتل کرے اور شریعت پر مبنی خلافت قائم کی جاسکے۔

دونوں گروہوں نے سوشل میڈیا اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کا بھرپور استعمال کیا اور اپنی تقسیم پیدا کرنے والی نظریات کو پھیلایا۔ دونوں کو یقین تھا کہ وہ وجودی بحران سے گزر رہے ہیں جو ان کے طرز زندگی کو خطرے میں ڈال رہا ہے اور بقا کا واحد راستہ تشدد ہے۔

اپنی طاقت کے عروج پر، داعش نے 60 سے 80 لاکھ افراد کی قابل ٹیکس آبادی، تیل کے کنویں اور ریفائنریاں، اناج کے گودام، اسمگلنگ کے منافع بخش راستے اور اسلحے کے بڑے ذخیرے پر قبضہ حاصل کر لیا تھا۔ ان کا معاشی دار الحکومت موصل تھا، جو عراق کا دوسرا سب سے بڑا شہر ہے۔

داعش سب سے طاقتور، دولت مند اور جدید اسلحے سے لیس جہادی تنظیم بن چکی تھی، جس میں تعلیم یافتہ اور ٹیکنالوجی کے ماہر جنگجو شامل تھے۔ اس کی فوجی مہم اور خلافت کے قیام نے پوری اسلامی دنیا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ابوبکر البغدادی نے موصل کی 950 سال پرانی النوری مسجد کے منبر سے اسلامی خلافت کا اعلان کیا، جس نے دنیا بھر کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔

داعش کا زوال

جلد ہی عراق اور شام میں داعش کی خلافت کو ختم کر دیا گیا، مگر اس تنظیم کی نظریاتی بنیاد اب بھی باقی ہے۔ 2018 کے آغاز تک داعش صرف عراق کے انبار صوبے کے ریگستانی علاقے اور شام میں دریائے فرات کے کنارے کے کچھ چھوٹے دیہات تک محدود ہو چکی تھی۔ تاہم، ان چھوٹے ٹھکانوں کو صاف کر دیا گیا اور ان کیمپوں میں قید خواتین اور بچوں کو امریکی اور کرد فورسز نے رہائی دلائی۔

اسی وقت عراقی حکومت کو غربت اور فرقہ واریت کے شدید مسائل کا سامنا تھا جو آج بھی برقرار ہیں۔ 2003 سے اب تک، پہلے امریکی حملے اور پھر فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے تباہ ہونے والے شہروں اور بنیادی ڈھانچے کی تعمیر نو کے لیے اربوں ڈالر درکار ہیں۔

داعش کے جنگجو اب بھی مصر، افغانستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور فلپائن میں نمودار ہوتے رہتے

ہیں۔ یمن میں بھی یہ عناصر دیکھے گئے ہیں، جہاں وہ انتشار، خانہ جنگی اور کمزور یا ناپید حکومت کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

یہ شدت پسند گروہ افغانستان میں دوبارہ ابھر رہا ہے، جہاں اسے اسلامک اسٹیٹ خراسان (IS-K) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ 17 اگست 2019 کو کابل میں ایک شیعہ شادی کی تقریب پر ہونے والا حملہ اس بات کا ثبوت ہے کہ داعش افغانستان میں اپنے قدم جما رہی ہے۔

داعش کی خراسان شاخ نے باقاعدہ طور پر 2015 میں اپنے عملیات کا آغاز کیا۔ ”خراسان“ کا حوالہ قرون وسطیٰ کے علاقے کی طرف ہے جو آج کے افغانستان، ایران اور وسطی ایشیا کے کچھ حصوں پر مشتمل تھا۔ داعش نے اس خطے میں اپنی بنیاد انسابق پاکستانی اور افغان طالبان کی مدد سے رکھی، جنہوں نے 2014 میں ابوبکر البغدادی سے وفاداری کا حلف لیا تھا۔

یہ گروہ مقامی طالبان ہمدردوں اور پاکستانی طالبان کے آوارہ گروہوں پر مشتمل تھا، جو مشرقی افغانستان میں اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ اپنے نظریاتی عقائد کے مطابق، یہ گروہ خواتین اور شیعہ برادری پر سفاک حملے کرتے رہتے ہیں۔

افغانستان میں داعش کے جنگجوؤں کی تعداد مقامی طور پر بھی بڑھی ہے اور ان میں وہ جنگجو بھی شامل ہیں جو شام سے خلافت کے خاتمے کے بعد یہاں منتقل ہوئے۔ ان کی اکثریت سنسگر ہار صوبے میں موجود ہے۔

اقوام متحدہ کے مطابق، کابل کی شادی کی تقریب پر حملے کے بعد ان کی رسائی مزید علاقوں تک پھیل چکی ہے۔ بارہا، داعش نے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ وہابی سلفی نظریے کے سب سے سخت گیر پیروکار ہیں، جو طالبان یا القاعدہ سے بھی زیادہ شدت سے اس نظریے پر عمل پیرا ہیں۔

فروری 2020 میں صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے خصوصی سفیر، زلمے خلیل زاد نے طالبان کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کیے، جس کے تحت امریکی افواج کو مرحلوں میں افغانستان سے مکمل طور پر نکلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ طالبان قیادت نے طویل عرصے سے امریکی زیر قیادت فوجوں کے تدریجی انخلا کا مطالبہ کیا تھا۔

یہی طالبان رہنما، جواب امریکہ کے ساتھ مذاکرات میں شامل ہیں، وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے دور حکومت میں سخت شرعی قوانین نافذ کیے تھے جن میں ٹی وی پر موسیقی اور فلموں پر پابندی، زانیوں کی سرعام سزائیں اور آثاری مقامات کی دانستہ تباہی شامل تھی۔ آج وہ اپنے آپ کو بدلا ہوا اور معتدل ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر ان کی مذاکراتی ٹیم میں صرف ایک خاتون کی موجودگی رواداری کا جھوٹا تاثر پیش کرنے کی کوشش ہے۔

طالبان چالاکی سے امریکی مذاکراتی ٹیم کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہا ہے، اور یہ ظاہر کر رہا ہے کہ وہ اب صوفی اسلام کے روایتی اور بردبار نظریے کو اپنائے ہوئے ہے اور اب وہابی۔ سلفی فکر سے جڑا ہوا نہیں ہے۔ یہ کوششیں خاص طور پر سوشل میڈیا کے ذریعے کی جا رہی ہیں۔

طالبان کا ثقافتی کمیشن فیس بک اوٹوٹر (جواب X ہے) پر مختلف زبانوں میں پروپیگنڈہ پھیلا رہا ہے۔ وہ واٹس ایپ، واٹس ایپ اور ٹیلی گرام پر جھوٹی خبریں پھیلانے میں بھی ملوث ہے۔ ان کا بنیادی مقصد دنیا کی رائے عامہ کو متاثر کرنا اور افغان مڈل کلاس کو اپنی استحکام پسندی کا یقین دلانا ہے۔

وہ اپنے آپ کو محب وطن کہہ کر بیانیہ کارخ موڑنے میں ماہر ہو چکے ہیں۔ چودھویں صدی کی قدامت پسند وہابی۔ سلفی تحریک کا اکیسویں صدی کی ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھانا واقعی ایک چالاک حکمت عملی ہے۔

امریکی افواج کے باعزت انخلا کے بدلے، طالبان نے کچھ اہم رعایتیں دی ہیں، مگر حقیقت میں وہ اب بھی انتہائی قدامت پسند وہابی۔ سلفی نظریے کے پیروکار ہیں۔ اب البتہ وہ اسے دنیا کے سامنے معتدل بنا کر پیش کرنے میں زیادہ مہارت رکھتے ہیں۔

طالبان اور القاعدہ کے نچلے درجے کے کارکنان اسی وہابی۔ سلفی سوچ میں پرورش پاتے ہیں، اور ان کی شیعہ اولیاء کے مزاروں اور صوفی ازم سے شدید نفرت بالکل عیاں ہے۔

تاہم، یہ تازہ ترین امن معاہدہ امریکہ کے لیے تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے، کیونکہ طالبان کی قیادت کو اپنے شدت پسند کارکنوں پر مکمل کنٹرول حاصل نہیں ہے۔ چاہے وہ طالبان، القاعدہ یا داعش سے تعلق رکھتے ہوں، سب کا ماننا ہے کہ وہ ایک دن متحد ہو کر خراسان میں ایک مضبوط

اسلامی ریاست قائم کریں گے۔

ادھر، صدر ٹرمپ نے شمالی شام سے امریکی افواج کے انخلا کی منظوری دی، جس کے بعد ترکی کو وہاں داخلے کی اجازت مل گئی۔ اس اقدام سے شام میں تاریخ دہرانے کا خطرہ بڑھ گیا ہے یعنی افراتفری اور غیر یقینی مستقبل۔

کردوں کی قیادت میں قائم شام کی ملیشیا (SDF) وہ اہم زمینی قوت تھی جس نے شام میں داعش کو شکست دی۔ مگر اب امریکی حمایت کے بغیر، کردوں کو ترکی یا شامی حکومت سے کسی بہتر معاہدے کی امید نہیں رہی۔

نتیجتاً، داعش کے خفیہ سیل اس صورت حال کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ترکی کے شمالی شام پر حملے نے نئی شورش کو جنم دیا ہے۔ اب جب کہ داعش واپسی کی تیاری میں ہے، تو مشرق وسطیٰ اور افغانستان ایک بار پھر امریکی پالیسیوں کی ناکامی کی بھاری قیمت چکانے کے دہانے پر ہیں۔

ان تمام حالات کے بیچ، اسرائیل نے مسلسل ایران کے ایٹمی طاقت بننے کے خلاف آواز بلند کی ہے، گویا مشرق وسطیٰ میں سنی اور شیعہ فرقوں کے درمیان دراڑ کو مزید گہرا کرنا اس کا مقصد ہو۔ اسرائیلی قیادت بخوبی سمجھتی ہے کہ اگر وہ پرامن طریقے سے رہنا چاہتے ہیں تو سعودی عرب اور مصر کو اپنے ساتھ رکھنا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسرائیل کا ایران سے براہ راست کوئی تنازعہ نہیں ہے، مگر تہران دیگر دنیا کی طرح فلسطینی عوام کی اسرائیلی قبضے کے تحت ناقابلِ بیان اذیتوں کی ترجمانی کرتا ہے۔

اسرائیل کی جانب سے اسکولوں اور اپارٹمنٹ بلاکس پر بمباری، جس میں ہزاروں بے گناہ فلسطینی جاں بحق ہوئے، کون بھلا سکتا ہے؟ اسرائیلی رہنما بنیامین نیتن یاہو، جو عربوں کے دوست ہونے کا ڈھونگ رچاتے ہیں، نے ایران کے نیوکلیر معاہدے کو ایک چونکا دینے والی تاریخی غلطی قرار دیا، اور اس طرح چالاکی سے علاقائی فرقہ واریت کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کیا۔

نوجوان سعودی قیادت کو سمجھنا چاہیے کہ ہمارے ذہن میں ایک قسم کی حفاظتی دیوار ہوتی ہے جو ہمیں غلط خیالات سے بچاتی ہے۔ اسرائیل سعودی عرب اور ایران کے درمیان فرقہ وارانہ تقسیم کو

اسی دیوار میں ایک بڑی دراڑ سمجھتا ہے۔ وہ ایران کے نیوکلیر معاہدے پر حملہ جاری رکھے ہوئے ہے اور اسرائیل۔ فلسطین دوریاستی حل کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔

یہ وقت ہے کہ مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک اس حقیقت کو تسلیم کریں کہ بڑھتی ہوئی داعش کی آئیڈیالوجی پورے عالم اسلام کے لیے ایک حقیقی وجودی خطرہ بن چکی ہے۔ اگر یمن، شام، عراق، لبنان اور لیبیا جیسے ممالک فرقہ وارانہ تنازعات میں الجھے رہے تو داعش جیسے گروہ جلد ہی ایک اتھارٹی بن کر ابھریں گے اور جہاں کہیں بھی موقع ملے، سخت ترین شریعت نافذ کر کے ایک سلفی اسلامی ریاست قائم کرنے کی کوشش کریں گے۔

داعش دراصل القاعدہ اور سلفی آئیڈیالوجی سے ہی نکلی ہے۔ یہ قومیت اور سیکولرزم کو رد کرتی ہے اور بادشاہتوں کو ہٹا کر ایک عالمی اسلامی خلافت قائم کرنے کا خواب دیکھتی ہے۔ اپنے عروج کے دور میں ہزاروں غیر ملکی مسلمان داعش میں شامل ہوئے۔ ان میں فرانس، برطانیہ، بیلجیم، جرمنی، ہالینڈ، آسٹریلیا، بھارت، پاکستان، انڈونیشیا اور امریکہ سے تعلق رکھنے والے افراد شامل تھے۔

تجزیہ نگار اب بھی اس بات پر حیران ہیں کہ یورپ اور امریکہ کی تیسری اور چوتھی نسل کے مسلمان اور نو مسلم کیسے اس تنظیم کی طرف راغب ہوئے۔ مغربی ممالک میں رہنے والی مسلم برادریاں ساتھ ساتھ مگر الگ الگ رہتی ہیں۔ تیسری اور چوتھی نسل کے مسلمان دو انتہاؤں کے درمیان بٹے ہوتے ہیں: اسکول اور دوستوں سے وہ آزاد خیالات اور سماجی اقدار سیکھتے ہیں، جب کہ گھر میں انہیں سخت سلفی اسلامی اصولوں پر عمل کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

انہیں اپنے مغربی دوستوں سے ملنے اور مخلوط تقریبات میں شرکت کرنے سے روکا جاتا ہے۔ اکثر ہفتہ وار تعطیلات اور چھٹیاں وہ گھر میں ہی گزارتے ہیں، جہاں ماحول خشک اور محدود ہوتا ہے۔ اسی بے رنگ گھریلو ماحول کے باعث وہ انٹرنیٹ پر بہت زیادہ وقت گزارتے ہیں۔ نوجوان ذہن اس پر شدت سے رد عمل دیتے ہیں؛ وہ جہادی ویب سائٹس اور دیگر سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کے عادی ہو جاتے ہیں۔

دھیرے دھیرے وہ خفیہ ایپس کے ذریعے ایک دوسرے سے جڑ جاتے ہیں، جہاں گروپ کی

شناخت چھپائی جاتی ہے۔ کچھ نوجوان اپنے والدین کے فیصلوں کو مسترد کر کے مغربی اقدار اختیار کر لیتے ہیں اور مرکزی دھارے میں شامل ہو جاتے ہیں۔

داعش کی سوشل میڈیا ٹیموں نے امریکہ اور یورپی ممالک سے ہزاروں ذہین، تعلیم یافتہ اور ٹیکنالوجی سے واقف نوجوانوں کو چومیس گھنٹے پروپیگنڈا پھیلانے کے لیے بھرتی کیا ہے۔ 'لون ولف' قسم کے حملہ آور، جیسا کہ ڈلاس، ٹیکساس اور چائٹو گا میں ہوئے، کسی بڑی سازش کا حصہ نہیں تھے۔ بلکہ یہ بورا اور الجھن کا شکار نوجوان تھے جو انتہا پسند نظریات سے متاثر ہو کر جنت کے وعدے کے ساتھ جہاد کے رومانوی تصور سے بہک گئے۔

عرب نژاد امریکی نوجوان محمد عبدالعزیز، جس نے چائٹو گا حملہ کیا، نے اپنی آخری بلاگ پوسٹ میں لکھا کہ اس کے لیے دنیا ایک 'یکسانیت اور معمول کی جیل' تھی۔

مختصراً، جو کچھ ہوا وہ یہ کہ 1979 کے بعد سعودی عرب سے شکنے والا عدم برداشت اور عورت دشمن اسلام کا وائرس دنیا بھر میں پھیلتا گیا، اور ہر جگہ اپنے میزبان ماحول سے کچھ نہ کچھ نیا سیکھ کر ایک زیادہ مہلک شکل اختیار کر گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک زہریلا جہاد ازم ارتقا پذیر ہوا، جو القاعدہ اور داعش کی شکل میں سامنے آیا۔

سعودی عرب میں معتدل اسلام کا ظہور

خوش آئند بات یہ ہے کہ سعودی عرب کے بااثر ولی عہد شہزادہ محمد بن سلمان (MBS) 2017 سے وہابی اسلام میں نرمی اور اصلاحات لانے کے مشن پر گامزن ہیں۔ انہوں نے سعودی عرب کی خوفناک مذہبی پولیس کے اختیارات محدود کر دیے ہیں، جو پہلے کسی خاتون کو صرف اس وجہ سے گرفتار کر سکتی تھی کہ اس نے اپنے جسم کا کوئی انچ نیگا چھوڑ دیا ہو۔ انہوں نے خواتین کو گاڑی چلانے اور بغیر کسی مرد سرپرست کے سفر کرنے کی اجازت بھی دی ہے۔

انہوں نے نیویارک ٹائمز کے معروف کالم نگار تھامس فریڈمین کو ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ وہ اسلام کی نئی تعبیر نہیں کر رہے بلکہ اسلام کو اس کی اصل حالت کی طرف لوٹا رہے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ سعودی

عرب میں بگاڑ 1979 سے شروع ہوا، جب اسلام کو سیاست سے جوڑ دیا گیا۔ ایران میں آیت اللہ خمینی کے عروج اور مکہ مکرمہ میں مسجد الحرام پر انتہا پسندوں کے قبضے جیسے واقعات کے ذریعے۔

مارچ 2018 میں ایک '60 منٹ' کے انٹرویو کے دوران، شہزادہ محمد بن سلمان نے کہا کہ 1979 سے پہلے سعودی عرب دیگر خلیجی ممالک کی طرح تھا۔ خواتین گاڑیاں چلاتی تھیں، میوزیکل تھیٹرز ہوتے تھے، مردوں اور عورتوں کے درمیان میل جول عام بات تھی، اور عیسائیوں اور یہودیوں کے لیے عزت و احترام موجود تھا۔ درحقیقت، 1950 کی دہائی میں سعودی خواتین بغیر حجاب کے آزادانہ گھومتی تھیں۔ وہ اسکرٹس پہنتی تھیں، مردوں کے ساتھ عوامی مقامات پر چلتی تھیں اور موسیقی کی محفلوں میں شریک ہوتی تھیں۔

مختصراً، 1979 کے ان واقعات سے پہلے سعودی عرب دنیا کے دیگر ممالک کی طرح ایک نارمل ریاست کے طور پر کام کر رہا تھا۔ گواماضی کی دھند ابھی مکمل طور پر چھٹی نہیں، لیکن کچھ امید کی کرنیں ضرور نظر آرہی ہیں، کم از کم دور افق پر۔ طالبان اب امریکہ سے مذاکرات میں مصروف ہیں، داعش سوشل میڈیا پر اپنی نئی تصویر بنانے کی کوشش کر رہی ہے، اور سعودی شاہی خاندان اصلاحات کے ذریعے اپنے شہریوں کو زیادہ آزادی دینے کے لیے مصروف عمل ہے۔

امریکہ کی مشرق وسطیٰ پالیسی میں بنیادی تبدیلی

کئی دہائیوں تک امریکی خارجہ پالیسی کا مرکز مشرق وسطیٰ میں اسرائیل۔ فلسطین تنازع رہا۔ تمام امریکی صدور نے ہمیشہ اسرائیل کے ساتھ ایک دو طرفہ تعلق اور خصوصی رشتہ برقرار رکھا۔ گزشتہ چار امریکی صدور 'دور دویر پبلکن اور دوڈیمو کریٹ' نے خود کو اسرائیل۔ فلسطین تنازع میں ایک منصفانہ ثالث کے طور پر پیش کیا اور ہمیشہ دور یاستی حل کی حمایت کی۔

رچرڈ ہاس نے 2020 میں فارن افیئرز میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں لکھا کہ:

”صدر ٹرمپ نے مشرق وسطیٰ میں امریکی خارجہ پالیسی کو درہم برہم کر دیا ہے، اور

اسرائیل اور عرب بادشاہوں کو ایران کے خلاف ایک صفحے پر لا کھڑا کیا ہے۔“

صدر ٹرمپ نے افسوسناک طور پر غریب اور کمزور فلسطینیوں کو یکسر تنہا کر دیا، دوریاستی حل کو
مسترد کیا، گولان کی پہاڑیوں کے اسرائیلی انضمام کو تسلیم کیا، یروشلم کو اسرائیل کا دارالحکومت تسلیم
کیا، اور مقبوضہ مغربی کنارے کے اسرائیلی انضمام کی بنیاد بھی رکھ دی۔



خسر و فاؤنڈیشن۔ ایک نئی پہل

ہندوستان، جنت نشان جو مذہبی، لسانی اور تہذیبی تکثیریت کا ملک ہے، کثرت میں وحدت سے جس کی پہچان ہوتی ہے، اس عظیم ملک کی تاریخ کا ہر دور انسان دوستی کی مثالوں سے بھرا ہوا ہے، جس میں شکتی اور شانتی بھکتوں کے گیتوں کا نتیجہ ہے، ہندوستان ہمیشہ اس بات کا گواہ رہا ہے کہ دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے۔

پتہ نہیں کہ دنیا کو کس کی نظر لگ گئی کہ سماجی قربتیں فاصلوں میں بدلنے لگیں ہیں۔ اس دیس کے باسیوں کی بڑی تعداد اگرچہ آج بھی اس عدم اتفاق اور تفریق کا حصہ بننے کو تیار نہیں لیکن غالب ترین اکثریت بھی اگر خاموش رہے تو وہ اس کے وجود کو عدم میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اب زیادہ تر لوگ اپنی ذات کے گرد طواف کر رہے ہیں۔ غم زمانہ کی جگہ دروتنہا سے دو چار ہیں اور وہ انسان جو کبھی ضمیر دشت و دریا تھا آج اسیر آشیانہ بنا ہوا ہے۔ ان حالات میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہیں رہا جاسکتا، اس لئے ضروری ہے کہ ایک بار پھر ان تمام علامتوں کو زندہ کیا جائے جو ”محبوتوں کی گاتھا“ اور ”پریم کے ڈھائی اکچھر“ سے لوگوں کو ایک دوسرے سے جوڑے رہیں جن کے نزدیک مادرِ وطن، وہاں پیدا ہونے اور بسنے والے، اس کے دریاؤں کا پانی پینے والے، اس کے کھیتوں میں پیدا ہونے والے رزق سے اپنی بھوک مٹانے والوں کو پھر اس بات کا احساس دلایا

جائے کہ ان کا مذہب، زبان اور علاقہ کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن ماں اور مائی سے ان کا رشتہ اس دنیا کے پیدا کرنے والے اور چلانے والے رب کی مرضی کا نتیجہ ہے اور جس میں رب راضی اس میں سب راضی رہیں، تو یہی بہتری اور بھلائی ہے۔

ہندوستان میں ایک دوسرے کو جوڑنے والوں کا اگر ذکر کیا جائے تو ان کے نام اور کام گننا میں کوئی دیر نہ لگے گی لیکن اگر ایک دوسرے کو ایک دوسرے سے الگ کرنے والوں اور بانٹنے والوں کے نام کسی سے پوچھے جائیں تو اسے ان کے نام یاد کرنے اور بتانے میں بڑی مشکل آئے گی۔ اس سب کے باوجود آج پھر یہ دوریاں اور یہ ٹکراؤ جو گاہے بگاہے دیکھنے کو ملتا ہے اس کا سیدھا سادھا جواب یہی ہے کہ ہم نے انہیں بھلا دیا ہے جنہیں ہمیں یاد رکھنا چاہیے۔ دیوی دیوتاؤں، پیغمبروں، پیروں اور رشیوں مٹیوں کے تیاگ، تپتیا، سمرپن اور سیوا بھاء کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کے سندیش اور اپدیش ایک دفعہ پھر لوگوں تک پہنچائے جائیں۔

یہی وہ سوچ اور فکر مندی ہے جس کے تحت ”خسرو فاؤنڈیشن“ کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ حضرت امیر خسرو ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی وہ محبوب، دلنواز اور ہمہ گیر شخصیت ہیں جنہیں صدیاں گزر جانے کے باوجود یاد رکھا گیا اور ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ وہ بیک وقت صوفی بھی تھے اور سپاہی بھی، وہ شاعر بھی تھے اور ماہرِ موسیقی بھی، وہ مومنانہ رخ بھی تھے اور تاریخ ساز بھی۔ غرض ان کی شخصیت کی عبقریت نے ان کو گوں ناگوں صفات کا حامل اور ہمہ جہت پہلوؤں سے اس طرح متصف کیا کہ عہدِ وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ میں بڑے بڑے نامیوں کے نشان مٹ گئے لیکن جب سے آج تک نہ صرف خسرو بلکہ ہماری تاریخ کا ہر جز انسانی ذہنوں میں زندہ و تابندہ ہے۔ مسرت کے لمحے ہوں یا یاس و غم کی گھڑیاں، خسرو کا نام اور کلام ہمہ وقت اپنی جاذبیت اور آفاقیت کے اعتبار سے ہمارے ساتھ ہے۔

اس گتھی کو تو ماہرینِ نفسیات ہی سلجھا سکتے ہیں کہ خسرو نے کس طرح حال و قال، جنگ و جدل، سوز و ساز، خانقاہ اور دربار کے درمیان توازن برقرار رکھا۔ یہ اس لیے بھی اہم ہیں کہ تاریخ شہادت دیتی ہے کہ انہوں نے یہ توازن اپنی شخصیت کے کھرے پن کے ساتھ قائم کیا تھا۔ ان کی

ہر وابستگی اور ہر رول کھلی کتاب کی طرح سب پر عیاں تھا اور اس کھلے پن کے تعلقات کے باوجود زندگی بھر کامیاب رہے۔ صدق بہ تدبیر کی مثالیں امیر خسرو کی شخصیت کو ہمارے لئے اور بھی آئیڈیل بناتی ہیں۔

اس ”ترک نژاد“ کی وطن دوستی نہ صرف مثالی، بلکہ قابلِ رشک بھی ہے۔ خسرو کے نزدیک یہ سرزمینِ ہند، عدن کی جنت، یہاں کے لوگ ہر رنگ میں انہیں عزیز، یہاں کے درباروں کے آگے ایران، توران، خراسان کے دربار ہیچ۔ یہاں کے لوگ ہر صنعت، علم و ادب کی ہر شاخ، فنونِ لطیفہ کے ہر میدان اور عسکری تربیت کے ہر انداز میں ”بے نظیر“ اہل ہند کا توحیدی مسلک انہیں باوجود ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے عزیز ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ وہ (یعنی اہل ہند) ہمارے حبیبِ دین نہیں رکھتے، مگر ان کے اکثر عقیدے ہمارے جیسے ہیں۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ہندوستان، ہندوستان کی ہر روایت چاہے وہ مذہبی ہو یا تہذیبی، ثقافتی ہو یا سانی، علمی ہو یا ادبی، اس کو خسرو کی طرح دیکھیں، اپنائیں، اس پر صدقے اور واری جائیں۔ خسرو جن کی ماں ہندی اور باپ ترک تھے، ایسے ہندوستانی ہیں جو ہندوستان کی عظمت کے ترانے ہی نہیں گاتے بلکہ وہ اپنے آپ کو اس مٹی کا اس طرح حصہ بنانا چاہتے ہیں جیسے یہ مٹی ہی سب کچھ ہو اور جس سے تعلق اور محبت کو الطاف حسین حالی نے یوں بیان کیا ہے:

تیری اک مشرتِ حناک کے بدلے

لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

خسرو فاؤنڈیشن وطن دوستی، انسان دوستی، فطرت سے ہم آہنگی، ہر طرح کی تفریق چاہے وہ فرقہ وارانہ ہو یا جنسی سب سے اوپر اٹھ کر محبت کو عام کرنا چاہتی ہے۔ اس لئے کہ بقول شیخ ابراہیم ذوق:

گلہائے رنگارنگ سے ہے زینتِ چمن

اے ذوق اس جہاں کو ہے زیبِ اختلاف سے





پروفیسر اقبال ایس حسین حکومتِ ہند کے اعلیٰ اعزاز پدم شری سے سرفراز
ماہر ماحولیات ہیں جو ملک کی معروف دانشگاه جواہر لال نہرو یونیورسٹی
میں انوائٹمنٹل سائنسز کے پروفیسر رہ چکے ہیں۔ فاضل مصنف جامعہ
ہمدرد دہلی کے پروفیسر اور کالی کٹ یونیورسٹی کیرالہ کے وائس چانسلر کے
اہم عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں۔

پروفیسر حسین نیشنل یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، عمان کے بورڈ
آف ٹرسٹیز کے اہم رکن ہیں تو وہیں جامعہ ہمدرد دہلی کی ایگزیکٹو کمیٹی کے
بھی معزز رکن ہیں۔ موصوف نے بیشتر تحقیقی مقالات اور کتب تحریر کی
ہیں جن میں Fault Lines in the Faith (عقیدے کی
دواریں) خاص طور پر اہمیت کی حامل ہے۔



خسرو فاؤنڈیشن
KHUSRO FOUNDATION

D-319, Defence Colony, New Delhi 110024 ☎ +91 9318431341

ISBN: 978-81-989382-1-3



@Khusrofounda



@khusrofoundation



@foundationkhusro



@khusro_foundation

Rs. 550/-